آزادی کا سفر

قمر رحیم خان

بسم الله الرحمن الرحيم

آزادی کا سفر

ناولٹ

(ایک کشمیری طلبہ تنظیم کی جدو جہد آزادی سے ماخوذ)

نام کتاب	:	آزادی کا سفر
مصنف	:	قمر رحیم خان
صفحات	:	۲۸۸
ٹائٹل	:	رانا مبارک
اشاعت	:	اوّل
سال اشاعت	:	۲۰۱۴ء
تعداد اشاعت	:	۱۰۰۰
قیمت	:	۲۷۰ روپے
تعاون	:	جموں کشمیر نیشنل ایسوسی ایشن (متحد عرب امارات)

ناشر کشمیر ریسورس سنٹر KRC
چاندنی چوک راولاکوٹ آزاد کشمیر، ۸۵۲۔بی، فیصل ٹاؤن لاہور پاکستان
0310-4387550
krc_center@gmail.com

(انتساب)

شمس خان

ملّی خان، سبز علی خان

مقبول بٹ

اور

ان کے پیروکاروں کے نام جو راہِ حق میں قربان ہو گئے۔

جب بھی کوئی دیش مناتا ہے دن اپنی آزادی کا
دِل کا درد سُلگ اٹھتا ہے یاد آئے کشمیر بہت

سُننے کی بات

دیکھ قمر میں کے اپناتے میں توہاڑیا کتابا کیا کی لخاں۔ تے لخے تے بائے جو غاتھیاوی کے۔ جتیں موریں نے بچے مارن گے اُنیں کولا پوچھا...... کوئی نئیں لخی سکنا جہیڑا کی اُنیں نے دِلے اُپر گزرنی، تے ناں کوئی بجھی سکنا۔ امجد مہاڑا ماسیر تُسیں پٹھانیں (افغانی پٹھان) کھڈنیاں مارائی شوڑیا ساتے اُس کہلّے نا دکھ اسیں نئیں مِٹیا تے نئیں مِٹیا۔ صابر جان (کمانڈر سجاد شہید کی بہن) دیکھ کتنے سال ہوئی گے اُس رُونیاں۔ ہوروی پرہا تھے اُس فیر سجادے نئیں پُہلّی۔ پُہلنے اے نئیں دینی اُس تے پُہلنے کُوئیاں۔ جس ویلے مِلاس تے اے لغنا کہ اِسّے ٹیم سجاد شہید وہا۔ تے مہاڑ یا پُترا ......! جتیں لوکیں نیں ہر ہر کھرے وِچّا لاشاں اُٹھیاں تے عورتیں نیاں عزّتاں لُٹیاں، اُنیں لوکیں نیاں کوئی لخے تے کوئی بجھے۔ تے لخی وی تے ہُن کے ہوئی سکنا۔ پہاپا ہور (بھائی، خان اشرف صاحب) آخنے ہونے سے کہ اِنیں پارے نیں لوک ٹیکا لائی شوڑے۔ تے کے ہتھ آیا فیر!! بُہوں چنگے لوک دے اُدھرے نیں۔ خورشیدہ اُستانی ہور آسیں پڑھانے سے تے سارے راولاکوٹے کولا اُنیں عزّت کرائی۔ کی عرصہ ساڑھے کھر وی رہئے تے جدُوں لالے ہوریں (اباجی) نے سامنے اینیں سے تے او اُٹھی تے کھڑے ہوئی گینے سے۔ ہتّھے نی تھرت اُپر ہوئی گئی تے چھوڑیس گیس کشمیراناں ذکر نہ کرنے کریے۔

پروین بیگم
(والدہ مصنّف)

عرضِ مصنف

محبت انسان سے انہونے کام کروا لیتی ہے۔ اس لیے اپنے کیے پہ شرمندہ نہیں ہوں۔ ہاں اس بات کا احساس ضرور ہے کہ میری تحقیق نہ ہونے کے برابر ہے اور یہی کمزوری کہانی کا باعث بنی۔ حالانکہ ضرورت اس بات کی تھی اور ہے کہ قومی آزادی کی جدوجہد کے سفر کو محفوظ کیا جائے۔ یہ کہانی ایک آزادی پسند طلبہ تنظیم کی جدوجہدِ آزادی کے تناظر میں لکھی گئی ہے۔ پروفیسر نذیر انجم کو مرحوم لکھتے ہوئے دل پر ایک چرکہ سا لگتا ہے، جناب صابر انصاری صاحب اور عظیم دت صاحب کے ساتھ وہ اس کہانی کے راویوں میں سے ہیں۔ عارف کمال صاحب، ریاض انقلابی صاحب، عبدالغفار انقلابی صاحب، میر خالد صاحب، قاری نثار صاحب، جاوید نثار صاحب وغیرہم کی یادداشتوں سے اپنی سُستی کے باعث استفادہ نہ کر سکا۔ اس کی کمی آپ کو محسوس ہوگی، مجھے اس کا شدّت سے احساس بھی ہے اور رنج بھی۔ البتہ امید ہے اور خواہش بھی کہ کوئی اس کمی کو پورا کر دے۔ میرپور شہر، اس کے گردونواح اور گاؤں سے ناواقفیت کے باعث منظر نگاری کے باب میں یہ کہانی بالکل ویران ہے۔ اسی طرح سوشل میڈیا کی رومانوی یلغار نے مجھے اس باب میں بھی ہاتھ ہولا رکھنے پر مجبور کیا۔ میرپوریوں کے مزاج، ان کے رہن سہن اور عادات واطوار سے بھی زیادہ آشنائی نہ تھی۔ اس لیے اس کہانی کے حقیقی کرداروں کو شاید اجنبیت سی محسوس ہو۔ اس کے ساتھ چند ایک تاریخی حوالے اپنے روائتی انداز میں بیان کیے جانے کے باعث شرارتی بچوں کی طرح ماں (کہانی) کی گود سے نکل نکل کر بھاگ رہے ہیں۔ ان سب کمزوریوں کے پردے میں دراصل اپنے آپ کو چھپانے کوشش ہے۔ سچ یہی ہے کہ میں اس کام

کے لیے مناسب آدمی نہ تھا، ڈھنگ سے نہ کر سکا۔

اس کام کے دوران اپنے ان پڑھ ہونے کا شدّت سے احساس ہوتا رہا۔ کوشش رہی ہے کہ اس تنظیم کی نظریاتی اساس کو درست انداز میں بیان کیا جائے۔ لیکن اپنی سمجھ سے زیادہ کہاں سے آتا؟ اس کے ساتھ تنظیم کے مخالف نقطہ نظر کو بھی جگہ دینے کی جسارت کی ہے۔ جو میرے نزدیک ضروری تھا، کہ دوسروں کو سنے بغیر اور ساتھ لیے بغیر آگے بڑھنا دراصل خود کو تنہا کرنے کا سفر ہے۔ اس سے بچنے کی کوئی سبیل نکلنی چاہیے۔ رومانس اور عزائم کے ایندھن بغیر تحریکیں پروان نہیں چڑھتیں لیکن حقیقت پسندی، حکمت اور منصوبہ بندی سے کنارا کشی خودکشی سے بھی بڑی خوفناک کوشش ہے۔ ماضی پر نظر رکھے بغیر مستقبل کی منصوبہ بندی (اگر کبھی ہو سکی) اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارنے کے برابر ہے۔ ضروری ہے کہ آپ کے خاندان کا ہر فرد اپنے ماضی سے آگاہ ہو تا کہ سب کامل کر آگے بڑھنا آسان ہو۔ یہ کام آپ کا تفصیلی اعمال نامہ ہی انجام دے سکتا ہے، یہ کتاب نہیں۔ تو پھر اس رام کہانی کا مقصد کیا ہے؟ یہ جاننے کے لیے آپ کو اسے پڑھنا پڑے گا۔ شاید یہ آپ کو بدمزہ چائے کی طرح لگے، مجھ سے یہی بن سکی ہے۔ میری خواہش تھی اور کسی حد تک سب کی مشترکہ ضرورت بھی سمجھتا تھا، سو پوری ہوئی۔

یہ ۸ جولائی ۲۰۱۳ء، رمضان سے ایک دن پہلے کی حبس زدہ دوپہر تھی جب سعید اسعد صاحب نے اپنی گلی میں دور سے آتے ہوئے نذیر انجم صاحب کا تعارف کروایا۔ وہ ہم دونوں کو ملنے پیدل چل کر آئے تھے۔ میری خوشی تکلیف میں بدل گئی۔ اپنے انٹرویو کے بعد وہ ہمارے ساتھ صابر انصاری صاحب اور عظیم دت صاحب کے گھر گئے۔ انکی گفتگو، اخلاص اور فقیرانہ شان نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ وہ مجھے ''قرضِ سخن'' میں پورے نہیں ملے۔ وہ ایک بڑے شاعر تھے مگر انسان اس سے کہیں بڑے تھے۔ افسوس کہ ان کا شکریہ ادا نہ ہو سکا۔ اللہ انہیں اپنی رحمت کے سائے میں رکھے۔ میں صابر انصاری صاحب کا تہہِ دل سے مشکور و ممنون ہوں کہ بیماری کے باوجود ہمیں وقت کے ساتھ بہت کچھ دیا۔ عظیم دت صاحب سے تو پھر بھی ملنا ہے۔ شکریے کی کوئی خاص ضرورت محسوس نہیں کر رہا کہ انہیں ابھی بہت کچھ کرنا ہے، ہم سے زیادہ جواں بھی ہیں اور پر

عزم بھی۔ان سب سے جو گفتگو ہوئی، دائرہ تحریر میں لانے کے علاوہ اس میں کچھ کمی بیشی نہیں ہوئی ہے۔سعید اسعد صاحب کو سعید عاجز کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔متذکرہ بالا احباب تک رسائی انہیں کے طفیل ہوئی۔یہ ان کا بڑا احسان ہے، مجھ پر بھی، پڑھنے والوں پر بھی۔احسان کا بدلہ احسان کے سوا کیا ہوسکتا ہے۔کوشش کروں گا آگے اللہ کی مرضی۔

سردار انور پر کسی چڑیل کی طرح ایک بیقرار رُوح کا سایہ ہے، جس سے جان چھڑانے کی سبیل بھی نہیں کرتا۔اس کام کی ترغیب بھی دی اور برابر پوچھتا رہا،تمہاری کتاب کا کیا بنا۔انجنیئر اعجاز خان پی این پی کے بنیادی کارکن تھے، دیر سے ملے پر درست ملے۔برابر حوصلہ افزائی فرماتے رہے۔افراز خان اور زاہد حنیف ہر دم ساتھ رہنے والے میرے وہ غریب دوست ہیں جن کی حوصلہ افزائی نے میری ہمت بندھائی۔لیاقت حیات صاحب (سابق صدر نیپ) سے ایک مرتبہ ذکر کیا کہ کچھ اس طرح کا کام کرنا چاہتا ہوں، بس پھر پیچھا نہیں چھوڑا اور مجھ سے یہ انہونی کروا کے دم لیا۔مسوّدہ مانگتے رہے کہ دکھاؤ کیا گل کھلا رہے ہو مگر نہ دکھایا کہ گل کھلنے پر ہی نظر آئے تو اچھا نظر آتا ہے۔یہ غالباً ۱۹۸۹ء کا سال اور کراچی کا جہانگیر پارک تھا جہاں بیٹھ کر انہوں نے میرے ایک مضمون کی اصلاح کی اور اسے ''عزم'' میں جگہ دی تھی۔جبکہ لکھنے کی ترغیب دینے والے جاوید حنیف تھے۔سوحرف سے میری اولین رشتے داری ان دو احباب کی مرہونِ منت ہے۔شاہد اعظم، عمران مسعود، اور ساجد عثمان کو بھلانا بھی زیادتی ہوگی، کہ ان کی صحبت میں بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔رئیس انقلابی البتہ انقلاب لا چکے اور جاوید شریف بھی۔ڈاکٹر صغیر کی توقعات پر پورا اترنا بہت مشکل ہے۔ڈاکٹر ممتاز البتہ ضرور ڈھارس بندھائیں گے۔اپنی نالائقی کے باعث اپنے استادِ محترم کا نام لینے کی ہمت نہیں ہو رہی۔اللہ نے اتنی عقل ہی نہیں دی کہ اپنے بارے میں ان کی طنز و مزاح میں لپٹی رائے کو سمجھ پاتا۔قدرت کے بندے پر بڑے احسانات ہیں۔

آخر میں اپنی بیٹیوں کے تعاون کا شکریہ ادا کرتا ہوں، خصوصاً تین سالہ رابعہ کا۔ان سے بہت سارا وقت دھونس دھاندلی سے لے کر اس کتاب کو دیا ہے۔وہ مجھ سے ہر رات ڈاکٹر

صغیر صاحب کی ''لوک کہانیاں'' سننے کی فرمائش کرتیں اور پھر ناراض ہو کر چلی جاتیں۔ اہلیہ کا بھرپور تعاون بھی شاملِ حال رہا اور طنز بھی کہ کس لیے اتنا ''جوف'' اٹھاتے ہو تمہارا لکھا پڑھے گا کون۔ آپ کی آراٴ کا انتظار رہے گا، ڈانٹ ڈپٹ کا بھی!

اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو

قمر رحیم خان

۱۴ اپریل ۲۰۱۴ء

بدع زاید،

ابوظہبی

متحدہ عرب امارات

سورج سر پہ آ چکا تھا۔ اس نے بیل کھول کر لڑکے کے حوالے کر دیے جو انہیں پانی پر لے گیا۔ بیلوں نے چشمے کی نالی میں منہ ڈال کر ''چھیک'' لگالی اور دیر تک پانی پیتے رہے۔

''ابا بھی ان بے زبانوں کو دوپہر تک جوتے رکھتا ہے۔ بچاروں کو کتنی پیاس لگی ہوئی ہے''۔

سجاد کو اپنے بیلوں سے بہت محبت تھی اور وہ ان سے لی جانے والی مشقت پر باپ سے کسی قدر خفا تھا۔ یہ بیل بھی بہت خوبصورت تھے۔ پورے گاؤں میں ان کی جیسی دوسری جوڑی نہیں تھی۔ حکمداد کا کہنا تو یہ تھا کہ ایسی جوڑی پورے میرپور میں کسی کے پاس نہیں ہے۔ ایک کا نام چنبہ اور دوسرے کا چینا تھا۔ قد و قامت میں، خوبصورتی میں اور نہ ہی رفتار میں کوئی بیل ان کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ ہل چلانے والوں میں بھی ہر کسی کا ان کے پیچھے چلنا مشکل تھا۔ ان کی نکیلیں ''کھُنڈ'' کے ساتھ بندھی رہتی تھیں۔ اور انہی کے ذریعے ''ہالی'' (ہل چلانے والا) انہیں کنٹرول میں رکھتا تھا۔ جبکہ اکثر بیلوں کو چلانے کے لیے چھڑی سے مارنا پڑتا تھا۔ ''رائی'' کے دنوں میں جب زیادہ دیر تک وہ جوتے رہتے تو حکمداد ایک کپڑا ہاتھ میں رکھتا تھا جس کے اشارے پر ان کی رفتار تیز ہو جاتی۔ راہ گیر ان بیلوں کو رُک رُک کر دیکھتے اور ان پر تبصرے کرتے۔ کتنے ہی لوگوں نے اُسے منہ مانگی قیمت دینے کی کوشش کی مگر وہ اِن کو بیچنے کے لیے تیار نہ ہوا۔ سجاد نے انہیں پانی پلا کر کھیتوں میں کھُلا چھوڑ دیا۔

حکمداد نے پگڑی اتار کر گرد سے اَٹے چہرے سے پسینہ صاف کیا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا چشمے تک پہنچا۔ وہ ہاتھ منہ دھو کر واپس آیا اور کھیت کے کونے پر درخت کی چھاؤں میں بیٹھ گیا۔ اس کی بیوی اس کے لیے کھانا لے کر آ رہی تھی۔ اس نے دوپٹے کا گول ''اِنُّو ن'' بنا کر سر پہ رکھا ہوا تھا جس پر پانی کی چھوٹی گاگر، گاگر کے اوپر چنگیر میں روٹیاں، ایک پیالے میں ساگ اور

چٹنی تھی۔ دائیں ہاتھ میں لسی کی بالٹی جس میں سلور کا بڑا گلاس تیر رہا تھا اور بائیں کولہو پہ ایک سال کا بچہ اٹھا رکھا تھا۔ اس نے کھانا اور پانی وغیرہ ایک جگہ پر رکھے اور بچے کو بھی نیچے چھوڑ دیا جو تھوڑی مشقت کے بعد باپ کی پیٹھ تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ حکمداد نے بچے کو گود میں اٹھالیا۔

''آج تھک گیا ہوں''۔ حکمداد نے کہا۔

''تو سویرے کھول دیا ہوتا نا بیلوں کو۔ یہ تو ساری زندگی کا کام ہے ایک دن میں تھوڑا ہی ختم ہوگا''۔ ریشم جان نے جواب دیا۔

''سچ کہہ رہی ہو۔ بندہ ختم ہو جاتا ہے پر کام ختم نہیں ہوتا''۔

ماں نے بڑھ کر بچے کی بہتی ہوئی ناک صاف کی اور اُسے باپ کی گود سے اٹھاتے ہوئے کہا۔

''روٹی کھالو جی''۔

بھُنی ہوئی مکئی کی روٹیاں، مکھن، ساگ، لسّی اور چٹنی اس کی دل پسند خوراک تھی۔

''تم لوگوں نے کھالی ہے روٹی''؟ اس نے پوچھا۔

''نہیں ابھی نہیں کھائی ہے''۔

''تو جاؤ جا کہ کھالو، ابھی تو بہت دیر ہو چکی ہے''۔

''آپ کھالیں اب برتن لے کر ہی جاؤں گی''۔

اس نے دوپٹہ کھول کر اوڑھ لیا تھا جو اپنے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک پر دل گرفتہ تھا۔ اسے وہ دن اچھی طرح یاد تھا جب حکمداد نے اسے شہر کی ایک بڑی دکان کی الماری سے منہ مانگے دام دے کر خریدا تھا۔ ایک مدت تک وہ بہت خوش رہا۔ ریشماں نے اسے بڑے چاؤ سے رکھا، خاص خاص موقعوں پر ہی اسے زیب تن کیا جاتا اور اس کی بڑی آؤ بھگت ہوتی۔ لیکن اب وہ اپنے نصیبوں کو کوس رہا تھا۔ منقّش کپڑوں کے پھولوں سے رنگت اور خوشبو کب کی اُڑ چکی تھی۔ البتہ ان کا رنگ ایسا تھا کہ ان میں میل نظر نہ آتی تھی۔ پلاسٹک کے نیلے سلیپر ابھی نئے تھے اسی لیے اِتراتے ہوئے چلتے تھے۔

اس کے ہاتھوں کی مہندی پھیکی پڑ چکی تھی اور ناخن آدھے لال اور آدھے سفید تھے۔ بائیں بازو پہ سونے کی چار چوڑیاں کھنک رہی تھیں اور کانوں میں بالیاں بھی اس کی ہر خوشی میں برابر کی شریک تھیں۔ حکمداد کو بھی پتا تھا کہ ریشم کو چیزوں کے استعمال کا کوئی خاص سلیقہ نہیں ہے لیکن اس کے باوجود وہ مہنگی سے مہنگی چیز اس کے لیے اٹھالاتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ریشم کے سانولے چہرے اور کشادہ پیشانی پر آج شادی کے ۱۵ سال بعد بھی ایک لکیر تک نمودار نہیں ہوئی تھی۔ اس کے نقش و نگار پہ زمانے کی گرد پڑی تھی نہ اس کی آنکھوں کی چمک ہی دُھندلائی تھی۔ وہ اتنی خوبصورت تھی کہ اس پیراہن میں بھی دُلہن نظر آتی تھی۔ لگتا تھا یہ سارا منظر کسی فلم کا حصہ ہے لیکن درحقیقت یہ زندگی کے سٹیج پہ فلمائی جانے والی حقیقت تھی۔

''سجاد کدھر ہے''؟ اس نے بیٹھتے ہی خاوند سے پوچھا۔

''بیلوں کو لے گیا ہے، آتا ہوگا''۔ حکمداد نے کہا۔

سجاد بیلوں کو کھیت میں چھوڑ کر بکریوں کو تلاش کرنے لگا۔ وہ بہت دور نکل گئی تھیں۔ کافی دیر ان کے پیچھے بھاگنے کے بعد بالآخر وہ تھک کر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ خُوشبو میں نہائی ہوئی ہلکی ہلکی ہوا پتّوں کے کانوں میں سرگوشیاں کر رہی تھی۔ دیس دیس کی باتیں اور سندیسے سُن سُن کر پتّے کِھلکھلاتے ہوئے جھُوم رہے تھے۔ گندم کی فصل اٹھ چکی تھی اور چاول اور مکئی کے بیجنے کا وقت سر پر آن پہنچا تھا۔ کھیتوں میں ہر طرف چڑیوں کے غول گندم کے بکھرے ہوئے دانے جمع کرنے میں مصروف تھے۔ جنگلی مینائیں پیٹ بھر کر کھانے کے بعد موج مستی کر رہی تھیں۔ بھینسوں اور بیلوں کی پیٹھ پر سواری ان کا بہترین مشغلہ تھا۔

ساتھ کے دوسرے درخت پر ایک عجیب ہی تماشہ لگا ہوا تھا۔ ایک مینا کے بچے اب بڑے ہو چکے تھے۔ کافی دنوں سے وہ انہیں اڑنے کی ترغیب دے رہی تھی لیکن وہ مانتے نہیں تھے۔ چونکہ یہ اس کے پہلوٹھی کے بچے تھے اس لیے اسے بھی ان کی تربیت کا کوئی خاص تجربہ نہ تھا۔ بلکہ وہ تو یہ بھی بھول چکی تھی کہ خود اس نے کیسے اُڑنا سیکھا تھا۔ یقیناً اس کے ماں باپ نے ہی اسے سکھایا ہوگا۔ اُن کے بارے میں سوچ کر وہ مغموم ہو جاتی اور اس کی چھوٹی چھوٹی کالی آنکھیں

بھیگ جاتیں۔ ایسے میں جب بچے اسے تنگ کرتے تو وہ انہیں خوب ڈانٹتی اور دو چار تھپڑ رسید کرنے میں بھی دریغ نہ کرتی۔ بچوں کے باپ پر تو وہ بہت جلی ہوئی تھی۔ دن میں ایک آدھ بار اِن کو دانہ دُنکا لا کر دینا احسان سمجھتا تھا۔ بہت آوارہ تھا پورا دن جانے کہاں کہاں جھک مارتا رہتا تھا۔ صبح و شام پابندی کے ساتھ نماز اور ذکر اذکار کرنے کے علاوہ اس میں کوئی اچھی بات نہ تھی۔ ان دونوں اوقات میں اس کی تمام تر اکڑ خانی ختم ہو جاتی تھی۔ لگتا تھا کہ اس جیسا عاجز و مسکین پوری دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ وہ چپکے چپکے روتا بھی رہتا تھا۔ وہ اسے اِس حال میں دیکھ کر بہت خوش ہوتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس کے ساتھ ٹِکی ہوئی تھی ورنہ اس کی لاپروائی پہ جاتی تو ایک دن بھی اس کے ساتھ نہ رہتی۔ البتہ ایک اور بات بھی اس میں اچھی تھی کہ وہ کبھی اسے ڈانٹتا یا مارتا نہ تھا۔ حالانکہ پاس پڑوس میں اکثر لڑائیاں جھگڑے ہوتے رہتے تھے اور ''مار کُوٹ'' کا رواج عام تھا۔

اس کی سہیلیوں نے اُس کے ساتھ وعدہ کر رکھا تھا کہ وہ آج اس کی مدد کے لیے آئیں گی۔ البتہ اُسے یہ ہدائت کر رکھی تھی کہ بچوں کو کھانے پینے کے لیے کچھ نہ دینا۔ سورج نکلتے ہی اس کا میاں حسبِ سابق نکل پڑا۔ اُس نے لاکھ منتیں کیں کہ

''ذرا تم بھی اِن بچوں کے بارے میں کچھ سوچو۔ یہ اتنے بڑے ہو گئے ہیں پر اُڑنے سے گھبراتے ہیں۔ میں پورا دن ان کو کھلا کھلا کہ تھک جاتی ہوں۔ اب یہ بہت اناج کھانا شروع ہو گئے ہیں''۔

''میں نے تمھیں کتنی بار کہا ہے کہ ان نکموں کا کھانا پینا بند کر دو پھر دیکھو یہ کیسے اڑتے ہیں۔ مگر تم میری ایک نہیں سنتی ہو تو جو مرضی کرو۔ میرے پاس تو اتنا وقت نہیں ہے۔ اپنے کام کاج کے ساتھ برادری، رشتے داری بھی چلانی ہوتی ہے۔ سیاست کے جھمیلے اپنی جگہ ہیں۔ تمھیں کیا بتاؤں پورا دن کن کن جھنجٹوں میں پڑا رہتا ہوں۔ پڑوس میں کوئی مرتا رہے تمھیں اس سے کوئی غرض نہیں۔ نہ تم ماتم داری پہ جاؤ، نہ بیمار پُرسی پہ، بس شادی بیاہ کی تم کو دَرک رہتی ہے۔ باجا بجنے سے پہلے پہنچ جاتی ہو''۔ میاں نے جواب دیا۔

''اے ہے کیسی عجیب بات کرتے ہو! باپ ہونا اس لیے۔ کھانے کو نہ دوں تو بھوک

سے مر نہ جائیں گے؟ ایک دن یہ بھی اپنے پیروں پہ کھڑے ہو ہی جائیں گے۔ صدا ایسے تو نہ رہیں گے۔ لیکن تمہاری باتیں اور رویّہ کبھی نہ بھولے گا۔ انہیں بھی سب پتہ ہے۔ وہ دیکھ نہیں رہے کہ تمہارا ان کے ساتھ کیا سلوک ہے''؟

''دیکھو تمہاری بات بالکل ٹھیک ہے۔ مجھے تمہاری تکلیف کا احساس بھی ہے۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ میرے اوپر جو دوسروں کے حقوق ہیں، جو میری ذمہ داریاں ہیں وہ کون ادا کرے گا۔ تم نے گھر سنبھال رکھا ہے تبھی میں برادری کے معاملات میں وقت دے پاتا ہوں۔ تمہیں لوگوں کے مسائل کا اندازہ نہیں ہے۔ اگر تمہیں سنانے بیٹھ جاؤں تو دُکھ کے مارے تم رونے لگو''۔ میاں نے وضاحت کی۔

''لیکن باقی لوگ بھی تو ہیں ہماری برادری میں۔ تم اکیلے کے ذمے سارے کام لگے ہوئے ہیں کیا''؟

''ٹھیک ہے لیکن لوگ جتنا مجھ پر اعتماد کرتے ہیں کسی اور پر بھی کرتے ہیں؟ پورے ملک میں میرا نام ہے۔ اتنی میری عزت ہے جتنی کسی پیر کی بھی نہیں۔ جو بات میں کہہ دوں لوگ اس سے دوسری نہیں کرتے۔ میں اگر دوسروں کی پرواہ نہیں کروں گا تو انہیں کیا پڑی ہے مجھے سر پہ اٹھائے پھرنے کی۔ دوسروں کے کام آنا ہی زندگی ہے۔ تم دیکھ نہیں رہی ہو لوگ آپس میں کتنے جھگڑتے ہیں۔ میں ان کو ایسے ہی چھوڑ دوں تو یقین کرو یہاں پر ایسے فتنے باز بھی ہیں کہ قتل و غارت کروا دیں۔ اور صرف اپنے لوگ ہی مجھ پر اعتماد نہیں کرتے۔ آج مجھے چڑیوں نے ایک کیس سُننے کے لیے بلایا ہوا ہے۔ مجھے اگر تمہاری اور بچوں کی فکر نہ ہوتی تو انہیں اپنے گھر پہ بلا لیتا۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔ اچھا میں چلتا ہوں''۔

میاں کے جانے کے بعد وہ بھی نکل گئی۔ دوپہر کے قریب جب وہ لوٹی تو اس کی دو سہیلیاں پہلے سے پہنچی ہوئی تھیں۔

''انہیں کچھ کھانے کو تو نہیں دیا ہے''؟ ایک سہیلی نے پوچھا۔

''بالکل کچھ بھی نہیں دیا، دیکھو تو کتنے چلّا رہے ہیں''۔ اُس نے جواب دیا۔

''بہت اچھا کیا ہے۔ پیٹ بھرا ہو تو دماغ کام نہیں کرتا۔ فکر نہیں کرو اب ان کو ضرور عقل آئے گی''۔

ایک ایک کر کے اُس کی درجن بھر سہیلیاں جمع ہو گئیں۔ اب وہ گھونسلے کے پاس ٹہنیوں پر جا بیٹھیں اور پھر وہاں سے شور مچانا شروع کر دیا۔

''چلو باہر نکلو، اُڑو، ہمارے ساتھ اُڑو...... اُڑو، اُڑو، اُڑو...... آجاؤ......''

ان میں سے ہر کوئی یہی چلائے جا رہی تھی اور بار بار اڑ اڑ کر واپس گھونسلے کے پاس آ کر بیٹھتی تھی۔

ان کے شور نے پورا علاقہ سر پہ اٹھا رکھا تھا۔ تقریباً آدھا گھنٹہ یہ تماشہ لگا رہا تب جا کر ایک نے ہمت کی۔ اُس نے گھونسلے سے باہر نکل کر ٹہنی پر پاؤں رکھا اور بڑی مشکل سے خود کو گرنے سے بچایا۔

پھر شور بلند ہوا۔

''شاباش شاباش، بہت اچھے، زندہ باد، زندہ باد۔ سنبھل کہ بیٹھو، ڈرو نہیں کچھ نہیں ہو گا۔ تم بہت دلیر ہو۔ اچھی طرح سے پاؤں جما لو اور نیچے نہ دیکھو''۔

اُس کی ماں اڑ کر اس کے پاس جا بیٹھی۔

''تم جو اندر بیٹھے ہو تم بھی نکل آؤ۔ دیکھو اسے کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔ شاباش نکل آؤ، نکل آؤ''۔

''کتنا پاگل ہے دیکھنا ابھی گر پڑے گا۔ اس کی ساری ہڈیاں ٹوٹ جائیں گی''۔ ننھی مینا نے کہا۔

''میرے خیال سے کچھ نہیں ہو گا۔ تم یونہی ڈرتی ہو۔ ہمیں بھی ہمت کرنی چاہیے''۔ بھائی نے کہا۔

میناؤں نے پھر اڑنا شروع کر دیا۔

''آؤ ہمارے ساتھ آؤ...... ہمت کرو، ایک بار اُڑ کہ دیکھو ہوا تمہیں خود اڑائے گی''۔

بڑی منت سماجت اور شاباشیوں کے بعد آخر کار اس نے اڑان بھری اور تھوڑے سے فاصلے پر دوسری ٹہنی پہ جا بیٹھا۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اور چہرے کا رنگ زرد ہو چکا

تھا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد وہ سنبھل گیا۔ اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔

شور شرابے کے باعث اس کی آنکھ کھل گئی۔ دیکھا تو میناؤں نے آسمان سر پر اٹھا رکھا ہے۔ وہ جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''لازم کوئی سانپ ان کے گھونسلے میں گھس گیا ہوگا۔ تبھی یہ اتنی چلاّ رہی ہیں''۔ اس نے دل میں سوچا۔ لیکن اسے سانپ کہیں نظر نہیں آیا۔ تھوڑی دیر غور سے دیکھنے کے بعد اسے ساری بات کی سمجھ آ گئی۔ بچوں کی ٹریننگ کے وقت وہ ایسے ہی کرتی رہتی ہیں۔ آج سکول میں چھٹی تھی اور وہ صبح سے اپنے پورے خاندان کے ساتھ کھیتوں میں کام کر رہا تھا۔ پورے چھ دن وہ اتوار کا انتظار کرتا۔ صبح دیر سے اٹھنا اور پھر بغیر منہ دھوئے ناشتہ کرنا اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ مال مویشیوں کو کھیتوں میں لے جا کر وہ دوسرے لڑکوں کے ساتھ مل کر کھیلتا رہتا۔ لیکن ان دنوں کسی کے پاس بھی کھیلنے کی فرصت نہ تھی۔

وہ حکمداد کو خلافِ معمول خاموشی سے کھانا کھاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ حکمداد کے چہرے پر تفکّر کے آثار نمایاں تھے۔ اس کی آنکھیں بجھی بجھی سی تھیں، ماتھے کی لکیریں گہری ہوگئی تھیں اور ان کے درمیان ایک اجنبی سی تحریر لکھی تھی۔ وہ باوجود کوشش کے اِسے پڑھنے، سمجھنے سے قاصر تھی۔ وہ اُسے دیکھتی رہی، سوچتی اور پریشان ہوتی رہی۔ کبھی کبھی اپنے رشتے داروں کی کسی بات، کسی جھگڑے، فتنے پر وہ اُلجھ جاتا تھا مگر آج معاملہ کچھ اور ہی تھا۔

''خُدا خیر کرے''۔ اُس نے دل ہی دل میں دعا کی۔

حکمداد نے کھانا ختم کر لیا، کھایا نہیں تھا۔ وہ اُسے ہاتھ دھلانے کے بعد پوچھنے لگی۔

''کیا بات ہے جی آج کچھ اداس لگ رہے ہو''؟

حکمداد نے اس کی طرف دیکھا تو وہ ڈر گئی۔ اس کی آنکھوں میں اس قدر مایوسی اس نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔

''کوئی بات نہیں ہے''۔ اس نے جواب دیا۔

اس کی زبان اس کی آنکھوں، چہرے اور دل و دماغ کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

''تو میں آپ کی بات پہ یقین کر لوں''۔ ریشم جان نے پوچھا۔

''ہماری کمر ٹوٹ گئی ہے ریشماں''۔ یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

ریشماں کا دل دھل گیا اور اس نے تڑپ کر پوچھا۔

''کیا ہو گیا ہے جی''؟

''ایوب خان کی حکومت ہماری زمینوں پہ ڈیم بنانا چاہتی ہے''۔اس نے جواب دیا۔

''وہ کیا ہوتا ہے جی''؟

حکمداد نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور بولا۔

''حکومت دریا پہ بند باندھ کر اسے روک دے گی اور ہماری زمینیں اور شہر اس پانی میں ڈوب جائیں گے''۔

''یہ تو بہت ہی عجیب سزا ہے جی۔حکمران تو زیادہ سے زیادہ پھانسی پہ لٹکا دیتے ہیں۔عمر بھر کو جیل میں ڈال دیتے ہیں۔کوڑے مارتے ہیں، ہاتھ پاؤں کاٹ دیتے ہیں، کانوں میں سیسہ بھر دیتے ہیں، آنکھیں نکال کر اندھا کر دیتے ہیں......! لیکن یہ تو پہلی بار سنا ہے جی۔ایسا کیا جرم کیا ہے ہم نے کہ شہر اور زمینوں کے ساتھ پانی میں ڈبونے لگے ہیں''۔اس کی حیرت انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔

''ہمارا کوئی والی وارث نہیں ہے ریشماں، یہی ہمارا جُرم ہے''۔

''کیوں جی ہماری آزاد کشمیر کی حکومت ہماری وارث نہیں ہے''؟اس نے پوچھا۔

''اس کی اتنی اوقات نہیں ہے چھلیے لوکے''۔حکمداد نے بگلے کے سگریٹ کا لمبا کش لگاتے ہوئے کہا۔

''میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا''۔اس نے بے بس ہو کر کہا۔

''دیکھو پاکستان کی حکومت دریا کا پانی روک کر اس سے بجلی پیدا کرے گی جس سے گھروں میں بتیاں بھی جلیں گی اور کارخانے بھی''۔

''پانی سے بجلی پیدا ہو گی''؟ ریشماں نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

''ہاں جیسے پانی سے جندر چلتے ہیں ایسے ہی دریا کے پانی سے بڑے بڑے جندر چلیں گی اور ان سے بجلی پیدا ہو گی''۔حکمداد نے وضاحت کی۔

''تو جی یہ ایوب خان کسی ویرانے میں ڈیم کیوں نہیں بناتا، ہمیں اجاڑنے پہ کیوں تلا

ہے۔ اتنا بڑا ملک ہے اس کے پاس، اُسے جگہ کی کیا کمی ہے''؟

''جگہ کی تو کمی نہیں لیکن وہاں کے لوگ نہیں مان رہے''۔

''تو ہمیں کالے کوّوں نے کاٹا ہے جو مان لیں''؟

''ہمارے ماننے نہ ماننے سے کوئی فرق نہیں پڑتا''۔

''کیسے فرق نہیں پڑنے والا۔ ہم نہیں نکلیں گے اپنی زمینیں چھوڑ کر تو کیسے کوئی نکالے گا''؟

''زبردستی نکال دیں گے''۔ حکمداد نے دوسرا سگریٹ سُلگایا۔

''یہ تو ظُلم ہے ناجی، اپنے لوگ نہ مانیں تو تم جا کر دوسروں کو ان کی زمینوں سے بے دخل کر دو''۔ غصے سے اس کا چہرہ لال ہو رہا تھا۔ ''ہم اپنی زمینیں چھوڑ چھاڑ کر کہاں جائیں گے۔ ہمارے مال مویشی، ہماری فصلیں، ہماری نسلیں، کیا بنے گا ہمارا؟ کدھر جائیں گے ہم دربدر ہو کر''؟؟

''اس سے انہیں کوئی غرض نہیں ہے ریشماں۔ انہیں بجلی پیدا کرنے کے لیے پانی اور زمین چاہیے۔ ہم، ہمارے دریاؤں کا پانی اور زمینیں سب بے خصمے ہیں اس لیے انہیں یہاں پر ڈیم بنانے میں کوئی رکاوٹ نہیں''۔



''یار کل بہت بڑے لوگ نہیں جمع ہوئے''؟ میر پور کے ایک ہوٹل میں بیٹھے لڑکوں میں سے ایک نے خوشی اور قدرے حیرت سے کہا۔

''واقعی بھئی بہت بڑی دنیا جمع ہوئی ہے۔اتنے لوگ میں نے زندگی میں نہیں دیکھے''۔ نذیر انجم نے جواباً کہا۔

''خود اندازہ کرلو بھئی اتنا بڑا جلوس تھا کہ اس کا ایک سرا میر پور میں تھا اور دوسرا چک ریام میں''۔صابر نے گویا ان دونوں کی تائید کی۔

'' اس کا کریڈٹ میر پور کی قیادت کو جاتا ہے۔ پہلی بار ہم نے سب کو اکٹھا دیکھا۔عبدالخالق انصاری صاحب، میجر عباس صاحب، غازی الٰہی صاحب، اسلام گڑھ والے راجہ نجیب صاحب، پیر علی جانشاہ صاحب اور بے شمار دوسرے لوگ۔اگر ہماری قیادت اسی طرح اتفاق سے رہی تو ڈیم کبھی نہیں بن سکے گا''۔نذیر نے کہا۔

''بالکل نہیں، کبھی نہیں بنے گا''۔نذیر تبسم بولا

''اتنی بڑی پبلک کے سامنے حکومت نہیں ٹھہر سکتی۔اتنے لوگ تو انقلاب لا سکتے ہیں ۔ڈیم کے منصوبے کو ختم کرنا تو کوئی بڑی بات نہیں''۔نذیر انجم کافی جذباتی ہو رہا تھا۔

''آپ کا کیا خیال ہے''؟ نذیر تبسم نے صابر سے سوال کیا۔

''پتہ نہیں یار کیا وجہ ہے مجھے تو ڈر سا لگتا ہے''۔صابر نے جواب دیا۔

''ڈر کی کیا وجہ ہے''؟ تبسم نے پوچھا۔

صابر کونے والی کرسی پر بیٹھا سہما سا لگ رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے چھوٹے چھوٹے معصوم سے آنسو جھانک جھانک کر سب کو دیکھ رہے تھے۔لیکن ان کے پرامید چہروں کو دیکھ کر کواڑوں کے پیچھے چھپ جاتے تھے۔کبھی کبھی بغیر چینی کے کڑوا قہوہ پی کر وہ اپنا غم غلط کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔اُس نے قہوے کی ایک چُسکی لی اور بولا۔

''بھئی دیکھو پاکستان میں فوجی حکومت ہے جسے اپنی کالونی میں من مانی کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ روکنے والے اس سے بہت کمزور ہیں''۔

''تو آپ کا کیا مطلب ہے کہ وہ ڈیم بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے''؟ تبسم قدرے متفکر نظر آ رہا تھا۔

''اللہ نہ کرے کہ یہ بن جائے۔ ہمارے لوگ در بدر ہو جائیں گے۔ گھر چھن جائیں گے زمینیں ڈوب جائیں گی۔ کھیتی باڑی ختم ہو جائے گی اور معاش کی تلاش میں نجانے ہم کہاں کہاں کی خاک چھانیں گے''۔

اس کے بعد محفل پر سکوت طاری ہو گیا۔

''راجہ حنیف صاحب آئے ہوئے تھے کل کافی دیر ہم اکٹھے بیٹھے رہے......''۔ ریاض انقلابی بولا۔

''وہ کدھر ہیں آجکل''؟ نذیر انجم نے پوچھا۔

''انہوں نے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا تھا نا، لاہور میں ہوتے ہیں آج کل''۔ ریاض نے انہیں بتایا۔

''اچھا اچھا' نذیر نے کہا 'ہم تو سوچ رہے تھے ادھر ہی ہیں کہیں''۔

''نہیں انہیں گئے تقریباً پانچ ماہ ہو گئے ہیں۔ بھئی بات تم سے کرنے کی یہ تھی، وہ کہہ رہے ہیں کہ سٹوڈنٹس کی کوئی تنظیم بناؤ''۔ ریاض نے سب کے چہروں پر ایک نظر دوڑائی۔

''سٹوڈنٹس کی تنظیم''؟ تبسم کی پیشانی پر سیاڑھ پڑ گئے۔

''ہاں سٹوڈنٹس کی تنظیم...... کچھ عجیب لگا ہے''؟ ریاض نے پوچھا۔

''آئیڈیا تو اچھا ہے''۔ انجم نے کہا

''مگر کس لیے''؟ تبسم نے پھر پوچھا۔

''اس لیے کہ ہم بہتر انداز میں اپنے حقوق کی بات کر سکیں''۔ ریاض نے وضاحت کی۔

''کسی اور سے بات ہوئی ہے''؟ انجم نے پوچھا۔

''ہاں کچھ دوستوں سے سرسری بات ہوئی تھی''۔ ریاض نے جواب دیا

''کیا کہہ رہے ہیں''؟

''وہ تو متفق ہیں، بلکہ بڑے جذباتی ہیں''۔

''مگراس کی اجازت ہے''؟اختر نے سوال کیا۔

''ایسے کاموں کے لیے اجازتیں نہیں لی جاتیں' ریاض نے جواب دیا' ویسے پاکستان میں سٹوڈنٹس فیڈریشن کام کررہی ہے''۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب ہم لوگ بھی سیاست کریں گے''؟تبسم نے کہا۔

''وہ تو ہم کر ہی رہے ہیں' ریاض نے کہا' جب سے منگلا ڈیم کے خلاف تحریک چلی ہے ہم اس میں شامل ہیں''۔

''مگر یہ سیاست تو نہیں ہے''۔تبسم نے اختلاف کیا۔

''تو کیا ہے پھر''؟ریاض نے پوچھا۔

''یہ تو اپنے تحفظ کی جنگ ہے' وہ بولا' اپنے اوپر ہونے والی زبردستی اور ظُلم کے خلاف احتجاج ہے''۔

''بس یہی تو کرنا ہے اور منظّم ہو کر کرنا ہے' ریاض نے جواب دیا' ہم نے کرسی کے لیے دھینگا مشتی تھوڑی ہی کرنی ہے''۔

''تو ٹھیک ہے بنالو تنظیم' تبسم نے کہا' دیر کس بات کی''۔

''ٹھیک ہے دوستوں سے رابطے کرو''۔ریاض نے کہا

اگلے ایک آدھ ماہ تک وہ کالج میں لڑکوں سے اس بارے میں گفت وشنید کرتے رہے۔

''رسپانس تو بہت اچھا ہے' ریاض بیٹھتے ہی بولا' لگتا ہے لوگ اس کے لیے پہلے سے تیار بیٹھے ہیں۔میرا خیال ہے ہمیں کام کا باقاعدہ آغاز کر لینا چاہیے''۔

''دیکھیے ریاض صاحب رسپانس بے شک بہت اچھا ہے، لیکن شاید باتوں کی حد تک''۔جاوید نظامی کافی سنجیدہ صورت بنائے ہوئے تھا۔''عملی طور پر کام کرنا اتنا آسان نہیں ہوگا۔کالج میں لڑکوں کی تمام تر توجہ پڑھائی پر ہوتی ہے۔اور جنہوں نے پڑھنا نہیں ہوتا انہوں نے کچھ بھی نہیں کرنا ہوتا۔میں ہرگز آپ کو مایوس نہیں کرنا چاہتا ہوں۔بلکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ

ہمیں زیادہ optimistic نہیں ہونا چاہیے۔کام شروع کرنے سے پہلے تمام پہلوؤں کا جائزہ لینا اور خود کو ہر طرح کے حالات کا سامنا کرنے کیلئے تیار رکھنا پڑے گا۔شاید ہم یہ بات بھول رہے ہیں کہ ہم ایک ایسے وقت میں کالج میں تنظیم کھڑی کرنے جا رہے ہیں جب پورا میر پور ڈیم کے معاملے میں سراپا احتجاج ہے۔پاکستان میں مارشل لاء لگا ہوا ہے۔مزید یہ کہ کالج انتظامیہ کالج کے اندر کسی قسم کی تحریک یا گڑبڑ کی متحمل نہیں ہو سکتی''۔

''دیکھو نظامی! اگر ہم اس بات سے متفق ہیں کہ ہمارے بے شمار مسائل ہیں اور ان کے حل کے لیے ہمیں منظّم ہونا چاہیے۔تو پھر شہر کے کیا حالات ہیں، پاکستان یا آزاد کشمیر میں کس کی حکومت ہے، کالج انتظامیہ کا ردعمل کیا ہوگا، یہ سوچنا ہمارا کام نہیں ہے۔' ریاض نے کرسی پر پہلو بدلا۔' ہمیں عملی طور پہ قدم اٹھا کہ دیکھ لینا چاہیے کون کیا کرتا ہے اور یہ کہ ہم نے کیا کرنا ہے۔ویسے میرا خیال ہے کہ کچھ بھی نہیں ہونے والا۔ بلکہ موجودہ ہنگامی حالات میں ہماری نقل و حرکت کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا جائے گا''۔

تقریباً ایک مہینے بعد جو دوست ان کے رابطے میں آئے ان کی مشاورت سے تنظیم کی کابینہ کا چناؤ ہو گیا۔ یوں آزاد کشمیر کی پہلی طلبہ تنظیم جموں کشمیر سٹوڈنٹس یونین کا قیام عمل میں آیا۔ریاض انقلابی اس کے چیئر مین بنے۔یہ کافی فعال تنظیم تھی جس میں ہر مکتبہ فکر کے طلبہ شامل تھے۔منگلا ڈیم کی تحریک میں اس کی قیادت نے بھر پور حصہ لیا۔اس تنظیم کا بنیادی مقصد آزاد کشمیر کے تعلیمی مسائل کے حل کے لیے جدو جہد کرنا تھا لیکن ریاست جموں کشمیر کی آزادی وحق خود ارادیت کا حصول بھی اس کے مقاصد میں شامل تھا۔چونکہ یہ تمام طلبہ برادری کی نمائندہ تنظیم تھی جس میں ہر نظریے کا آدمی شامل تھا اس لیے خود مختار کشمیر کے مطالبے کو اس کے منشور کا حصہ نہیں بنایا گیا۔ایک عرصے تک تنظیم کا دائرۂ کار میر پور تک ہی محدود رہا لیکن بالآخر یہ بحث چھڑ گئی کہ اسے پورے آزاد کشمیر تک پھیلایا جائے۔

''بھئی آپ لوگوں کا مطالبہ بالکل صحیح ہے کہ ہمیں اب میر پور سے باہر نکلنا چاہیے'۔ جاوید نظامی نے کہا 'لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نکلے گا کون؟ یہاں سے لے کر مظفر آباد تک ہر جگہ جانا لوگوں سے رابطے کرنا اور پھر انہیں منظّم کرنا، یہ سارے کام یہاں بیٹھے بٹھائے تو نہیں ہو

جائیں گے۔اس کے لیے بھاگ دوڑ کرنا پڑے گی''۔

''ظاہر ہے اس کام کے لیے ہر جگہ جانا پڑے گا اور ایک دفعہ نہیں بار بار جانا پڑے گا'۔ نذیر انجم بولا۔' دوستوں کو منظم کرنا اور انہیں ساتھ لے کر چلنا ہو گا،ان کی حوصلہ افزائی کرنا ہو گی۔رہی بات یہ کہ نکلے گا کون تو اس کے لیے سب کو ہی تیار ہونا چاہیے۔اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم میں سے سوائے صابر کے کسی کے بھی میر پور سے باہر رابطے نہیں ہیں۔اس لیے انہیں زیادہ مشقت اٹھانا پڑے گی''۔

''بھئی میری مشقت کی تم فکر نہ کرو' صابر نے انہیں حوصلہ دیا 'میں اس کام کے لیے بخوشی تیار ہوں''۔

''پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے''۔ریاض نے کہا۔

''مسئلہ تو ہے نا یار' نذیر انجم بولا 'چار چار آنے تک چندہ تو کوئی دینے کو تیار نہیں ہوتا، پورے آزاد کشمیر کا سفر اور کھانے پینے کا خرچ کہاں سے آئے گا''۔

''او بھئی یہ بھی کوئی اتنا مسئلہ نہیں ہے' جاوید بولا 'مل جل کہ کچھ نہ کچھ کر لیں گے۔اس وجہ سے ہمارا کام نہیں رکے گا''۔

''مشتاق آؤ تمہیں آج ایک دلچسپ واقعہ سناتا ہوں''۔صابر نے مشتاق کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔

مشتاق نے شوق سے صابر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا''ارے ضرور انصاری صاحب ضرور''۔

صابر نے چائے کی چسکی لی اور بولا''مزے کی بات یہ ہے کہ واقعے کا تعلق بھی راولاکوٹ سے ہے''۔

مشتاق نے قدرے متذبذب ہو کر زرین کی طرف دیکھا، پھر صابر کی طرف نظر اٹھائی اور بولا'' خیریت تو رہی تھی نا''؟

صابر نے فلک شگاف قہقہہ لگایا ''میں تمہاری پریشانی تاڑ گیا ہوں''۔وہ کچھ دیر اور ہنستا اور ان دونوں کی پریشانی سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

''ابھی کچھ بول بھی پڑو نا انصاری صاحب''مشتاق نے کہا۔

''بھئی سو فیصد خیریت رہی تھی تم پریشان نہ ہو۔ ہوایوں کی تقریباً ایک سال پہلے علوی صاحب مجھے اپنے ساتھ راولا کوٹ لے آئے۔ تب میں نے راولا کوٹ کو پہلی بار دیکھا۔ کچھ اجنبی اجنبی سا لگا تھا، اب تو خاصی انسیت ہوگئی ہے۔ رات ہم اسی ہوٹل میں ٹھہرے۔ صبح صبح ہی علوی صاحب نے جگایا اور ناشتے کے بعد کہا کہ پوسٹر لگانا شروع کردو آگے بھی جانا ہے''۔

'''' پوسٹر کس چیز کے''؟ مشتاق نے پوچھا۔

''ارے یہ تو میں بتانا ہی بھول گیا۔ بھئی ہوایوں تھا کہ میر پور میں محاذ رائے شماری کا جلسہ طے ہوا۔ علوی صاحب کی ذمہ داری لگی کہ وہ پونچھ میں جائیں، لوگوں سے رابطے کریں اور پوسٹر بھی لگا آئیں۔ علوی صاحب کو کوئی ساتھ نہ ملا تو انصاری صاحب (عبدالخالق انصاری) نے مجھے ان کے ساتھ روانہ کر دیا۔ چچا تھے انکار بھی نہیں کر سکا اور ساتھ ہی یہ بھی سوچا چلو اس بہانے راولا کوٹ ہی دیکھ آتے ہیں۔ بہر حال صبح صبح میں ناشتہ کرنے کے بعد پوسٹر لے کر نکل گیا۔ پوسٹر بھی لگاتا جاتا تھا اور دل ہی دل میں ڈر بھی رہا تھا کہ اب مار پڑی کہ اب پڑی۔ ایک تو حکومت مخالف جماعت کے پوسٹر اوپر سے سدھنوں کا علاقہ، ڈر تو لگنا ہی تھا۔ جب بھی کوئی آدمی پاس سے گزرتا ہاتھ پیچھے باندھ کر کھڑا ہو جاتا۔ علوی صاحب خود لحاف میں دُبکے بیٹھے ہیں اور مجھے کام پر لگا دیا۔ ان پر خوب غصہ آیا۔ جب میں کچہری پہنچا تو علی محمد صاحب، زرین خان تمہارے چچا نے دیکھ لیا۔ پوسٹر کو غور سے پڑھا اور بولے۔

''اے لڑکے اِدھر آؤ''۔

میرے پسینے چھوٹ گئے کہ وہ کام ہو ہی گیا جس کا ڈر تھا۔

قریب پہنچا تو بولے۔

''کہاں سے آئے ہو''؟

کہا ''میر پور سے''۔

سر سے لے کر پاؤں تک غور سے دیکھا اور پوچھا۔

''انصاری کے کیا لگتے ہو''؟

''بھتیجا''۔

''اور کون آیا ہے ساتھ میں''؟

''علوی صاحب''۔

''کدھر ہیں''؟

''ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں''۔

''کون سے ہوٹل میں''؟

''تسکین ہوٹل میں''۔

''ملواؤ گے ان سے''؟

جان میں جان آئی، کہا ''جناب کیوں نہیں''۔

''ان کی ملاقات ہوئی۔ علی محمد صاحب نے کہا بھئی ہم لوگ کب کا انتظار کر رہے ہیں۔ آپ لوگوں نے تو آنے میں بہت دیر کی۔ بہر حال وہ لوگ کافی دیر باتیں کرتے رہے۔ ہمیں بہت سہارا ملا، دلی خوشی ہوئی، اپنا کام کیا اور واپس چل دیئے''۔

''شکر ہے آپ کے خدشات غلط نکلے ورنہ مفت میں معافی مانگنا پڑتی''۔ مشتاق نے ہنستے ہوئے کہا۔

''انصاری صاحب اب آپ کو پوسٹر لگانے راولاکوٹ نہیں آنا پڑے گا''۔ زرین پہلی بار بولا۔

''اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے لیکن اب ہم محاذ کے نہیں اپنے پوسٹر لگایا کریں گے''۔ صابر نے کہا۔

''کیا مطلب'' ؟ مشتاق نے سوال کیا۔

صابر نے ایک گہری سانس لی اور بولا ''یہی بات تم سے کرنے آیا ہوں۔ آپ کو تو پتہ ہے میر پور کی سطح پر ہم نے ایک اسٹوڈنٹس یونین بنا رکھی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس کا دائرۂ کار پورے آزاد کشمیر تک بڑھایا جائے۔ آپ لوگ اپنے ضلع کی ذمہ داری لو اور تنظیم سازی کرو''۔

''اس تنظیم کے مقاصد کیا ہوں گے''؟

''بھئی بنیادی بات تو یہ ہے کہ ہم نے آزاد کشمیر کے تعلیمی مسائل کے حوالے سے

جدوجہد کرنی ہے۔آج تک ہمارے پاس کوئی یونیورسٹی نہیں ہے، نہ میڈیکل کالج ہے نہ لأ کالج۔ پورے آزاد کشمیر میں تین ڈگری کالج ہیں۔لڑکیوں کے لیے تو ایک بھی ڈگری کالج نہیں۔اس کے علاوہ وطن کی آزادی کی جدوجہد بھی ہماری ذمہ داری بنتی ہے۔ ہمارے حکمران اور سیاستدان قوم کے ساتھ دھوکہ کر رہے ہیں۔ ہمارے عوام کو ذات برادریوں میں تقسیم کر کہ خود اقتدار کے کھیل میں مصروف ہیں۔ہمیں طلبہ کے ساتھ ساتھ عوام کو بھی اپنی غلامی اور محرومیوں کا احساس دلانا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ پورے آزاد کشمیر کے طلبہ کو اکٹھا کر کہ دعوتِ فکر دی جائے''۔صابر اپنی بات مختصر کرتے ہوئے استفہامیہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔

ان دونوں نے ،جو بڑے انہماک سے اُس کی بات سن رہے تھے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

''آپ کی باتیں تو بالکل درست ہیں۔ہم بھی یہی محسوس کر رہے ہیں لیکن سٹوڈنٹس کے اندر تو ابھی تک سیاست کا کوئی رواج نہیں ہے اور ہمیں اس کا کوئی تجربہ بھی نہیں ہے''۔مشتاق نے کہا۔

''ہمیں بھی کوئی تجربہ نہیں تھا۔کام شروع کیا تو سب کچھ آسان ہو گیا۔کہیں نہ کہیں سے شروعات تو کرنا پڑے گی''۔صابر نے جواب دیا۔

''ہمیں کیا کرنا ہوگا''؟زرین نے پوچھا۔

''جو محسوس کر رہے ہو اس کا چرچا شروع کردو۔زیادہ سے زیادہ طلبہ سے رابطے کرو، دوست بناؤ۔انہیں اپنی ذمہ داری بتاؤ کہ طلبہ کسی معاشرے کا سب سے زیادہ باشعور، فعال اور اہم حصہ ہوتے ہیں۔کسی بھی قسم کی تبدیلی میں ان کا کردار بہت اہم ہوتا ہے۔ہمیں اپنے حقوق کا پتہ ہونا چاہیے۔اپنے ملک میں معیاری ، بنیادی اور اعلیٰ تعلیم ہمارا حق ہے اور یہ حق ہمیں ملنا چاہیے۔ہم ایک غلام قوم ہیں اور آزادی ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔ہمیں جو بتایا جاتا ہے کہ ہم ۱۹۴۷ء میں آزاد ہو چکے یہ اس صدی کا سب سے بڑا جھوٹ ہے۔ پچاسی ہزار مربع میل میں سے ساڑھے چار ہزار مربع میل پر پاکستان کی کالونی بنا کر یہاں کے وسائل کو دن رات لوٹنے کی آزادی کو کشمیری قوم کی آزادی کا نام نہیں دیا جا سکتا۔گلگت بلتستان کے عوام کو بنیادی حقوق بھی

حاصل نہیں ہیں۔ اقصائے چن کا علاقہ چین کو بھتے کے طور پر دے دیا گیا لیکن ہمارے حکمران تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ ہمیں بری طرح تقسیم کر دیا گیا ہے۔ خطے کی طاقتیں ہمیں تر نوالہ سمجھ کر تقریباً ہڑپ کر چکی ہیں۔

میرے عزیز دوستو! ان حالات میں جب آپ کی قیادت غیروں کے ساتھ مل چکی ہو۔ آزادی کے نام پر آپ کے عوام کو گمراہ کیا جا رہا ہو، آپ کے وسائل لوٹے جا رہے ہوں، آپ کے ایک شہر کو زبردستی ڈیم میں ڈبونے کا منصوبہ پر کام شروع ہو چکا ہو، بین الاقوامی سطح پر آپ کے مسئلے کو بگاڑ کر ایک علاقائی مسئلہ بنا دیا گیا ہو۔ آپ خود بتائیں ہمارا کیا رول بنتا ہے؟ اور ہمیں یہ رول دینا چاہیے یا نہیں؟ ہم اپنے ذاتی مفاد کی خاطر آپ کے پاس نہیں آئے ہیں۔ نہ ہم آپ کو اقتدار کی لالچ دیتے ہیں نہ مال کی۔ یہ سراسر گھاٹے کا سودا ہے۔ ہم اس راستے پر ہیں جو تختہ دار کی طرف تو لے جا سکتا ہے اقتدار کی کرسی کی طرف نہیں۔ ہم یہ طے کر چکے ہیں کہ اپنے حقوق کی خاطر، اس دھرتی کی آزادی کی خاطر اپنا سب کچھ لگا دیں گے۔ ہمارے سیاستدانوں نے قبیلائی و علاقائی عصبیت کا زہر ہمارے عوام کی رگوں میں اتار دیا ہے۔ ہم نے اس زہر کو اگل دیا ہے، عصبیت کے تمام بتوں کو اپنے پاؤں تلے روندھ ڈالا ہے۔ ہم ایک قوم ہیں ہم اپنے درمیان پائی جانے والی قبیلائی، علاقائی، مذہبی، ہر تفریق کو مٹا ڈالیں گے۔

لیکن ...... لیکن ہمیں یہ سب کچھ کرنے کے لیے اکٹھا ہونا پڑے گا۔ اپنے آپ کو منظّم کرنا پڑے گا۔ ہمیں پونچھ سے آپ لوگوں کا ساتھ چاہیے، بھرپور اور جاندار ساتھ چاہیے۔ دیکھو میرے دوستو! گیدڑ، کوے، گِدھ اور چیلیں، ہماری قوم کے جسم کو نوچ رہے ہیں۔ ہم اگر اس دھرتی کے بیٹے ہیں تو ہمیں اپنی قوم کو خوابِ غفلت سے جگانا ہوگا۔ ان گیدڑوں، کوّوں اور چیلوں کی اصلیت کو عوام پر آشکار کرنا ہوگا۔ انہیں مار بھگانا ہوگا۔ اس کے لیے ہمیں ایک ساتھ مل کر جدوجہد کرنا ہوگی......''۔

صابر کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے اور وہ اُن دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مشتاق نے اس کی بات کاٹ دی۔ اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''انصاری صاحب یہ ہاتھ آج سے آپ کے ہاتھ، یہ بازو آپ کے بازو ہیں۔ ہم

دِل و جان سے آپ کے ساتھ ہیں۔آپ سے آگے نہ بڑھ سکے، پیچھے بھی نہیں رہیں گے۔آپ کو کہیں بھی، کبھی بھی ہمیں پکارنا، تلاش کرنا نہیں پڑے گا۔جہاں آپ کا پسینہ گرا وہاں ہمارا خون گرے گا''۔

مشتاق کے ہاتھ پر صابر کی گرفت مضبوط ہوگئی۔ان سب کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔رات وہ دیر تک اکٹھے رہے۔کچھ اور دوستوں سے بھی ملاقاتیں ہوئیں۔دوسرے دن وہ صابر کو کالج میں لے گئے جہاں کافی لڑکوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔وہ گھنٹہ بھر ہی وہاں رک سکا اور پھر چل دیا۔مشتاق اور زرین کے علاوہ اڈے پر آٹھ دس لڑکے اسے الوداع کرنے کے لیے موجود تھے۔

''اتنی توقع تو نہ تھی''۔صابر نے انہیں دیکھ کر سوچا۔

بس کے نکلنے میں ابھی دیر تھی اس لیے وہ قریبی چائے خانے میں داخل ہو گئے۔منگلا ڈیم کے حوالے سے لڑکوں میں خاصی تشویش پائی جاتی تھی اس لیے وہ صابر سے سوال پہ سوال کر رہے تھے اور صابر انہیں صورتحال سے آگاہ کر رہا تھا۔تھوڑی ہی دیر بعد وہ اڈے پر باری باری سب سے معانقہ کر رہا تھا۔لوگ اسے غور سے دیکھ رہے تھے کہ کون آدمی ہے جسے اتنے لڑکے الوداع کرنے آئے ہیں۔تھوڑی ہی دیر میں بس شہر سے باہر نکل چکی تھی۔صبح صبح کا وقت تھا اور لوگ کھیتوں میں بیلوں کو ہانک رہے تھے۔مال مویشی ہرے بھرے میدانوں میں چر رہے تھے۔اکا دکا لوگ ہاتھ میں لاٹھی سر پہ قراقلی ٹوپی رکھے شہر کی سمت جا رہے تھے۔سیکنڈ سیٹ پہ کھڑکی کی طرف بیٹھا وہ پیچھے کی طرف بھاگتے ہوئے درختوں اور خوبصورت مناظر کو دیکھ رہا تھا۔سڑک اتنی تنگ تھی کہ دوسری گاڑی کا گزرنا مشکل تھا۔سامنے سے اگر گاڑی آجاتی تو ایک کو دور کھلی جگہ تک پیچھے جانا پڑتا۔بس بیس کلومیٹر کی رفتار سے ہچکولے کھا رہی تھی۔اور اس کا دماغ کئی سو کلومیٹر کی رفتار سے گھوم رہا تھا۔

''آج جب انسان چاند پر قدم رکھ چکا ہم ڈھنگ کے راستے بھی نہ بنا سکے۔کیا ہمیں آج کی ترقی یافتہ دنیا میں جینے کا حق ہے؟ ہم نہ صرف اس زمین پر بلکہ اپنے آپ پر بھی بوجھ ہیں''۔

پانچ لڑکے کندھوں پر بھاری تھیلے اٹھائے سڑک کے کنارے کھڑے تھے۔اُس نے

پاس بیٹھے آدمی سے پوچھا ''ان لڑکوں نے کیا اٹھا رکھا ہے''؟

''انہوں نے مکئی اٹھا رکھی ہے اور پسوانے کے لیے جندر پہ لے جارہے ہیں''۔قریب بیٹھے آدمی نے جواب دیا۔

''جندر یہاں سے کتنی دور ہے''؟ صابر نے دوسرا سوال کیا۔

''یہی کوئی دو میل ہوگا''۔اسے جواب ملا۔

''یہ لوگ کب تک واپس آجائیں گے''؟

''اگر جلدی باری مل گئی تو ادھر ہی رکیں گے اور شام تک آٹا لے کر واپس آئیں گے ورنہ دانے چھوڑ آئیں گے شاید کل جانا پڑے''۔

ایک لڑکا دو بھینسوں ایک گائے اور آٹھ دس بھیڑوں کو لیے جارہا تھا۔بس کے قریب آنے پر گائے ڈر کر بھاگ گئی اور لڑکا غصے سے بس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

وہ باہر کے مناظر میں کھویا ہوا تھا کہ ٹیپ ریکارڈر بج اٹھا۔

''چِٹھی میرے ڈھول نُوں پہنچانویں وے کبُوترا اوے کبُوترا......''۔

شام سات بجے جب وہ پنڈی پہنچا تو سیدھا ہوٹل پہ گیا اور کمرہ لے کر چارپائی پر ڈھیر ہوگیا۔آٹھ گھنٹے کے سفر نے اسے ادھ موا کر دیا تھا اور مزید سفر اس کے لیے ناممکن تھا۔

''سفر کیسا رہا''؟

میر پور پہنچنے پر دوستوں نے اس سے پوچھا۔

''سفر کی نہ پوچھو یار۔جسم کا انگ انگ درد کر رہا ہے''۔

''چلو خیریت سے واپس پہنچ گئے یہ بھی بڑی بات ہے۔یہ بتاؤ دورہ کیسا رہا''؟

''بھئی دورہ تو بہت اچھا رہا، میں تو ان لوگوں سے بہت پرامید ہوں''۔

صابر نے اپنے دورے کی تفصیلات سنائیں تو سب کو بہت اطمینان ہوا۔اگلے دو ماہ تک وہ مسلسل رابطے کرتے رہے۔رفیق بلّی ان کا ایک قریبی ساتھی تھا اور سیالکوٹ میں رہتا تھا۔بنیادی طور پر وہ جموں کا رہنے والا تھا اور ریاست کی آزادی کے حوالے سے متحرک بھی تھا۔صابر سیالکوٹ گیا اور اسے ساتھ لے کر لاہور میں نصیر وانی سے بھی ملا۔نصیر وانی سری نگر کا رہنے والا

تھا۔ بہر حال جہاں کہیں بھی ان لوگوں کا کوئی تعلق والا تھا اس سے رابطہ کیا اور انہیں یونین کے لیے کام کرنے پر راضی کیا۔ ان لوگوں کے رابطے رنگ لائے اور پورے آزاد کشمیر میں اسٹوڈنٹس یونین طلبہ کی پہلی نمائندہ جماعت بن کر سامنے آئی۔ یہ ایک متحرک تنظیم تھی اس نے طلبہ کے حقوق کے لیے جدوجہد کی۔

مظفرآباد کالج میں اسٹوڈنٹس یونین کے انتخابات ہوئے۔ یہ پہلا موقع تھا جب طلبہ کی باضابطہ نمائندگی کے لیے ایک تنظیم کو چنا گیا تھا۔ تمام طلبہ بہت خوش اور پرجوش تھے۔ انہوں نے حلف برداری کے لیے اس وقت کے صدرِ آزاد کشمیر کے ایچ خورشید صاحب کو مدعو کر رکھا تھا۔ لیکن اسی دوران ایوب خان نے کے ایچ خورشید کو صدارت سے ہٹا کر آزاد کشمیر ہائی کورٹ کے چیف جسٹس خان حمید خان کو صدر نامزد کر دیا تھا۔ خان حمید حلف برداری والے دن کالج میں جا موجود ہوئے لیکن طلبہ نے ان سے حلف لینے سے انکار کر دیا۔ ان کا موقف یہ تھا کہ خان حمید ایک غیر منتخب صدر ہیں اس لیے انہیں طلبہ کے منتخب نمائندوں سے حلف لینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ طلبہ نے شدید احتجاج کیا اور نعرے بازی شروع کر دی۔ انتظامیہ اور طلبہ کے درمیان کافی تلخ کلامی ہوئی، جس پر پولیس نے بھی اپنی کارروائی شروع کر دی۔ طلبہ مزید مشتعل ہوئے اور حالات بہت خراب ہو گئے۔ پورا کالج نعروں سے گونج اٹھا اور صدر کو وہاں سے نکلنا مشکل ہو گیا۔ بہرحال کالج انتظامیہ نے بڑی مشکل سے معاملات کو کنٹرول کیا اور خان حمید واپس لوٹ گئے۔ اس کے بعد خان حمید جہاں بھی جاتے طلبہ ان کے خلاف مظاہرے اور ہڑتالیں کرتے۔

خان حمید کے خلاف اس احتجاج کے بعد آزاد کشمیر میں طلبہ کے اندر سیاسی شعور بیدار ہوا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ اگر وہ اپنی تنظیم کو زیادہ بہتر طور پر منظّم کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو آزاد کشمیر میں ہونے والی مفاداتی سیاست کے گھناؤنے کھیل کو ننگا کرنے کے ساتھ ساتھ ریاست کی آزادی کے لیے کام کر سکتے ہیں۔ یہ سوچ رفتہ رفتہ ایک بحث کی شکل اختیار کر گئی اور بالآخر یہ فیصلہ ہوا کہ سٹوڈنٹس یونین کا مرکزی کنونشن کروایا جائے۔ اس سلسلے میں بنیادی لوگوں کی میٹنگز ہوتی رہیں اور باقی اضلاع میں لوگوں سے رابطے کے بعد ۲۱، ۲۲ ستمبر ۱۹۶۶ء کو مرکزی کنونشن کا اعلان کر دیا گیا۔ یہ تمام لوگ، خصوصاً جو اس کی بنیاد بنے اور زیادہ متحرک رہے دراصل

خود مختار کشمیر کے حامی لوگ تھے۔اس وقت محاذ رائے شماری بن چکی تھی جس نے اپنا واضح سیاسی پروگرام دے رکھا تھا۔سیاسی حلقوں کی رائے یہ تھی کہ سٹوڈنٹس میں تنظیم سازی محاذ نے کروائی ہے ۔لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔یہ لوگ محاذ کے نظریات سے متاثر ضرور تھے۔لیکن ان کی تنظیم سازی میں محاذ کا کوئی عمل دخل نہ تھا۔اس تنظیم کے بانی لوگوں کی خواہش تھی کہ تنظیم کا نام نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن ہونا چاہیے۔لیکن وہ ایک عرصے سے یہ فیصلہ نہیں کر پار ہے تھے۔اس کی وجہ یہ تھی کہ یونین میں سبھی طلبہ شامل تھے۔نام تبدیل کرنے اور واضح طور پر خود مختار کشمیر کی جدوجہد کو منشور کا حصہ بنانے سے انہیں خدشہ تھا کہ تنظیم تقسیم ہو جائے گی۔

''ہم کب تک کیپسول میں تریاق لپیٹ کر بیچتے رہیں گے؟'' ریاض کے اندر کا انقلابی اسے مضطرب کیے ہوئے تھا۔

''جب تک مریض کو صحت ملتی''۔جاوید نظامی نے جواب دیا۔

''بعض مریضوں کے نصیب میں صحت نہیں ہوتی' ریاض بولا' ان کے لیے اپنا پینڈہ کھوٹا نہیں کرنا چاہیے''۔

''ان کو پیچھے چھوڑ دیں گے تو یہ غلط حکیموں کے ہتھے چڑھ جائیں گے' جاوید نے کہا' بلکہ سانڈ کا تیل بیچنے والے مداری انہیں لے اڑیں گے''۔

''چار پانچ سال تو ہو گئے ہیں۔آخر ہمارا کوئی ہدف بھی تو ہونا چاہیے۔تمام بیماریوں کا خاتمہ ہو جائے یا سارے مریض صحت یاب ہو جائیں یہ تو ممکن نہیں''۔ریاض کسی صورت پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو، ہمارا ہدف اکثریت ہے، جب حاصل ہو جائے''۔جاوید نے جواب دیا۔

''تم کیا سمجھتے ہو اکثریت کو ابھی تک ہماری سمجھ نہیں آئی''؟

''سمجھ آنا اور بات ہے' جاوید دلیل پہ دلیل دیے جا رہا تھا' منزل اور راستے کے واضح تعین کے بعد ساتھ چلنا اور بات''۔

''تو پھر تمہارا کیا اندازہ ہے ہمیں کب تک یہ تعین کر لینا چاہیے''؟ ریاض نے سوال کیا۔

''یہ تنظیم کا پہلا مرکزی کنونشن ہے۔منتخب ہونے والے لوگ ہی اس بارے میں فیصلہ کریں تو بہتر رہے گا'۔ جاوید نے جواب دیا۔' بہر حال باقی دوستوں کی رائے بھی سامنے آنی چاہیے''۔

''تم دونوں کی تشویش اور دلائل بالکل درست ہیں۔کسی سے بھی اختلاف کی گنجائش نظر نہیں آتی۔لیکن ایک بات تو طے ہے کہ سارے لوگ کبھی بھی ہمسفر نہیں بن سکتے۔جو سمت ہم نے طے کر رکھی ہے اور جو منزل ہمارے ذہن میں ہے اس کا واضح اعلان تو جلد یا بدیر کرنا ہی پڑے گا۔سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ اعلان کب کیا جائے۔ظاہر ہے کسی مناسب وقت اور موقع پر۔وہ مناسب وقت اور موقع ہمیں کب دستیاب ہوگا۔یہ ایک پیچیدہ سوال ہے۔ہم بہر حال ایک عرصے سے اس موقع کی تلاش میں ہیں۔شاید یہ ایک موقع ہے''! صابر نے اپنی بات مکمل کرنے کے بعد نذیر انجم کی طرف دیکھا۔

''دوستو بات یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء کی تقسیم نے ہمارا بیڑا غرق کر دیا۔دھرتی کی تقسیم اصل مسئلہ نہیں ہے المیہ تو یہ ہوا کہ ہمارے لوگ تقسیم ہو گئے۔ہماری فکر کو غلامی کا گھن لگ گیا۔ہم اس قدر خوفناک ذہنی غلامی کی دلدل میں پھنس چکے ہیں کہ ہمیں اپنی جدوجہد کے مقاصد کو سب پر ظاہر کرنے سے بھی ڈر لگتا ہے۔کہیں بدک کر بھاگ ہی نہ جائیں'۔نذیر انجم نے ایک قہقہہ لگایا اور بات آگے بڑھائی۔'اب دیکھو نا ذہنی اور فکری انتشار کی کوئی حد بھی ہوتی ہے۔ہم نے تمام حدیں پھلانگ دیں۔اپنے مستقبل کے حوالے سے جتنے ہم کنفیوز ہیں، دنیا کی کوئی دوسری قوم شاید ہی کبھی اس قدر کنفیوز رہی ہو۔اتنی ذہنی وفکری بدحالی اور بانجھ پن کا شکار رہی ہو'۔اس نے ایک اور قہقہہ لگایا۔'چیونٹی اپنا گھر بنا کر رہتی ہے، پرندے گھونسلے بناتے ہیں، شیر اپنی غار میں رہتا ہے، گیدڑ اپنی کھچار میں۔ بچے مٹی کے گھروندے بناتے ہیں۔ ہمارے پاس اپنے گھر کا کوئی خواب، کوئی خیال ہی نہیں۔ایک پاگل سے بھی پوچھو کہ کل تم نے کیا کرنا ہے، بتا دے گا۔کل بھی پتھر ماروں گا۔ایک ہمیں ہی نہیں پتہ کیا کرنا ہے۔جو کہتے ہیں ہم نے منزل کا تعین کر لیا ہے دراصل وہ بھیڑیوں کے جنگل میں پناہ لینا چاہتے ہیں اور جو ان کی پیروی کر رہے ہیں وہ بخار میں بڑبڑا رہے ہیں۔انہیں جب ہوش آئے گا، نسلیں بِک چکی ہوں گی۔پہلے ہی ہمارا بہت وقت

ضائع ہو چکا ہے۔ ۱۸ر۲۰ سال گزرنے کے بعد ہم اکٹھے ہوئے ہیں۔ یہی موقع مناسب ہے ۔ایک بات یاد رکھو ہمیں ان کے پیچھے نہیں چلنا۔ آگے چلنا ہے، اس لیے کہ ہمارے ہاتھ میں روشنی ہے۔ اس لیے نہیں کہ ہم اکثریتی برادری والے ہیں۔ جنہیں خبر ہی نہیں کہاں کھڑے ہیں وہ بچارے کیا فیصلہ کریں گے۔ ان کے رحم و کرم پر نہیں رہا جا سکتا۔ چار پانچ سال بڑی مدت ہے بات سمجھنے کے لیے۔ جو نہیں سمجھ سکے وہ زندگی بھر نہیں سمجھ سکتے۔ ان کے لیے اپنا وقت برباد نہ کرو"۔

اس طرح کی بحثیں چلتی رہیں حتیٰ کہ کنونشن سر پہ آ گیا۔ عارف کمال کو سب نے مل کر تنظیم کا منشور اور آئین لکھنے کے لیے بٹھا دیا۔ باقی لوگوں نے بھی مشورے دیے جن میں امان اللہ خان بھی شامل تھا۔ لیکن کام عارف کمال نے ہی کیا۔ کنونشن میں آزاد کشمیر کے سابق صدور کو بلایا گیا۔ سردار ابراہیم، سردار قیوم، سید علی احمد شاہ، کے ایچ خورشید شامل ہوئے۔ کنونشن کالج گراؤنڈ میں ہوا۔ تنظیم کے نام کے بارے میں تا حال کوئی پیش رفت نہ ہوئی تھی۔ صابر نے تمام خدشات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے رفیق بلی سے تفصیلاً بات کی تو وہ نئے نام کی تجویز پیش کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ رفیق بلی نے تنظیم کے لیے نئے نام کی تجویز پیش کر دی جس پر کسی کو اعتراض نہ ہوا۔ یوں ۲۲ ستمبر ۱۹۶۶ء کو اسٹوڈنٹس یونین "جموں کشمیر نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن" بن گئی اور اسی نام سے پکاری اور پہچانی جانے لگی۔

نام کا مسئلہ تو حل ہو گیا لیکن قیادت کا مسئلہ اٹک گیا۔ اتفاق ملاحظہ کیجیے کہ میرپور کے طلبہ جنہوں نے یونین کو کھڑا کیا اور پورے آزاد کشمیر میں منظّم کیا، قیادت کے معاملات طے کرنے میں انہیں سب سے زیادہ مشکل پیش آئی۔ اس میں کسی حد تک ہمارے معاشرے میں رچے بسے مختلف قسم کے تعصّبات کا عمل دخل بھی تھا اور کچھ تحفظات بھی راہ کی رکاوٹ تھے۔ عارف کمال کی رائے سب سے مختلف تھی۔ اس نے سارے متحرک دوستوں کو جمع کیا اور کہا۔

"بھئی دیکھو سوشلسٹ پارٹیوں میں سیکریٹری جنرل صدر سے زیادہ اہم آدمی ہوتا ہے اس لیے کہ اس کے پاس اختیارات زیادہ ہوتے ہیں۔ میں آپ کو یہی مشورہ دوں گا کہ صدارت باہر دے دیں اور سیکریٹری جنرل میرپور سے لیں۔ میں باہر کے دوستوں پر ہرگز بدگمان نہیں ہوں لیکن چونکہ آپ لوگ اس تنظیم کی کور ٹیم ہو، تمام معاملات کو اچھی طرح سمجھتے ہو اور پھر یہ کہ

میر پور میں دوسرے اضلاع کی بہ نسبت زیادہ مضبوط بھی ہو۔اس لیے مشکل حالات میں تنظیم کو سنبھال سکتے ہو''۔

''میر پور سے کس کو لیا جائے''؟ رفیق بلّی نے پوچھا۔

''جس کے حق میں زیادہ دوست رائے دے دیں''۔ عارف نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے تو پھر صدارت کا معاملہ بھی طے کرلیں''؟ رفیق بلّی نے کہا۔

اس پر کافی دیر غور وخوض ہوتا رہا۔ زیادہ تر لوگوں کی رائے تھی کہ صدر پونچھ سے لیا جائے۔ لیکن کوئی نام فائنل نہیں ہو رہا تھا۔

''بھئی اگر صدر پونچھ سے ہی لینا ہے تو راٹھور کو لے لو''۔ صابر نے رائے دی۔

سب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے اور ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ تھوڑی دیر تک مکمل خاموشی چھائی رہی۔ پن ڈراپ سائلنس۔

''لیکن اس نے تو تنظیم کے لیے ایک دن بھی کام نہیں کیا''۔ جاوید نے کہا۔

''اب کرلے گا نا بھئی''۔ صابر نے جواب دیا۔

آخر کار ممتاز راٹھور کو صدر نامزد کر دیا گیا۔ راٹھور چونکہ اس وقت تک متحرک تھا نہ ہی سیاست سے اسے دلچسپی تھی اور اس کے ساتھ سب سے ہی اس کے تعلقات تھے۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ مقامی بھی نہ تھا، ریموٹ ایریا سے تھا لہٰذا کوئی مفادات کا ٹکراؤ (Interest clash) بھی نہ تھا۔ اس لیے سب نے بلا چوں چرا مان لیا۔ ریاض انقلابی راٹھور کے ساتھ جنرل سیکریٹری آ گیا اور نذیر تبسم کو پریس سیکریٹری بنا دیا گیا۔ یہ معاملات طے ہونے کے بعد حلف برداری کی تقریب ہوئی اور بعد ازاں جلسہ ہوا۔



عارف کمال کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے ریاض کو نہ چاہتے ہوئے بھی سٹڈی سرکل کے لیے جانا پڑا۔ لڑکوں کی تعداد اور دلچسپی کو دیکھ کر اسے بہت خوشی ہوئی۔ چائے پینے کے بعد اس نے گفتگو شروع کر لی۔

''دوستو سب سے پہلے تو میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھے یہاں پر آنے اور بات کرنے کا موقع دیا۔ یہ میرے لیے اعزاز کی بات ہے، خوشی اور اطمینان کا باعث بھی۔ دوستو ہمارا تعلق ایک غلام قوم اور غلام معاشرے سے ہے۔ ہماری جدوجہد اسی غلامی کے خلاف ہے۔ ایک طرف ہماری قومی آزادی کا سوال ہے جس میں ہم اکیلے ہیں جبکہ ہمارے مدمقابل دو بڑی طاقتیں ہیں جو ہمارے ملک اور وسائل پر قابض ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم ایک غلام معاشرے کا فرد ہونے کے ناطے سماجی ناانصافی، ظلم، جبر، جہالت، فرسودگی اور معاشی استحصال کا بھی شکار ہیں۔ اور اس میں ہم اکیلے نہیں بلکہ ساری دنیا کے غریب، مجبور و مقہور انسان بھی ہمارے ساتھ پس رہے ہیں۔ اس اعتبار سے ہمارے مدمقابل سرمایہ دارانہ نظام ہے۔ پوری دنیا میں جتنی بھی غربت، جہالت اور ظلم ہے اس کا سبب سرمایہ دارانہ نظام ہے۔ مارکس نے اس نظام کے بارے میں انتہائی مختصر الفاظ میں بہت جامع اور خوبصورت بات کہی تھی۔ اس نے کہا تھا:

''سرمایہ داری انسان کی نَس نَس کو خون میں نہلا کر وجود میں آئی ہے''۔

اور جب سے یہ وجود میں آئی ہے نسل در نسل انسان کو خون میں نہلاتی چلی آ رہی ہے۔ یہ ایک ایسا نظام ہے جس میں ایک طبقہ جو کل آبادی کے ایک آدھ فیصد پر مشتمل ہوتا ہے وسائل پر مکمل کنٹرول حاصل کر کے ۹۹ فیصد لوگوں کو اپنا زیرِ نگیں بنا لیتا ہے اور ان کی محنت سے اپنی دولت میں مسلسل اضافہ کرتا رہتا ہے۔ اس میں وسائل یا دولت کی تقسیم اس درجہ غیر منصفانہ و غیر انسانی ہوتی ہے کہ ایک طرف دولت کے انبار لگے رہتے ہیں جبکہ دوسری طرف انسان زندگی کی

بنیادی سہولتوں سے محروم رہتا ہے۔ ہماری جدو جہد کے دو محاذ ہیں ایک قومی آزادی کا محاذ ہے اور دوسرا ایک ایسے معاشرے کے قیام کا محاذ ہے جس میں عدل ہو، انصاف ہو، آزادی ہو، گھر، علاج، تعلیم، سب کے لیے مفت ہو، روزگار اور ترقی کے مواقع سب کے لیے برابر ہوں۔ یہ معاشرہ ہر طرح کے استحصال، نسلی، مذہبی، صنفی، علاقائی، لسانی عصبیتوں اور تفریق سے پاک ہو۔

ہماری جدو جہد کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم جس ماحول اور نظام میں رہتے ہیں اس سے اچھی طرح واقف ہوں۔اس کی طاقت، کمزوریوں سے آگاہ ہوں اور اس کے طریقہ واردات (mechanism) کو اچھی طرح سمجھتے ہوں۔ سرمایہ دارانہ نظام یا معاشیات کے اپنے اصول ہیں جن کا بنیادی مقصد دولت کا ارتکاز ہے۔ سرمایہ دارانہ معاشیات کو کلاسیکل اکنامکس کا نام دیا گیا ہے۔ نامور کلاسیکل معاشیات دانوں میں آدم سمتھ (۱۷۲۳۔۱۷۹۰ء سکاٹ لینڈ)، تھامس مالتھس (۱۷۶۶ء۔۱۸۳۴ء برطانیہ)، ڈیوڈ ریکارڈو (۱۷۷۲ء۔۱۸۲۳ء برطانیہ) جان اسٹیوارٹ (۱۸۰۶۔۱۸۷۳ء لندن) وغیرہ شامل ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام کے مقابلے میں معاشی نظام دینے والوں میں کارل مارکس (۱۸۱۸ء۔۱۸۸۳ء جرمنی)، فریڈرک اینگلز (۱۸۲۰ء۔۱۸۹۵ء جرمنی) اور ان کے جانشین شامل ہیں۔ یوں دورِ جدید میں معاشیات کے دو بڑے طبقہ ہائے فکر کلاسیکل اکنامکس اور مارکسی اکنامکس کے ناموں سے معرضِ وجود میں آئے جو دونوں ایک دوسرے کی ضد تھے۔ مارکس کلاسیکل معاشیات کو Vulgar political economics کا نام دیتا ہے۔ اس نے سرمایہ دارانہ نظام پر کڑی اور مدلل تنقید کی اور ''داس کیپٹل'' کے نام سے ایک شہرہ آفاق کتاب لکھی جس نے مارکسی معاشیات یا سوشلزم کی بنیادی دستاویز کی حیثیت حاصل کی۔ ''داس کیپٹل'' اور ''کیمونسٹ مینی فیسٹو'' نے ایک انقلاب برپا کیا جس سے تقریباً پوری دنیا متاثر ہوئی۔ مارکس اور اس کے جانشینوں کے سماجی نظریات سے اختلاف اپنی جگہ لیکن مارکس کے معاشی نظریات کا مطالعہ کیے بغیر طبقاتی جدو جہد اور اس کے تقاضوں کو سمجھنا ناممکن ہے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ خود مارکس کو سمجھنا بھی کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس لیے ہم اس بکھیڑے میں پڑنے کی بجائے عام فہم انداز میں سرمایہ دارانہ نظام اور اس کی چیرہ دستیوں کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے معروضات کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے

مشاہدات کے ذریعے اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں اس ضمن میں اپنے مشاہدات آپ کے سامنے رکھوں گا تاکہ ہم سرمایہ دارانہ، اشتراکی و اشتمالی معاشیات یا معیشت کی خصوصیات کو اپنے زمینی حقائق کے ساتھ جوڑ کر دیکھ اور سمجھ سکیں۔ تو دوستو ہمیں تھوڑا سا پیچھے جا کر بات شروع کرنا پڑے گی۔ آپ کو تھوڑی دیر کے لیے میرے بچپن میں میرے ساتھ چلنا ہوگا، یقیناً یہ مجھ اکیلے کی کہانی نہیں ہے۔ تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ہم سب ایک ہی طرح کے ماحول میں پروان چڑھے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ ہم سب کی کہانی ہے۔

ہمارے بوڑھے کچے گھر کے ساتھ ''منّوں'' کے دو بہت بڑے بزرگ درخت تھے۔ شاید عمر میں پورے علاقے کے تمام درختوں سے بڑے تھے۔ موٹے بھی بہت زیادہ تھے اور اونچے اِتنے کہ اُن کی چوٹی تک نظر نہیں پہنچتی تھی۔ یہ پھلدار درخت نہیں تھے، ان کی لکڑی جلانے یا تعمیر کے کام آتی تھی۔ بیج آنے کے دنوں میں یہ بیجوں سے لد جاتے تھے۔ یہ دن ہمارے لیے دلچسپی کا باعث ہوتے۔ طوطوں کے غول کے غول اُڑ اُڑ کر آتے اور بیج کھا کھا کر ہماری نقلیں اتارتے۔ سکول کی کتابوں میں ہم نے صرف سبز رنگ کے طوطے ہی دیکھے تھے لیکن یہ طوطے قوسِ قزح کے سارے رنگوں کو چُرا لائے تھے۔ ہماری شدید خواہش اور کوشش رہتی کہ ان میں سے ایک آدھ ہمارے ہاتھ آ جائے مگر وہ ہمارے ہاتھ نہ آتے۔ ہم پہروں بیٹھ کر قدرت کے ان حسین رنگوں کو اُڑتے پھرتے دیکھتے۔ یہ ایسا خوبصورت تجربہ تھا جس کی ہمیں بعد کی زندگی میں کوئی مثال نہیں ملی۔ بیج ختم ہوتے ہی وہ ٹیں ٹیں کر کے ہماری معصوم خواہش کا منہ چِڑاتے ہوئے اُڑ جاتے۔ جو بیج اُن کی دسترس سے بچ جاتے اور یقیناً اُن کی تعداد لاکھوں میں ہوئی ہوگی، وہ رِزقِ خاک ہو جاتے۔ یہ تو ہمیں تب پتہ چلا جب ایک دوپہر کو دیکھا کہ دادی ایک کھیت میں بیٹھے بیٹھے درانتی سے زمین پر ''چوکّے'' مار رہی ہے۔

''دادی یہ کیا کر رہی ہیں آپ''؟ ہم نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

دادی نے سر اوپر اٹھایا تو اُس کا چہرہ پسینے سے شرابُور تھا۔ وہ اُٹھ کر کھڑی ہوگئی پر اس کی کمر سیدھی نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے اپنا بایاں بازو کمر پر رکھا اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ہمارے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

''جا پترا جا کر میرے لیے پانی لے آ''۔ دادی نے اپنے دوپٹے سے بنائی ہوئی پگڑی کھولی اور چہرے کا پسینہ پُونچھتے ہوئے کہا۔

ہم تینوں بہن بھائی دوڑتے ہوئے پانی لانے چلے گئے اور اپنا سوال بھول گئے۔ پھر ہم نے دیکھا کہ یہ دادی کا معمول تھا جب دن چڑھے وہ مال مویشیوں کو واپس لا کر باندھ دیتی تو درانتی لے کر اِس کھیت میں گُھس جاتی۔

''دادی آپ یہ کیا کر رہی ہیں''؟ ہمارا تجسّس ایک مرتبہ پھر عود آیا۔

''یہ چھوٹے چھوٹے پودے دیکھ رہے ہو''؟ دادی نے ہم سے پوچھا۔

ہم نے جھک کر دیکھا، یہ ننھے ننھے سے پودے تھے۔ بالکل انسان کے، بکری یا خرگوش کے بچوں جیسے خوبصورت۔

''یہ کس کے پودے ہیں دادی''۔ ہم نے سوال کیا۔

''یہ شُوں کے پودے ہیں''۔ دادی نے جواب دیا۔

پھر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے یہ ننھے ننھے پودے بڑے ہو گئے۔ دوسرے سال پھاگن چیت کی دھواں دھار بارشوں میں دادی نے یہ پودے اکھاڑ کر نوکر کو دیے اور اس نے مختلف جگھوں پر انہیں لگا دیا۔ دادی نے یہ پودے پورے خاندان، عزیز رشتے داروں اور پاس پڑوس میں بانٹ دیے۔ لیکن ابھی بھی بہت سارے پودے باقی تھے کہ دو سال بعد دادی پھر اُسی کام میں جُت گئی۔ گویا یہ دادی کا مستقل کام بن گیا۔ ہمارے پاس کے گاؤں سے ایک بڑھئی شہر جا کر کام کرتا تھا۔ وہ قصائی گلی کی ایک دکان پر بیٹھ کر کلھاڑیوں، بیلچوں، پیلوں، درانتیوں کے دستے، ہل، جندرے، کھُنڈ اور لاٹھیاں وغیرہ بناتا اور شام کو اپنی مزدوری لے کر گھر چلا جاتا۔ وہ بھی ہمارے ہاں سے پودے لے کر گیا تھا۔ ایک دن اس نے دادی سے کہا۔

''بَیوے یہ جو آپ کے برآمدے میں لکڑی کا ایک تختہ پڑا ہوا ہے اس کا کیا کریں گی''؟

''کچھ بھی نہیں کرنا ہے اگر تمہیں ضرورت ہے تو لے جاؤ''۔ دادی نے جواب دیا۔

''نہیں بَیوے مجھے ضرورت نہیں ہے، میں سوچ رہا ہوں اگر کسی خاص کام کے لیے نہ رکھے ہوں تو میں آپ کو اس سے ایک آدھ کرسی بنا دوں''۔ صدیق نے جواب دیا۔

'' کیا کروں گی کرسیوں کو صدیق چار پانچ ''پاسار'' میں پڑی ہوئی ہیں اور ایک برآمدے میں رکھی ہے۔ میرے مہمان تو چارپائی پر ہی بیٹھ جاتے ہیں''۔ دادی نے کہا۔ ''رزاق ہر جمعرات کو آتا ہے اس کے لیے بھی الگ کرسی موجود ہے''۔

''ٹھیک ہے بَیوے لیکن یہ لکڑی پڑی پڑی خراب ہو جائے گی، کام میں آ جائے تو کیا حرج ہے''۔ صدیق نے کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن تمہارا وقت برباد ہوگا''۔ دادی نے کہا۔

''وقت ہی تو ہے ہمارے پاس بَیوے، ایک دوسرے کے کام نہ آیا تو کیا فائدہ''؟

اس نے ایک دن میں کرسی تیار کر دی۔ دراصل اس وقت کے لوگ ایک دوسرے کی بڑی قدر کرتے تھے اور جب تک کسی کا احسان اتار نہ دیں انہیں چین نہ آتا تھا۔ اس کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔ اس طرح اس نے دادی سے لیے ہوئے پودوں کی قیمت چکا دی۔

اس سال پہلے سے زیادہ مرد عورتیں ہمارے ہاں پودے لینے کے لیے آئے۔ ایک عورت نے دادی سے کہا۔

''بَیوے مجھے پودے چاہییں لیکن اب کی بار میں مفت میں نہ لے کہ جاؤں گی''۔

''تمہارا کیا مطلب ہے بھاگو''؟ دادی نے سوال کیا۔

''کبیر کے باپ نے مجھے سختی سے کہا ہے کہ مفت کی چیزیں ہتھیانے کی عادت چھوڑ دو۔ اس نے یہ پانچ روپے دیے ہیں کہ ان سے پانچ پودے لے آؤ''۔ بھاگو نے ایک ایک روپے کے پانچ نوٹ دادی کی طرف بڑھائے۔

دادی نے اسے پانچ پودے اکھاڑ کر دیے اور پیسے لینے سے انکار کر دیا جس پر وہ پودے چھوڑ کر جانے لگی۔ تب دادی نے اس سے روپے لے لیے اور اسے سات پودے دے دیے۔

یوں یہ سلسلہ چل نکلا اور دادی کو اپنی محنت کا معاوضہ ملنے لگا۔ کئی لوگ ایسے ہوتے تھے جو زبردستی پودوں کے بدلے کوئی نہ کوئی چیز دے جاتے۔ یہ چیزیں زیادہ تر زرعی اجناس ہوتی تھیں اور چونکہ ہمارے گھر میں موجود ہوتی تھیں اس لیے دادی وہ چیزیں بعد میں ضرورت مند لوگوں کو دے دیتیں۔ روپے پیسے بھی صدقہ کرتیں لیکن زیادہ تر پیسے بچے رہتے جن سے وہ

ضرورت کی مختلف چیزیں منگوالیتیں۔

اس وقت روپیہ پیسہ اتنا عام نہیں تھا۔لوگوں کی ضرورتیں محدود تھیں اور زیادہ تر مقامی سطح پر دستیاب بھی تھیں۔لوگ اپنی ضرورت سے زائد غلّہ، اون، لکڑی و دیگر چیزوں کا دوسرے لوگوں کے ساتھ ضرورت کی چیزوں سے تبادلہ کرلیا کرتے تھے۔اس کے ساتھ ساتھ روپے کے ذریعے بھی چیزوں کا لین دین چلتا رہتا تھا۔تبادلے کے اس طریقہ کار کو بارٹر سسٹم کہا جاتا ہے۔ اس نظام کا آغاز اُس وقت ہوا جب انسان نے جنگل چھوڑ کر بستیاں آباد کیں جس کے نتیجے میں بعدازاں بتدریج ریاست کا قیام بھی عمل میں آیا۔اب آپ خود اندازہ کیجیے کہ یہ کس قدر مستحکم نظام ہے جو ہزاروں سالوں سے رائج ہے۔چیزوں کے تبادلے کے وقت یہ معلوم کیا جاتا تھا کہ ایک چیز کی دوسری کے مقابلے میں کتنی قدر ہے۔مثلاً ایک من گندم کے بدلے میں کتنے کلو گُڑ یا کتنے گز کپڑا یا کتنے جوتے مل سکتے ہیں۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ چیزوں کی قدر معلوم کرنے کا طریقہ کار کیا تھا؟ بلکہ اس سے بھی پہلے یہ سوالات سر اٹھاتے ہیں کہ قدر کیا چیز ہے اور کسی چیز میں یہ قدر کیسے پیدا ہوتی ہے؟ جنس کیا ہے اور یہ کیسے بنتی ہے؟

جنس دو چیزوں سے مل کر بنتی ہے۔مادہ اور محنت۔یعنی جنس مادہ اور محنت کا مرکب ہے۔مادہ قدرت کا عطیہ ہے، یہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مفت مہیا کیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ انسان کو اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے جسم و جان بھی عطا کیا ہے۔انسان جب مادہ پر محنت کرتا ہے تو مادہ جنس کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔اب دیکھنا یہ ہے کہ مادہ میں کیا تبدیلی آئی کہ وہ جنس بن گئی۔مادہ میں انسانی محنت داخل ہوئی تو اس کے اندر ایک قدر پیدا ہوئی۔یہ قدر ہی ہے جو مادہ کو انسان کے استعمال کے قابل بناتی ہے یعنی جنس بناتی ہے۔یہاں پر فطرت کی خوبصورتی دیکھیے کہ قدرت کے عطا کردہ خزانے پر جب تک انسان محنت نہیں کرے گا وہ اس کے استعمال کے قابل نہیں ہوگی۔قدرت نے مادہ کو پیدا کیا، پھر انسان کو بھی وہ تمام ضروری لوازمات دے کر دنیا پر بھیجا جن کے استعمال سے وہ مادہ سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔منّوں کے ننھے پودے قدرت کا عطیہ تھے لیکن انسانی محنت کے نہ ہونے کی وجہ سے ایک مدّت سے ضائع ہو رہے تھے۔جب ان پر محنت ہوئی تو وہ جنس کی شکل اختیار کرکے انسان کے استعمال میں آنا شروع ہوگئے۔ایک

آدمی جس نے ہم سے ایک روپے میں پودا خریدا تھا ۱۰ سال بعد اُسے کاٹ کر ۵۰ روپے میں بیچ دیا۔ لکڑی ایک بڑھئی نے خریدی اور اسکا ایک بنچ بنا کر بیچ ۸۰ روپے میں بیچ دیا۔ عام آدمی کو بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ بنچ کی ۸۰ روپے کی قیمت میں خام مال یعنی لکڑی کی قیمت ۵۰ روپے جبکہ انسانی محنت کی قیمت ۳۰ روپے ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ لکڑی کی اپنی کوئی قیمت نہیں ہے۔ ۵۰ رُوپیہ جو بڑھئی نے لکڑی کا ادا کیا یہ اس لکڑی پر ہونے والی انسانی محنت تھی جس نے پودے میں ۵۰ روپے کی قدر پیدا کی۔ اب ہم اس سوال کی طرف آتے ہیں کہ قدر کی پیائش کا طریقہ کار یا پیمانہ کیا ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ قدر کا تعلق انسانی محنت سے ہے۔ مادہ پر جتنی محنت ہوگی اتنی ہی اس کی قدر ہوگی۔ جنس الف پر ایک گھنٹے کی محنت درکار ہے اور ب پر دو گھنٹے کی تو جب ان دونوں اجناس کا تبادلہ ہوگا تو چھ کلو الف کے بدلے میں تین کلو ب کی مقدار حاصل کی جا سکے گی۔

اب آیئے دیکھتے ہیں کہ بارٹر سسٹم سے موجودہ یعنی کرنسی کے دور میں ہم کیسے داخل ہوئے۔ اس سسٹم میں انسان کو یہ مسئلہ درپیش رہا کہ قدر کو کس اکائی سے ناپا جائے۔ اس غرض کے لیے مختلف دھاتوں کے معینہ وزن کے ٹکڑے استعمال کیے جانے لگے۔ اور ان کے ذریعے سے باقاعدہ تجارت کا عمل وجود میں آ گیا۔ خرید و فروخت کا یہ عمل جب بڑھا اور پھیلا اور بڑی قیمتوں کی اجناس کی تجارت ہونے لگی تو چاندی اور سونے کے سکے استعمال میں لائے گئے جو آج بھی استعمال میں ہیں لیکن ان کی شکل ذرا مختلف ہے۔ سونے چاندی کے سکّوں کو حکومتوں نے اپنے خزانے میں رکھ کر ان کے بدلے کاغذی نوٹ جاری کرنا شروع کر دیے جو دراصل سونے کے نمائندہ کے طور پر کام کرتے ہیں۔ آپ نے نوٹ پر یہ لکھا ہوا دیکھا ہوگا کہ

''حاملِ ہٰذا کو مطالبہ پر ادا کرے گا''۔

اس عبارت کا کیا مطلب ہے؟

یہ حکومت کی طرف سے ایک گارنٹی ہے کہ حکومت اس نوٹ کے مالک کو اس کے مطالبہ پر اس نوٹ کی اصل قدر ادا کرے گا۔ اور وہ اصل قدر سونا یا چاندی ہے۔ یوں ایک سو روپے کا نوٹ مارکیٹ میں ۱۰۰ روپے کے بقدر چاندی یا سونے کی نمائندگی کرتا ہے۔ یوں خریدنے اور بیچنے والا دونوں سونے یا چاندی کے عِوض چیزیں خرید یا بیچ رہے ہوتے ہیں۔ لیکن ان دونوں میں

سے کسی کو بھی اس حقیقت کا علم نہیں ہے۔ اگر لوگوں کو اس بات کا علم ہو جائے اور آدھے لوگ ہی اپنی دولت لے کر حکومت کے پاس چلے جائیں اور سونے کا مطالبہ کر لیں تو ساری سرمایہ دار دنیا کی حکومتیں دیوالیہ ہو جائیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تقریباً تمام سرمایہ دار ممالک کی مارکیٹوں میں جو کرنسی نوٹ گردش کر رہے ہوتے ہیں وہ ان ممالک کے اصل زر یعنی خزانے سے کئی گنا زیادہ ہوتے ہیں۔

اب آیئے دیکھتے ہیں کہ سرمایہ کسے کہتے ہیں۔ انسان جو روپیہ کاروبار میں لگاتا ہے تاکہ اس میں اضافہ ہو جائے وہ سرمایہ کہلاتا ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے ہم اپنی گذشتہ مثال کو آگے بڑھاتے ہیں۔ ہماری دادی کو پودوں کی فروخت سے جو رقم حاصل ہوتی تھی اس سے وہ ضرورت کی دوسری چیزیں خریدتی تھی۔ یعنی ایک جنس کو بیچ کر وہ دوسری جنس خریدتی تھی۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ پودوں کی فروخت کا مقصد پیسہ جمع کرنا یا اس میں اضافہ کرنا نہیں تھا بلکہ ضرورت کی دوسری اجناس کا حاصل کرنا تھا۔ یعنی روپیہ کچھ دیر کے لیے دادی کے پاس رکا اور پھر جنس میں تبدیل ہو گیا۔ اب اگر دادی اپنے پاس جمع شدہ ۳۰۰ روپے سے کچھ بھیڑیں خرید لے اور آٹھ ماہ رکھنے کے بعد انہیں ۴۰۰ روپے میں فروخت کر لے تو اس صورت میں روپیہ سرمائے کی شکل اختیار کر جائے گا۔ یہاں پر بظاہر آپ کو یہ نظر آ رہا ہے کہ کاروبار میں روپیہ لگانے سے اس میں اضافہ ہو گیا۔

کیا اس کا مطلب یہ ہوا کہ روپیہ میں خود کو بڑھانے یعنی نفع پیدا کرنے کی صفت موجود ہے؟

ہرگز نہیں۔

تو پھر اصل کہانی کیا ہے، آیئے اس معاملہ کا بغور مطالعہ کرتے ہیں تاکہ بات سمجھ میں آ سکے۔ بھیڑیں فروخت کرنے والے نے انہیں فروخت کیا اور حاصل ہونے والی رقم سے اپنے خاندان کے لیے کپڑے وغیرہ خریدے۔ دادی نے انہیں خرید کر اپنے ہاں رکھ لیا گرمیوں کے موسم میں وہ مویشیوں وغیرہ کے ساتھ کھلی فضا میں چرتی پھرتی رہیں جس کی وجہ سے ان کے وزن میں اضافہ بھی ہو گیا اور دادی کو کچھ اون بھی ہاتھ آ گئی۔ دادی نے اس اون کو کات کر دھاگا بنا

لیا جسے گھر میں پہلے سے جمع شدہ دھاگے کے ساتھ ملا کر لوئیاں بنانے کے لیے کھوٹہ بھیج دیا۔ جونہی سردیوں کا موسم آیا دادی کے لیے انہیں سنبھالنا چونکہ مشکل تھا اس لیے اُس نے انہیں بیچ دیا۔ وہ بھیڑیں منافع میں بکیں اس لیے کہ آٹھ ماہ میں وہ کھا پی کر خاصی موٹی ہو گئی تھیں اور ان کا وزن بڑھ گیا تھا۔ یعنی ان کی قدر میں اضافہ ہو گیا تھا۔ وافر گھاس آزاد فضا اور دادی کی چھ ماہ کی محنت نے ان کی قدر میں اضافہ کیا۔ گھاس چونکہ قدرت کا عطیہ ہے، اصل چیز دادی کی بھیڑوں اور گھاس کی رکھوالی، اور گھاس کا صحیح استعمال ہے۔ یعنی انسانی محنت۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہی قدرِ زاید منافع کی شکل میں دادی کو ملا۔ اس ساری بات کا حاصل یہ ہے کہ قدرت کی عطا کردہ چیز میں قدر بھی انسانی محنت سے پیدا ہوتی ہے اور قدرِ زاید بھی انسانی محنت ہی کی مرہونِ منّت ہے۔ سو مارکس کا یہ کہنا کہ سرمایہ دار کا منافع مزدور کی پیدا کردہ قدرِ زاید ہی کا دوسرا نام ہے سو فیصد درست ہے۔ اس میں کسی قسم کا ابہام نہیں ہے۔ ہماری دادی نے جو محنت کی اور قدرِ زائد پیدا کی وہ پوری کی پوری خود وصول کی اس لیے کہ وہ خود اپنے لیے کام کرتی تھی، کسی کی مزدور نہ تھی۔ اگر یہی ہماری دادی کسی کی بھیڑوں کی رکھوالی کر رہی ہوتی تو بتائیے اسے پورا منافع ملتا، پورا چھوڑیے، آدھا یا ایک تہائی بھی ملتا؟ ہرگز نہیں اسے اس منافع کا مشکل سے چار چھ فیصد ہی مل پاتا۔

اسی طرح بھیڑ کی اون اتارنے سے اون میں ایک قدر پیدا ہوئی، یعنی وہ ایک جنس بنی۔ پھر دادی نے دن رات ایک کر کے اس اون کو کات کر دھاگا بنایا۔ یہاں پر کیفیت کے اعتبار سے اون پر دو طرح کی محنت ہوئی۔ دادی نے بھیڑ کو اچھی طرح نہلایا تاکہ اون صاف ہو جائے۔ پھر اسے کاٹ کر محفوظ کر دیا۔ اگر اون پر یہ محنت نہ ہوتی تو کوئی بھی انسان اس سے فائدہ نہ اٹھا پاتا۔ اب اس میں ایک قدر پیدا ہو گئی اور نتیجۃً یہ ایک جنس کی شکل اختیار کر گئی۔ دوسرے مرحلے کی محنت گو کہ نوعیت کے اعتبار سے مختلف (یعنی صنعتی) ہے لیکن چونکہ ایک ہی فرد نے کی ہے اس لیے اس میں پیدا ہونے والی اضافی قدر، قدرِ زائد کہلائے گی۔ اب اگر دادی اس اون سے بنی لوئی کو فروخت کرتی ہے تو سارا فائدہ اسے ملتا ہے۔ اس لیے کہ اس نے اپنے لیے کام کیا۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے وہ کیونکر اپنے لیے کام کرنے کے قابل ہوئی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ذرائع پیداوار اس کے قبضہ میں تھے اور طریقہ پیداوار اور آلاتِ پیداوار بھی اس کے اپنے تھے۔ اگر وہ

ایک مزدور ہوتی تو کیا اس کی محنت سے اون میں پیدا ہونے والی قدرِ اصل یا قدرِ زائد اُسے ملتی۔ کسی صورت بھی نہیں ملنی تھی۔ اسے اپنی پیدا کی ہوئی قدر اور قدرِ زائد کا بہت ہی کم حصّہ مل پاتا۔

سرمایہ دارانہ نظام اور سوشلزم کی جنگ کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے...........!

یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے طبقات جنم لیتے ہیں۔ اور اسی نقطہ سے طبقاتی جدوجہد نے بھی جنم لیا ہے۔ یعنی ظُلم و جبر کی کوکھ میں ہی قدرت نے انقلاب کو چھپا رکھا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جہاں کہیں بھی ظُلم ہو رہا ہے، وہاں پر ساتھ ہی ساتھ قدرت ہمیں انقلاب کا درس بھی دے رہی ہوتی ہے، اُس کے لیے اُبھار رہی ہوتی ہے۔ قدرت نے انقلاب کے تمام تر سامان انسان کو مہیا کر رکھے ہوتے ہیں۔ جس طرح انسان اگر قدرت کی عطا کردہ صلاحیتوں اور محنت کرنے کی طاقت کو استعمال میں لا کر جنس اور قدرِ زائد پیدا نہیں کرتا تو وہ اپنا نقصان کر رہا ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر وہ ظُلم کے خلاف عطا کی گئی مزاحمت کو استعمال میں لاتے ہوئے انقلاب کا نعرہ مستانہ بلند نہیں کرتا تو اپنے اوپر ہونے والے ظُلم میں اس کا اپنا بھی حصّہ ہوتا ہے۔

اب تک ہم نے زرعی اور صنعتی دونوں شعبوں کی مثالیں زیرِ بحث لائی ہیں۔ گو کہ یہ چھوٹے پیمانے پر ہیں لیکن آپ کسی بھی شعبے یا انڈسٹری میں جائیں گے آپ کو یہی صورت نظر آئے گی۔ میں اوپر بیان کی گئی ایک بات کو پھر سے دہراتا ہوں۔ دادی اپنے لیے کام کرنے کے قابل اس لیے تھی کہ خام مال، یعنی اون اور طریقہ پیداوار اور آلاتِ پیداوار یعنی چرخہ وغیرہ بھی اس کی اپنی ملکیت تھی۔ گویا وہ اون کا دھاگا کاتنے میں کسی کی محتاج نہ تھی۔ نہ صرف وہ بلکہ اس کی نسلوں میں سے بھی کوئی کسی کا محتاج نہ تھا۔ البتہ زمین کے بڑے حصوں پر جاگیردار کے قبضے کی وجہ سے طویل مدت سے زرعی مزدوروں کا ایک بڑا طبقہ وجود میں آ چکا تھا۔ صنعتی مزدور اور سرمایہ دار کس طرح وجود میں آئے آیئے اب اس طرف چلتے ہیں۔ آپ نے سنا ہوگا اور شاید دیکھا بھی ہو کہ ہر گاؤں میں مختلف قسم کے کام کرنے والے لوگ ہوتے تھے۔ جن میں جولاہا تھا جو کپڑا بُنتا تھا، بڑھئی لکڑی کی چیزیں، لوہار لوہے کی اور کمہار مٹی کے برتن بناتا تھا۔ اسی طرح دیگر پیشہ کے لوگ تھے جو انفرادی طور پر چیزیں بنا کر بیچتے تھے۔ انہیں میں ہمارے وہ جولاہے بھی تھے جو ہمارے دھاگے سے لوئیاں بنا کر دیتے تھے اور معاوضے میں پیسے کی بجائے اون کا دھاگا ہی لیتے

تھے۔ایک دن انہیں خبر ملی کہ فلاں شہر میں اون کا کپڑا بنتا ہے اور کاریگروں کو اس کے بدلے میں اچھی خاصی رقم ملتی ہے۔ وہ گاؤں چھوڑ کر اس شہر میں چلے گئے اور کارخانے میں ملازم ہوگئے۔تھوڑی سی ٹریننگ کے بعد وہ کام کرنے لگے۔ یہ ایک ٹھیکیدار قسم کا آدمی تھا جس نے شہر کے بڑے بڑے لوگوں سے، جن کے پاس لوگوں کی امانتیں پڑی رہتی تھیں، قرض لیا اور ان سے معاہدہ کیا کہ وہ انہیں ہر ایک سو روپے پر اتنی مدت کے بعد ۱۱۰ روپے ادا کرے گا۔ یہ ایک اچھا خاصا فائدے کا کام تھا۔لوگوں کی جمع کی ہوئی رقم پر گھر بیٹھے نفع مل رہا تھا، جس جس کو پتہ چلا اس نے ٹھیکیدار کو پیسے دے دیے۔ ٹھیکیدار نے کپڑا بنانے کی کھڈیاں خریدیں، ایک ہال کرائے پر لیا اور مختلف علاقوں سے جولاہوں کو لا کر کام شروع کر دیا۔ٹھیکیدار کو اس کام میں اچھا فائدہ ہوا۔لیکن وہ ابھی بھی اس نفع پر مطمئن نہ تھا۔دوسری طرف جن لوگوں نے اسے قرض دیا تھا انہوں نے صرف سُود لے کر اصل رقم کاروبار میں لگی رہنے دی اور وہ بہت خوش تھے۔ٹھیکیدار ہر وقت یہ سوچتا رہتا تھا کہ اس کے نفع میں کس طرح اضافہ ہوسکتا ہے۔نفع میں اضافہ پیداوار میں اضافے سے ہی ممکن تھا۔لہٰذا اس نے کاریگروں سے معمولی اضافی اجرت (اوور ٹائم) پر زیادہ پیداوار حاصل کرنا شروع کر دی۔ یوں اس کے منافع میں اچھا خاصا اضافہ ہوگیا۔ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ یہ منافع مزدور یا کاریگر کی پیدا کی ہوئی ''قدرِ زائد'' ہے جو انفرادی طریقہ پیداوار میں کاریگر کو ملتی تھی اب ساری کی ساری ٹھیکیدار کو مل رہی ہے۔البتہ اس کا کچھ حصہ سُود کی شکل میں ان لوگوں کو بھی مل رہا ہے جنہوں نے ٹھیکیدار کو قرض دے رکھا ہے۔یہی وہ سُود خور لوگ تھے جنہوں نے بعد میں بنک بنائے۔

ٹھیکیدار اس منافع پر بھی قانع نہ ہوا اور منافع میں مزید اضافہ کے بارے میں سوچنے لگا۔مزدور کو جتنا نچوڑ سکتا تھا اس نے نچوڑ لیا، اب اس کے پاس صرف اتنا وقت بچا تھا جس میں وہ اتنا آرام کرسکتا تھا کہ دوسرے دن پھر کام کر سکے۔اب یہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ اس سے زیادہ کام انسان کے بس کی بات نہیں ہے یہ کوئی مشین ہی کر سکتی ہے، جو کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ پیداوار دے سکے۔سرمایہ دار کی اس سوچ اور مزدور کی پیدا کی گئی کی قدرِ زائد بلکہ یوں کہیے کہ مزدور کے نچڑتے خُون نے مشین کو جنم دیا۔ٹھیکیدار نے مشینیں بنوائیں اور کاریگروں کو ان پر لگا دیا۔کپڑے کے اس چھوٹے سے کارخانے اور ٹھیکیدار کی اپنی دولت میں کم سے کم وقت میں

زیادہ سے زیادہ اضافے کی سوچ نے مل کر نئے سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد رکھی۔اس نظام نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ایک دستکار رہنر مند کو عام مزدور بنا دیا۔وہ اس طرح کہ اس سے پہلے جو جولاہا پورا کپڑا خود بناتا تھا اب وہ مشین سے بننے والے دھاگے کی نگرانی کرتا تھا۔اگر دھاگا ٹوٹ جاتا تو وہ فوراً اسے جوڑ لیتا۔اس کا دوسرا ساتھی اون کو صاف کرنے والی مشین پر کام کرنے لگا، تیسرا اون کو خشک کرنے کا کام کرتا اور چوتھا دھاگے سے کپڑا بنانے والی مشین کے ایک حصے پر کام کرنا شروع ہو گیا۔یوں ایک دستکار جو انفرادی طور پر پورا کپڑا خود بناتا تھا اب ایک جزوی کام میں لگے رہنے کی وجہ سے مکمل چیز بنانے کی اہلیت کھو دیتا ہے۔انفرادی طریقہ پیداوار میں وہ خود مالک بھی تھا، دستکار بھی اور تاجر بھی۔ جبکہ اب وہ کارخانے کا غلام ہو کر رہ گیا۔ یہ سرمایہ دارانہ طریقہ پیداوار ہے جس میں دستکار ایک پرزہ بن کر رہ جاتا ہے۔کارخانہ سے باہر اس کی کوئی حیثیت نہیں رہتی۔ اب وہ اجتماعی دستکاری یعنی سرمایہ دارانہ طریقہ پیداوار میں ہی کام کرنے قابل رہ جاتا ہے۔

مشین چونکہ تھکتی نہیں مسلسل چلنے کی اہلیت رکھتی ہے اور تیز رفتار ہونے کے باعث کم وقت میں زیادہ پیداوار بھی دیتی ہے۔اس لیے سرمایہ دار نے مشین کاری کے فروغ پر بہت توجہ دی۔ مشین کیا ہے، مشین دراصل مزدور کے اوزار کا متبادل ہے۔کھڈی، چرخہ، تکلا، سوئیاں وغیرہ اوزار کو بہتر شکل اور زیادہ کارآمد بنا کر ایک موٹر کے ساتھ جوڑ کر مشین بنا دی گئی۔ جولاہا چونکہ ان اوزار کو ہاتھ سے استعمال کرتا تھا اس لیے پیداوار کا عمل سست تھا۔جبکہ مشین کی پیداوار مزدور کی ہاتھ کی پیداوار سے کئی گنا زیادہ تھی۔ مشین کی دوسری خوبی یہ تھی کہ اسے زیادہ تعداد میں مزدوروں کی ضرورت نہ تھی۔ جہاں پہلے ۵۰۰ مزدور کام کرتے تھے، مشین کے آجانے سے وہاں ۲۵۰ مزدور کافی تھے۔ مشین کی تیسری خوبی یہ تھی کہ یہ کم خرچ تھی۔اس سے دو باتیں سامنے آتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ مشین زیادہ مفید اور کارآمد ہے جو زیادہ مزدوروں کو برطرف کرے اور اس کی فی گھنٹہ پیداوار بھی زیادہ ہو۔دوسری یہ کہ مشین ۲۴ گھنٹے میں جتنی زیادہ چلے گی اتنی زیادہ پیداوار بھی دے گی اور اپنی قیمت بھی اتنی جلد پوری کر لے گی۔ سرمایہ دار کو چونکہ یہ خوف بھی لاحق رہتا تھا کہ اگر آنے والے سال میں کوئی نئی اور زیادہ ''مفید'' رکارآمد مشین مارکیٹ میں آجاتی ہے تو اس کا مدمقابل وہ مشین خرید کر کم لاگت پر چیزیں پیدا کرنا شروع کر دے گا۔اس لیے اس کی حتی

الامکان کوشش ہوتی تھی کہ مشین چوبیس گھنٹے کام کرتی رہے۔تاکہ وہ نئی مشین کے آنے سے پہلے پہلے اپنی قیمت پوری کر لے۔

آپ نے دیکھا ہو گا کہ ڈوزر مشین کے آنے سے پہلے سڑک بنانے کے لیے ۱۰۰ مزدور کام کرتے تھے۔یا پھر علاقے کے لوگ مل کر رضا کارانہ طور پر یہ کام کرتے تھے۔ڈوزر مشین نے ۹۸ مزدوروں کو برطرف کر دیا۔جو کام ۱۰۰ مزدور ایک مہینے میں کرتے تھے ڈوزر مشین دو آدمیوں کے ساتھ چند دن میں کرنے لگی۔اس مشین کی ایجاد کا سبب بھی وہی تھا جو دیگر مشینوں کا تھا۔یعنی کم وقت اور لاگت میں زیادہ سڑکیں تیار کی جائیں۔سڑکیں کیوں تیار کی جانے لگیں۔ انسان کی فلاح کے لیے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ بلکہ اس لیے کہ مشین کے ذریعے مزدور کو نچوڑ کر جو زیادہ پیداوار حاصل کی جاتی تھی اسے دور دراز کے علاقوں،ملکوں میں پہنچایا جائے تاکہ ان کی کھپت بھی ہو سکے اور وہاں کے مقامی انفرادی طریقہ پیداوار کو بھی مات دی جا سکے۔یہ بات ہمیں سڑکوں کے استعمال نے بتائی ہے۔

اب آیئے دیکھتے ہیں کہ صنعت وحرفت یا مشین کاری کے مزدور پر کیا اثرات مرتب ہوئے۔مشین کاری کا سب سے پہلا نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے مزدور کو برطرف کر دیا۔دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ چونکہ مشین کو چلانے کے لیے زیادہ ہنرمندی کی ضرورت نہ تھی اور معمولی ٹریننگ سے ایک غیر ہنرمند آدمی بھی اس پر کام کر سکتا تھا۔اس لیے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں جو زیادہ مستعد بھی ہوتے ہیں کثیر تعداد میں مزدور بن گئے۔یوں ایک سماج میں مزدوروں کی آبادی کئی گنا بڑھ گئی جبکہ مشین کے آنے سے روزگار کے مواقع کم ہو گئے۔اس طرح مزدور کم اجرت پر، بلکہ اپنے بیوی بچوں کو بھی کام پر لگانے پر مجبور ہو گیا۔پہلے گھر کا ایک فرد کام کرتا تھا اور گھر بھر کا خرچ چلتا تھا۔ اب گھر کا ہر فرد کام کرنے لگا۔مشین کے تیز رفتار پرزے اور اوزاروں پر کام کرنے کے لیے مزدور کو زیادہ تیزی سے کام کرنا پڑتا ہے۔یعنی انسان کو مشینی رفتار پر کام کرنا پڑ گیا۔لہٰذا مشین پر مزدور کے چھ گھنٹے کا کام اس کے بغیر مشین کے ۱۲ گھنٹے کے کام کے برابر ہے۔یوں اس کی فی گھنٹہ مشقت بھی دوگنی ہو گئی۔اس طرح اس کے ۸ یا ۱۰ گھنٹے کی محنت اس کے جسم میں ۱۸/۱۶ گھنٹے کی محنت کے برابر تھکاوٹ پیدا کر دیتی ہے۔یوں ایک مزدور کے کام کرنے کی اوسط عمر بھی گھٹ

گئی۔ غیر مشینی ماحول میں روزانہ آٹھ گھنٹے کام کرنے سے اگر وہ ۶۰ سال تک کام کر سکتا تھا تو مشینی ماحول میں اتنا ہی وقت کام کرنے سے اس کا جسم وقت سے بہت پہلے کمزور پڑ جاتا ہے۔ کم و ناقص خوراکی اور بے تحاشا محنت کی وجہ سے اس کے لاغر جسم میں قوتِ مدافعت کم ہو جاتی ہے۔ بیماریاں اسے گھیر لیتی ہیں جن کا علاج اس کی پہنچ سے باہر ہوتا ہے۔ جب تک جان میں جان تھی سرمایہ دار کو اس کا حساب دیتا رہا...... جیسے خدا کی نہیں زندگی اسی کی عطا ہو، وہی اس کا خدا ہو۔ اور کیوں نہ ہو، طاقت اسے خدا بنا بھی دیتی ہے۔ پھر جب جان سے ہار گیا تو زندگی اس سے حساب لینے لگی......! حتّٰی کہ موت آ کر اسے زندگی سے نجات دلاتی ہے......!

یہ ہے سرمایہ دارانہ طریقہ پیداوار جس نے انسان کو مشین یا اوزار کا درجہ دیا۔ اس کی اجرت میں کمی کی، اس کی آزادی کو صلب کیا، اس سے جینے کا حق چھین لیا، ساری زندگی اس سے جانور سے بھی بدتر سلوک روا رکھا اور بالآخر اسے قتل کر دیا۔ یاد رکھیے ہر مرنے والا مزدور مقتول ہے اور اس کا قاتل سرمایہ دارانہ نظام ہے۔ ...... پھر اس کی جگہ اس کی اولاد کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیا۔ پتہ نہیں لوگوں کو ایسی خوفناک زندگی کیوں عزیز ہے کہ وہ آزادی اور انقلاب کی خاطر عزت کی موت مرنا پسند نہیں کرتے!! پوری زندگی غلامی میں گزارنے کے بعد غلامی کا یہ طوق اپنی نسل کے گلے میں ڈال کر مر جاتے ہیں، بغاوت نہیں کرتے۔ سرمایہ دارانہ نظام نے دولت کے ارتکاز کو فروغ دیا، سماجی قدروں، رشتوں اور آدرشوں کو پامال کر کے رکھ دیا۔ یہ ہیں سرمایہ دار دنیا کی ترقی کے ثمرات۔ یہ ہے ٹیکنالوجی کی دین۔ انسان اس ٹیکنالوجی کے بغیر دنیا پر ہزارہا سال سے موجود ہے۔ زندگی ٹیکنالوجی کی کبھی محتاج تھی نہ ہے۔ ٹیکنالوجی سامراج کی گڑیا ہے جسے وہ ہر سال نئے کپڑے پہنا کر بیچ دیتا ہے۔ یہ دنیا پر قبضے کا ایک ہتھیار ہے۔

یہاں پر ایک بات کی وضاحت ضروری ہے کہ ہم صنعت و حرفت کی ترقی یا مشین کاری کے خلاف نہیں ہیں۔ مشین تو مزدور کے بوجھ کو ہلکا کرنے کی زبردست اہلیت رکھتی ہے۔ اس کا صحیح استعمال انسان کی زندگی کو آسان بنا سکتا ہے۔ ہم مشین کے غیر انسانی وسرمایہ دارانہ استعمال کے خلاف ہیں۔ جب تک اس پر سرمایہ دار کا قبضہ ہے اور یہ سرمایہ دارانہ طریقہ پیداوار میں استعمال ہو رہی ہے، یہ انسانوں کا خون چوستی رہے گی جس طرح بھُو کا شیر بکری کا خون چُوستا ہے۔

جس طرح سرمایہ دارانہ نظام میں وسائل پر قابض طبقہ مزدور طبقے کا استحصال کرتا ہے اسی طرح دولت مند قومیں غریب قوموں کا استحصال کرتی ہیں۔ اپنی صنعتوں کو درکار خام مال وہ غریب ممالک سے انتہائی سستے داموں خرید کر اپنی صنعتی پیداوار کئی گنا مہنگی واپس انہی ممالک کو بیچ کر اپنی سرمایہ دارانہ معشیت کو سہارا دیے رہتے ہیں۔ نوآبادیاتی تسلط کی بنیادی وجہ یہی ہے۔ ہندوستان، عرب اور افریقہ وغیرہ پر مغربی اقوام کا تسلّط اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ اور اس سلسلے میں لڑی جانے والی جنگوں کا مقصد مفتوح قوموں کے وسائل تک رسائی تھی۔ ایک بات ذہن میں رکھیے کہ سرمایہ دارانہ نظام جنگوں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ جنگ اس کی آکسیجن ہے۔ انگریز کے دور میں ہندوستان بھر میں ریلوے لائنوں کی تنصیب کا مقصد خام مال کی باسرعت ومنافع بخش ترسیل تھی۔ جبکہ آج بھی لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ انگریز نے ہندوستان میں ترقی کی بنیاد رکھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ انفراسٹرکچر اب مقامی حکومتوں کے استعمال میں ہے لیکن اس کے ذریعے ہندوستان کے جس قدر وسائل کو لوٹا گیا اس کا تصور بھی محال ہے۔ انگریز نے ہندوستان پر قبضہ کرنے کے بعد یہاں کا تعلیمی نصاب بھی تبدیل کیا اور کالج، یونیورسٹیاں، میڈیکل وانجنیئرنگ کالج قائم کیے۔ ان اداروں کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ سرمایہ دارانہ نظام کو ہندوستان میں کامیابی سے رائج کرنے کے لیے مطلوبہ مہارت یافتہ لوگ مقامی سطح پر تیار کیے جا سکیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مقامی لوگوں میں سے ہی ایک ایسا تعلیمیافتہ طبقہ پیدا کیا جا سکے جو ان کے مفادات کا تحفظ کرے اور نوآبادیاتی تسلّط کو برقرار رکھنے میں کردار ادا کرے۔ اسی سامراجی نظام اور نصابِ تعلیم کی برکت ہے کہ انگریز کے جانے کے بعد بھی برصغیر میں آزادی کا سورج طلوع نہ ہو سکا۔ برصغیر کے لوگ آزادی کی صبح شاید قیامت تک نہ دیکھ پائیں اس لیے کہ وہ خود کو غلام سمجھتے ہی نہیں۔ حالانکہ جس قدر ذہنی غلامی وفرسودگی کا شکار یہاں کے لوگ اور خصوصاً قیادت ہے شاید ہی دنیا کے کسی اور خطے میں اس شدّت سے پائی جاتی ہو۔

آپ صحت کی سہولتوں پر نظر ڈالیے۔ انگریز کے دور سے پہلے ایلوپیتھک طریقہ علاج کا کوئی وجود نہ تھا۔ ہر گلی محلّہ میں حکیم بیٹھے تھے جو لوگوں کے علاج معالجے کے حوالے سے تمام ضروریات پوری کر رہے تھے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ جدید طبی سہولتوں کا نام ونشان تک نہ تھا۔ ان

سہولتوں کو انگریز کے آنے کے بعد رواج ملا۔ یہاں پر میڈیکل کالج بنے، ایلو پیتھک طریقہ علاج نے اپنے پاؤں جمائے اور ڈاکٹروں کی ایک کھیپ پیدا ہوئی جو مغرب کی فارماسیوٹیکل انڈسٹری کے سیلز مین بنے۔ حقیقت میں اگر دیکھا جائے تو ایلو پیتھک طریقہ علاج سرمایہ دارانہ طریقہ پیداوار کی طرح انسانیت کا استحصال کر رہا ہے۔ اس طریقہ میں بیماری ختم نہیں ہوتی بلکہ دواؤں کے اثر سے دب جاتی ہے جبکہ دوائیوں کے مضر اثرات سے کئی اور بیماریاں جنم لیتی ہیں۔ ایلو پیتھک دواؤں کی یہی خصوصیت، یعنی ایک بیماری کو دبا کر دو تین اور کو پیدا کر دینا میڈیکل سائنس کے سرمایہ دارانہ استعمال کے باعث ہے۔ اور یہی اس کاروبار کی بڑھوتری کا راز بھی ہے۔ امراض اور مریضوں میں اضافہ ہی فارماسیوٹیکل انڈسٹری کی ترقی کا باعث ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ فارماسیوٹیکل سیکٹر میں کام کرنے والوں کی تنخواہیں، بنکوں اور انشورنس کمپنی والوں کی طرح بہت زیادہ ہوتی ہیں۔ یہ اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ یہ ادارے بے تحاشہ منافع کماتے ہیں۔ حالانکہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ انسانی صحت سے متعلقہ تمام تر سہولتیں مہیا کرنا حکومت کی ذمہ داری ہوتی لیکن چونکہ یہ سرمایہ دار طبقہ کے مفاد میں نہ تھا۔ اس لیے حکومتوں نے سرمایہ داروں کو انسانی جانوں سے کھیلنے کی کھلی چھٹی دے دی۔ کم سے کم اتنا تو ہوسکتا تھا کہ اس کاروبار میں منافع کی شرح کم رکھی جاتی لیکن معاملہ اس کے برعکس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عام آدمی کے لیے علاج کروانا ناممکن ہو چکا ہے۔

آپ زرعی شعبے میں دیکھ لیجیے۔ کیمیائی کھادوں کے ذریعے ہماری فصلیں سبزیاں اور پھل زہر آلود ہو چکے ہیں۔ یہ اس قدر سفاک نظام ہے کہ منافع کی خاطر اس نے انسان کو زہر کھلانا شروع کر دیا ہے۔ زندگی کا کوئی بھی شعبہ آپ دیکھ لیں، اس کی ہلاکت خیزیوں سے محفوظ نہیں ہے۔ دنیا میں آج جہاں کہیں بھی غربت ہے، جہالت ہے، بیماری ہے، فرسودگی ہے، ظُلم ہے، جبر ہے، منافقت ہے سب کا سب اس نظام کا کیا دھرا ہے۔ مارکس، اس کے پیش روؤں اور جانشینوں نے اس کے خلاف آواز اٹھائی اور جدوجہد کی۔ جس کے نتیجے میں اسے بے شمار ملکوں سے اپنا بوریا بستر گول کرنا پڑا۔ تو دوستو ہم جب آزادی کی بات کرتے ہیں تو فقط ہندو پاک سے آزادی کی نہیں بلکہ اس نظام سے بھی آزادی کی بات کرتے ہیں۔ ہماری جدوجہد آزادی کے بعد ایک ایسے سماج کے قیام کے لیے ہے جو استحصال، ظُلم جبر، جہالت، ذہنی غلامی اور فرسودگی سے

پاک ہو۔ جس میں عدل ہو، انصاف ہو، آزادی ہو۔ اور یہ سب کچھ آپ کو ایک سوشلسٹ سماج میں ہی مل سکتا ہے۔

ایک آخری بات اور انتہائی اہم بات یہ کہ، ہندوستان اور پاکستان کے عوام بھی اسی ظلم کا شکار ہیں۔ ہماری ان سے کوئی دشمنی نہیں۔ ہم سب کا دشمن ایک ہے اور وہ بالا دست طبقہ ہے جو وسائل پر قابض ہے۔ ہمارے مسائل ایک ہیں، ہماری جدو جہد ایک ہے۔ اور ہماری شدید خواہش ہے کہ وہ بھی ظلم سے نجات حاصل کریں۔ آج کی نشست میں اتنا ہی کافی ہے۔ اب آپ سوالات کر سکتے ہیں''۔

یہ ایک طویل نشست تھی جس میں ۵۰ کے قریب لڑکے جمع تھے۔ کچھ دیر تو مجمع میں خاموشی رہی پھر ایک لڑکا اٹھا اور اس نے سوال کیا۔

''ریاض صاحب بہت شکریہ، آپ نے بڑی آسان زبان میں بات کی سرمایہ دارانہ نظام کی وجہ سے جو بگاڑ پیدا ہوتا ہے اس کی اچھی طرح سمجھ آ گئی ہے۔ لیکن سوشلزم میں اس بگاڑ کو کیسے درست کیا جائے گا''؟

جواب: ''بہت اچھا سوال ہے آپ کا۔ دراصل یہ مکمل موضوع ہے جس پر اگلی نشست میں بات ہو گی''۔

سوال: ''اچھا اتنا بتا دیں کہ جو قدرِ زائد سرمایہ دارانہ نظام میں پیدا ہوتی ہے اور سرمایہ دار کی جیب میں یا سود کی شکل میں بنکوں کے پاس جاتی ہے۔ سوشلزم میں یہ قدرِ زائد مزدور کو ملے گی''؟

جواب: بہت ہی خوبصورت اور سب سے اہم نقطہ آپ نے اٹھایا ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ سوشلزم میں قدرِ زائد پیدا ہی نہیں ہو گی۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے آیئے ایک مرتبہ پھر دیکھتے ہیں کہ قدرِ زائد کیا چیز ہے۔ فرض کیجیے کہ ایک مزدور کی پورے دن کی ضرورتیں چھ گھنٹے کی محنت سے پوری ہو جاتی ہیں۔ تو اصولاً اس سے چھ گھنٹے ہی کام لینا چاہیے۔ لیکن سرمایہ داری میں پیداوار کا مقصد چونکہ منافع کا حصول اور دولت ارتکاز ہوتا ہے۔ اس لیے مزدور سے اس کی ضرورت سے زیادہ کام لیا جاتا ہے جبکہ اسے مزدوری اتنی دی جاتی ہے جس سے وہ اپنی

ضرورتیں بھی پوری نہیں کر پاتا اور مجبوراً اپنے بیوی بچوں کو بھی کام پر لگاتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ چھ گھنٹے سے اوپر اس نے جتنا بھی کام کیا وہ سب کا سب سرمایہ دار کا منافع ہوا۔ دوسرے لفظوں میں آپ قدرِ زائد کو محنتِ زائد بھی کہہ سکتے ہیں۔ یعنی قدرِ زائد (surplus value) محنتِ زائد (surplus labour) کی پیداوار ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا وجہ ہے کہ سرمایہ دار اتنے بڑے پیمانے پر مزدور کا استحصال کرنے کے قابل ہوا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ذرائع پیداوار پر سرمایہ دار کا قبضہ ہے اور وہ ایسے طریقہ پیداوار کو نافذ کر چکا ہے جس میں مزدور کے لیے دوسرا کوئی راستہ باقی نہیں رہتا۔ اسے سرمایہ دار کے پاس ہی کام کرنا پڑتا ہے۔ سوشلزم میں ذرائع پیداوار پر ریاست کا کنٹرول ہوتا ہے اور طریقہ پیداوار بھی مختلف ہوتا ہے۔ سوشلزم میں پیداوار کا مقصد منافع کا حصول یا دولت کا ارتکاز نہیں بلکہ انسانی ضرورت کو پورا کرنا ہے۔ تو جیسے میں نے پہلے کہا کہ سوشلزم میں قدرِ زائد پیدا نہیں ہوگی جس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی سے اس کی ضرورت سے زیادہ کام نہیں لیا جائے گا۔ یا پھر ہر آدمی سے اس کی اہلیت و استعداد کے مطابق کام لیا جائے گا اور اس کی ضرورت کے مطابق پیداوار میں حصہ دیا جائے گا۔ جب محنت زائد ختم ہوگئی تو قدرِ زائد یا منافع کا ٹنٹا ہی سرے سے ختم ہوگیا۔ جب ماں ہی مرگئی تو بچہ کہاں سے آئے گا؟ بہرحال اس موضوع پر آئندہ نشست میں انشاءاللہ تفصیل سے بات ہوگی''۔

''ریاض صاحب شاید میں آپ کی اگلی نشست میں شامل نہ ہوسکوں۔ اس لیے اگر اجازت ہو تو کچھ بات کرلوں''؟ ایک چُست بدن اور درمیانے قد کے لڑکے نے کھڑے ہو کر سوال کیا۔

''ضرور، بھئی دیکھو میری بات ختم ہوگئی ہے۔ اب اس پر فیڈ بیک آنا بڑا ضروری ہے۔ اب ہم اوپن ڈسکشن کی طرف آچکے ہیں، اس میں اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ اگر آپ لوگ اجازت دیں تو میں بیٹھ جاؤں''۔ وہ مسکراتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گیا۔

نوجوان کے چہرے پہ میلوں کے فاصلے پر بکھرے داڑھی کے پتلے پتلے بال اس کی کم عمری کی نشاندہی کررہے تھے۔ البتہ اس کی آنکھوں کی چمک اس کی ذہانت اور بلوغت کی چُغلی کھا رہی تھی۔ اس نے بولنا شروع کیا۔

'' ریاض صاحب میرا نام عزیز ہے اور میں لاہور کے ایک دینی مدرسے سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد اب وہاں پڑھا رہا ہوں۔'' ریاض نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر غور سے اس کی بات سُننے لگا۔

'' شاید میں بے جا مداخلت کر رہا ہوں لیکن ایک طالب علم ہونے کے ناطے سوال اٹھانا میری ضرورت اور اپنا نقطہ نظر بیان کرنا میرا حق ہے۔ آپ نے سرمایہ دارانہ نظام پر کڑی اور سو فیصد درست تنقید کی۔ یہاں تک میرا آپ سے اتفاق ہے۔ مارکس اور دیگر اشتراکی مفکّرین نے سرمایہ دارانہ نظام کا اس قدر درست تجزیہ کیا ہے کہ اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ ان کے دل میں سرمایہ دارانہ نظام کی چکّی میں پستی اور لہولہاں ہوتی انسانیت کے لیے بے پناہ ہمدردی تھی۔ لہٰذا انہوں نے انسانیت کو اس ظُلم سے نجات دلانے کا عزم کیا اور پھر ایک متبادل معاشی، سیاسی وسماجی نظام مہیا کرنے کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ ان کا یہ جذبہ انسانیت کا ایک قابلِ فخر اثاثہ ہے۔

اختلاف اس بات پر ہے کہ مارکس اور دیگر اشتراکی مفکّرین نے انسان کے دیگر مسائل کو الگ کر کہ فقط معاشی مسئلے کو اٹھایا اور اس کا حل پیش کیا ہے۔ انسان فقط ایک مادہ یعنی جسم ہی نہیں بلکہ جسم و جان کا مرکب ہے۔ مادی ضرورتوں کے علاوہ بھی اس کی ضرورتیں اور خواہشات ہیں۔ مثلاً انسان چاند پر گیا تو کسی مادی فائدے کے پیشِ نظر نہیں گیا۔ اس کے اندر موجزن کائنات کو تسخیر کرنے کی جستجو اسے لے گئی ہے۔ اسی طرح انفرادی سطح پر بھی جستجو کا یہ عمل غیر محسوس انداز میں جاری رہتا ہے۔ جستجو کے اس عمل نے انسان کے معاشرتی ارتقا میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ ہر انسان ایک مکمل اکائی ہے۔ وہ ایک الگ فطرت، نفسیات، میلان ورجحانات لے کر پیدا ہوتا ہے۔ انسان اپنی ذہنیت، فطرت، صلاحیتوں کے اعتبار سے دوسرے سے مختلف ہے اور انہی کی بنیاد پر اس کی ایک شناخت اور حیثیت ہے۔ ایک پودے کی طرح ہر انسان کو ایک آزاد، کھلی فضا اور موافق ماحول درکار ہوتا ہے جس میں اس کی صلاحیتیں پروان چڑھ سکیں۔ اسے زندگی میں آگے بڑھنے اور سماج کے لیے سودمند ثابت ہونے کے لیے کسی نہ کسی محرک (incentive) کی ضرورت ہوتی ہے۔ کسی بھی معاشرے کی ترقی میں یہ بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ جبکہ یہ محرک

ہمیں ایک اشتراکی سماج کی تھیوری میں نظر نہیں آتا۔ معاشی وسماجی انصاف ہر انسان کا بنیادی حق اور جائز مطالبہ ہے جبکہ معاشی مساوات اشتراکیت کی وہ خصوصیت ہے جس نے فرد کے لیے کوئی محرک باقی نہیں چھوڑا۔ ایک سوشلسٹ ریاست فرد کو ترقی کی راہ پر گھسیٹ تو سکتی ہے، رضا کارانہ طور پر اسے اپنے ساتھ لے کر نہیں چل سکتی۔ نتیجۃً ایک وقت آئے گا کہ اشتراکی معاشرہ جمود کا شکار ہو جائے گا۔

آیئے ایک مثال کے ذریعے اسے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ایک سکول میں دو طالب علم ہیں۔ ایک کھیل کود میں زیادہ دلچسپی لینے کے باعث لازمی تعلیم حاصل کرنے کے بعد کسی کام پر لگ جاتا ہے۔ جبکہ دوسرے طالب علم نے پڑھائی جاری رکھی اور انجنیئرنگ کر کے نوکری شروع کر لی۔ معاشی اور سماجی ہر دو اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہ تھا۔ انجنیئر کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ اتنی محنت سے تعلیم حاصل کرنے کا اسے کیا صِلہ ملا۔ میرا وہ ساتھی جس نے کھیل کود میں زندگی گزاری معاشی وسماجی اعتبار سے میرے برابر ہے تو پھر میں اتنے سال کیوں اپنے آپ کو کھپاتا رہا؟ لہٰذا وہ اپنے شعبے میں مزید پڑھائی، تحقیق، تخلیق یا جستجو کے عمل سے کنارہ کش ہو گیا۔ یہ ایک ایسی صورتحال ہے جس کا اشتراکیت کے پاس کوئی حل نہیں اور یہی ایک چیز اشتراکی معاشرے کے ہاتھ پاؤں باندھ کر کھائی میں پھینکنے کے لیے کافی ہے۔

آپ نے اپنی مثال میں کہا ہے کہ اگر ہماری دادی کسی کے لیے کام کر رہی ہوتی تو پودوں یا بھیڑوں کی فروخت سے ہونے والا فائدہ اسے نہ ملتا۔ یہ حقیقت ہے اور اس میں کوئی شک نہیں۔ لیکن یہاں پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر دادی ایک اشتراکی معاشرے کی فرد ہوتی تو کیا وہ ان پودوں پر محنت کرتی؟ ایسی صورتحال میں جہاں اسے ایک مخصوص کام کے عوض تمام تر ضروریات دستیاب ہیں، پودوں پر اضافی محنت کی اسے کوئی ضرورت نہ تھی۔ یوں ہر سال سینکڑوں درختوں کا نقصان ہوتا رہتا۔ پودوں اور زمین کی ملکیت اور بعد ازاں زاید پیداوار سے حاصل ہونے والا فائدہ دادی کا وہ (incentive) تھا جس نے ہزاروں درختوں کو وجود دیا۔ بات واضح ہے شاید مجھے زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔

اب میں اسلام کے معاشی نظام پر مختصر بات کروں گا۔ یہ فطرت کا قانون ہے اور انصاف کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ ہر انسان زمین کے وسائل کو اپنی اہلیت، صلاحیت و استعداد کے مطابق استعمال میں لا کر ان سے فائدہ حاصل کرے۔ لیکن کسی بھی موقع پر یہ استعمال استحصال کی شکل نہ اختیار کر پائے۔ یہ ایک بنیادی شرط ہے۔ اسلام فرد کو ذاتی ملکیت کا حق دیتا ہے۔ فرد کی جائز ملکیت کو اسلامی ریاست بھی ختم کرنے کی مجاز نہیں بشرطیکہ وہ اس کا جائز وارث ہو اور اس نے پراپرٹی کے حصول میں کسی کی حق تلفی نہ کی ہو۔ حتیٰ کہ کسی عوامی فلاحی منصوبے کے لیے درکار زمین بھی مالک کی اجازت کے بغیر استعمال میں نہیں لائی جا سکتی۔ اسلام فرد کو ذاتی ملکیت کا حق ہی نہیں دیتا بلکہ ریاست کو اس حق کے تحفظ کی ذمہ داری بھی دیتا ہے۔ کیوں؟ اس کی دو وجوہات ہیں۔ ایک کا تعلق معیشت میں فرد کے حصہ لینے سے ہے۔ جیسا کہ پہلے مثال میں بیان کیا جا چکا۔ دوسری وجہ فرد کی شخصی آزادی کی ضمانت ہے۔ آزادی انسان کا فطری حق ہے اور اسلام اسے بنیادی اہمیت دیتا ہے۔ ایسا فرد جو معاشی معاملے میں کسی ایک فرد یا ادارے کا محتاج ہو گا اپنی آزادی برقرار نہیں رکھ سکے گا۔ نہ وہ سیاسی عمل میں آزادانہ رائے دے پائے گا اور نہ ہی معاشرتی معاملات میں۔ حقِ ملکیت کی صورت میں وہ اپنا نجی کام بھی کر سکتا ہے اور جہاں کہیں اس کی آزادی اور وقار کو خطرہ لاحق ہو وہ اپنی ملکیت کے سہارے اس کا تحفظ کر سکتا ہے۔ لیکن یہاں پر آزادی سے مراد یہ نہیں ہے کہ انسان مال کمانے کے سلسلے میں جو چاہے کرتا رہے۔ سرمایہ دانہ نظام کی چاروں بنیادیں سود، جوا، قمار، اور اکیناز (دولت کو سمیٹ کر چند مخصوص افراد کے پاس رکھنا) کو اسلامی تعلیمات میں یکسر مسترد اور ناقابل عمل شمار کیا ہے۔ چونکہ ان سب معاملات میں انسانیت کے حقوق کی کھلی پامالی اور دولت کی ربانی تقسیم کے طریقہ کار کو مٹایا جاتا ہے۔ اسلام نے جائز و ناجائز اور حلال و حرام کی پابندیاں عائد کر رکھی ہیں۔ ہر وہ تجارتی معاملہ جس میں کسی کی حق تلفی، نقصان یا استحصال ہو ناجائز اور حرام ہے۔ اسلام نے اس کے تدارک کے لیے قانون بھی مہیا کیا ہے۔ رشوت، ذخیرہ اندوزی، سٹے بازی، ناجائز منافع خوری، چوری، ملاوٹ، خیانت، دھوکہ دہی، ناپ تول میں کمی اور دیگر ایسے کاموں کو اسلام حرام قرار دیتا ہے۔

اسلام نے سود کو قطعی حرام کیا ہے بلکہ اسے معاشرے کے لیے ایک لعنت قرار دیا ہے۔ اس لیے کہ سود استحصال کی ایک شکل ہے اور اسلام میں کسی بھی قسم کے استحصال کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ سودی قرضوں کے مقابلے میں اسلام قرضِ حسنہ کی ترغیب دیتا ہے۔ اس کے علاوہ ایسے کاروبار کی گنجائش موجود ہے جس میں ایک آدمی سرمائے اور دوسرا اپنی محنت یا ہنر کی بنیاد پر شراکت کرتے ہیں۔ سود کے بارے میں قرآن ایسا انکشاف کرتا ہے جو عام ذہن کو عجیب معلوم ہوتا ہے مگر حقیقت یہی ہے کہ:

''اور یہ جو تم سود دیتے ہو تاکہ لوگوں کے اموال میں اضافہ ہو تو اللہ کے نزدیک وہ ہرگز نہیں بڑھتا۔ بڑھوتری تو ان اموال کو نصیب ہوتی ہے جو تم اللہ کے لیے زکوٰۃ میں دیتے ہو''۔

اسلام مال کو جمع کر کے رکھنے کی ممانعت کرتا ہے۔ بلکہ خرچ کرنے کا حکم دیتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ سونا چاندی جمع کرنے والوں کو اللہ بہت بڑا عذاب دے گا۔ پیسہ بچا بچا کر رکھنا اور پھر ان بچتوں کو مزید سرمایہ اکٹھا کرنے کے لیے لگانا اور سودی قرض کے طور پر دینا سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد ہے۔ اسلام اس کی سختی سے ممانعت کرتا ہے اور دولت کے ارتکاز کی حوصلہ شکنی کرتا ہے۔ اسلام انسانیت کی فلاح کے لیے خرچ کرنے کی ترغیب دیتا ہے، بلکہ زکوٰۃ کی صورت میں حکم دیتا ہے۔ ہر فرد کو اپنے مال پر ڈھائی فیصد سالانہ زکوٰۃ اور زرعی پیداوار پر دس فیصد لگان ادا کرنا ضروری ہے۔ زکوٰۃ کو اس قدر اہمیت دی گئی ہے کہ اسے دین کا ایک اہم رکن یعنی عبادت کا درجہ دیا گیا ہے۔ ہر وہ فرد زکوٰۃ کا حقدار ہے جس کا کوئی ذریعہ آمدن نہیں ہے یا آمدنی اتنی قلیل ہے کہ اس کا گزارا نہیں ہوتا۔ اسے غریبوں، بیواؤں، یتیموں، بیروزگاروں، مسافروں، بیماروں اور بے سہارا لوگوں پر خرچ کرنے کا حکم ہے۔ اسلام زکوٰۃ کے علاوہ صدقات اور خیرات کی صورت میں معاشرے کے مالدار طبقے پر یہ اخلاقی ذمہ داری عائد کرتا ہے کہ وہ مالی طور پر کمزور لوگوں کی معاونت کریں۔ زکوٰۃ، صدقات و خیرات کا مقصد ایک طرف قانونی و اخلاقی طور پر دولت کے ارتکاز کی حوصلہ شکنی کرنا ہے تو دوسری طرف یہ واضح کرتا ہے کہ معاشرے کے غریب طبقہ کا امیر طبقہ کی دولت پر قانونی اور اخلاقی حق ہے۔

یہاں پر ایک چیز کی وضاحت ضروری ہے کہ اسلام جاگیردارانہ وسرمایہ دارانہ نظام کے پیدا کردہ طبقات کو کسی صورت باقی رکھنے کے حق میں نہیں ہے۔ بلکہ معاشی ، سماجی وسیاسی قوانین کے ذریعے ان کو ختم کر دیتا ہے۔اسی طرح اسلام کا قانونِ وراثت دولت کے ارتکاز کے خاتمہ اور اس کی تقسیم میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔اسلام نہ صرف مال کمانے کے بارے میں انسان کی درست رہنمائی کے ساتھ قانونی پابندیاں عائد کرتا ہے۔ بلکہ وہ خرچ کرنے کے حوالے سے بھی حدود کا تعین کرتا اور ان کی خلاف ورزی پر سزا دیتا ہے۔اسلام سادگی کا درس دیتا ہے اور فضول خرچی وعیاشی سے روکتا ہے۔ مال کے کمانے اور خرچ کرنے کے حوالے سے اسلام کی ہدایات و قوانین پر عملدرآمد کرنے والا معاشرہ یا قوم کبھی کسی کی محتاج یا دست نگر نہیں بن سکتی۔ میں اس معاملے میں زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔

اسلام آجر اور اجیر کے حقوق اور ذمہ داریوں کا تعین بھی کرتا ہے۔تا کہ کسی فردبشر کی حق تلفی نہ ہو، مالک اور مزدور کے درمیان ہونے والے معاملات کو اجارہ کہتے ہیں ۔اس کی اولین شرائط جو اسلام نے بیان کیں اس میں بتلایا کہ مالک اور مزدور آپس میں اُجرت کا تعین کر لیں۔ بغیر اجرت کی تعین کے یہ معاملہ درست نہیں ۔مزدور اپنے ان اوقات کی اُجرت لے گا۔جبکہ مالک اُجرت دینے کا پابند ہوگا۔اس بات کو اسلام اتنے اہتمام سے بتاتا ہے کہ:

''مزدور کو اسکی اُجرت پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کرو'' (ابن ماجہ)۔

نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''کل روز قیامت میں تین شخصوں سے جھگڑا کروں گا اُن میں ایک وہ شخص جو مزدور کی اُجرت مکمل طور پر نہ دے''۔

گویا یہ اُجرت نہ دینا آخرت میں سخت سزا کا موجب بنتا ہے۔ یہ تو انسانوں کا معاملہ ہے اسلام اس سے بڑھ کر جانوروں سے کام لینے اور مزدوری کرنے کا طریقہ کار بھی بتلاتا ہے۔ نبی ﷺ ایک باغ سے گزرے وہاں ایک اونٹ (باربرداری) باندھا ہوا تھا جسکا دُبلا پتلا ہونا اُسکے مالک کی لاپرواہی اور کام کی زیادتی کو بتلاتا تھا۔اس پر نبی ﷺ نے اونٹ کے مالک کو بلایا اور کہا کہ یہ اونٹ تیری شکایت کر رہا ہے۔اس کے علاوہ بھی مختلف احادیث سے بھی یہ سبق ملتا

ہے۔جیسا کہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے ''جو شخص کسی کو اُجرت پر کام کرائے واضح طور پر اسکی اُجرت بتلا دے'' (السنن الکبریٰ بیہقی) اور پھر مالک کے ذمہ لازم کیا کہ ہرگز مزدور سے ایسا کام نہ لے جسکی وہ طاقت نہ رکھتا ہو۔ اور اگر مزدور کی طاقت و استطاعت سے بڑھ کر کام ہو تو مالک خود اُسکی معاونت کرے۔ اور کام کرنے والوں کو اُسکے ساتھ کام میں لگائے''۔

اسلام نے تنخواہ اور اُجرت کا معیار بھی مقرر کر دیا ہے کہ اُس سے مزدور کے کنبہ کی بنیادی ضروریات پوری کی جا سکیں۔ مثلاً خوراک، لباس اور مکان اور اضافی ضروریات جیسے علاج و تعلیم وغیرہ۔ رسول ﷺ کا فرمان ہے:

''ابن آدم کا بنیادی حق یہ ہے کہ اُس کے لیے ایک گھر ہو جس میں وہ رہائش پذیر ہو، کپڑا ہو جس میں بدن ڈھانپے، کھانے کیلئے روٹی اور پینے کیلئے پانی ہو'' (ترمذی)۔

اسلام معاشرتی مساوات و معاشی انصاف کا اتنا قائل ہے کہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ:

''وہ مزدور تمہارے بھائی ہیں اُنکو خدا نے تمہارے ماتحت کیا ہے پس جس کے ماتحت خدا نے اسکے کسی بھائی کو کیا اسکو چاہیے کہ وہ جو خود کھائے وہی اُسکو بھی کھلائے، جو خود پہنے وہی اُسکو بھی پہنائے'' (بخاری)۔

اس حدیث سے چند باتیں معلوم ہوئیں:

۱۔ آجر، اجیر (مزدور) کو اپنا بھائی سمجھے اور دونوں میں تعلقات کی نوعیت ایسی ہو جیسی بھائی بھائی میں ہوتی ہے۔

۲۔ کم از کم کھانے، پہننے، رہنے سہنے کی حد تک دونوں کی معاشی سطح برابر ہو یعنی جو خود کھائے مزدور کو بھی کھلائے۔ پھر اُجرت کی ادائیگی کو اتنا یقینی بنایا کہ جیسا حدیث میں وارد ہوا کہ:

''مزدور کی مزدوری اُسکے پسینہ کے خشک ہونے سے پہلے ادا کرو'' (ابن ماجہ)۔

دوسری روایت میں ہے کہ:

''اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تین آدمیوں کا قیامت کے دن میں فریق مخالف ہونگا جن میں سے ایک شخص وہ بھی ہے جس نے کسی کو مزدور رکھا اُس سے پورا کام لیا لیکن اُسکی پوری مزدوری ادا نہ کی''۔

اسلام مزدوروں اور ملازمین کے ساتھ درگزر اور چشم پوشی کی حد درجہ تلقین کرتا ہے۔ ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اُس نے دریافت کیا ''میں اپنے نوکر کو کتنی دفعہ معاف کیا کروں'' اور پھر بار بار اس سوال کو دہراتا رہا۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انتہائی خوبصورت جواب ارشاد فرمایا کہ ''روز ستر دفعہ معاف کیا کرو''۔

اس بنیاد پر ہی فقہائے اسلام نے صاف طور پر یہ طے کردیا کہ ''کسی مقررہ مدت کیلئے جو تنخواہ پر ملازم رکھا جائے اُس پر چیزوں کے نقصان کرنے کا تاوان قانوناً عائد نہ ہوگا اگر اُسکی طرف سے قصداً نقصان کرنے کا ارادہ نہ ہو اور اُس قصداً غفلت اور قصور کے تعین بھی عدلیہ کے سپرد کی گئی''۔

اسلامی معاشرے میں سرمایہ دار مزدور کا استحصال نہیں کرسکتا۔ اس لیے کہ اگر مزدور اُجرت پر راضی نہیں ہے تو وہ کام کرنے کے لیے مجبور نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ اپنی مرضی کی اجرت کا کام ملنے تک زکوٰۃ کا حقدار ٹھہرتا ہے۔ مزید یہ کہ اسلامی ریاست زرعی یا صنعتی پیداوار میں مزدور کا کم سے کم حصہ مقرر کرسکتی ہے۔

اسلام ہر طبقے کے حقوق وفرائض کا تعین کرتا اور ان کی پابندی کی ترغیب دیتا ہے اور فرد کی اصلاح پر زور دیتا ہے۔ انسان کی انفرادی واجتماعی زندگی کا کوئی پہلو اور شعبہ ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں اسلام نے رہنمائی مہیا نہ کی ہو اور ہر دور کے لیے قانون سازی کے بنیادی اصول نہ طے کر رکھے ہوں۔ اس کے ساتھ اسلام فرد کی اخلاقی تربیت پر زور دیتا ہے۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے ذریعے معاشرے میں پیدا ہونے والے ضعف کی اصلاح کا حکم کرتا ہے۔ والدین، بہن بھائیوں، پڑوسیوں، شہریوں کے معاشی، سماجی وسیاسی حقوق وذمہ داریوں کو کھول کھول بیان کرتا ہے اور ان کی بجا آوری کا حکم دیتا ہے۔ لیکن اس کے بعد اگر کوئی فرد ان قوانین کی خلاف ورزی کرتا ہے اور معاشرے میں بگاڑ پیدا کرتا ہے تو اسلام پورے معاشرے پر فرد کو اس خلاف ورزی سے روکنے کی اخلاقی ذمہ داری عائد کرتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اگر وہ باز نہیں آتا تو پھر اس کے لیے سبق آموز سزا تجویز کرتا ہے۔

شاید میں نے زیادہ وقت لے لیا ہے جس پر معذرت خواہ ہوں۔ الگ بات ہے کہ میں

نے اپنی بات کو اتنا مختصر کیا ہے کہ شاید میں پوری طرح اپنی بات نہیں پہنچا پایا ہوں۔ بہر حال مقصد اس کا یہ تھا کہ جب ہمارے پاس پہلے سے ایک ایسا معاشی، سماجی و سیاسی نظام موجود ہے جس کے اندر رہتے ہوئے ہم ایک انسانی زندگی گزار سکتے ہیں۔ اور جو ہماری ثقافت، فطرت، اقدار و اخلاقیات سے ہم آہنگ بھی ہے تو ہم اس نظام کو اپنانے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ جبکہ ہم ایک ایسے نظام کے لیے محنت کر رہے ہیں جس میں بنیادی نوعیت کی خامیاں ہیں۔ مزید یہ کہ ہمارے کلچر میں اس نظام کو ہضم کرنے کی استعداد ہی نہیں ہے۔ میں ایک دفعہ پھر آپ سے معذرت کے ساتھ اجازت چاہتا ہوں''۔

''کوئی ایسی بات نہیں ہے مولوی صاحب، ہم آپ کے شکر گزار ہیں، آپ نے اتنا وقت ہمیں دیا اور پھر بڑی خوبصورت باتیں کی۔ ہم ڈائیلاگ پر یقین رکھتے ہیں۔ ایک دوسرے کے موقف کو سننا اور سمجھنا بڑا ضروری ہے۔ ایک نشست میں ساری باتیں تو ہو ہی نہیں سکتیں۔ پھر کبھی ہمارے پاس تشریف لائیں تا کہ اس سلسلے کو آگے بڑھایا جا سکے۔ بہت سے سوالات ہیں یقیناً جن کے جوابات آپ کے پاس ہوں گے۔ سرِ دست اتنا بتائیں کہ یہ نظام دنیا میں کہیں رائج ہے''؟ ریاض نے کہا

''جی نہیں اسلام کا معاشی نظام اس وقت دنیا میں کہیں بھی رائج نہیں ہے۔ دراصل پہلی جنگ عظیم کے نتیجے میں خلافت کے خاتمے کے ساتھ ہی اسلامی معاشی نظام بھی ختم ہو گیا۔ جب تک عالمی سامراجیت کا دنیا پر قبضہ ہے اسلام کے معاشی نظام کا نفاذ ممکن نہیں۔ اس لیے کہ یہ معاشی نظام عدل پر مبنی ہے اور عدل سرمایہ دارانہ نظام کی ضد ہے، وہ انہیں کسی طور قبول نہیں۔ یہاں پر ایک بات کی وضاحت ضروری ہے کہ جس طرح سوشلزم کا معاشی نظام کے ساتھ اپنا سیاسی، سماجی اور اخلاقی نظم و ضبط ہے اور آپ اکیلے سوشلزم کے معاشی نظام کو نافذ نہیں کر سکتے۔ اسی طرح اسلام کے معاشی نظام کا نفاذ بھی اسلام کے سیاسی، سماجی و اخلاقی نظم و ضبط کے بغیر ممکن نہیں۔ مسلمانوں کی خلافت کے ختم ہونے کا باعث مغرب کی یلغار نہیں بلکہ خود اسلامی حکومت کا اسلامی نظریات سے روگردانی تھا۔ اس تمام عرصے میں اسلام کے سیاسی اور معاشی نظام کو جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہ کیا جا سکا۔ اجتہاد کو ہم نے ترک کر دیا، منقولات پر تکیہ کیے بیٹھے

رہے اور اسلام کی تعلیمات سے بھی منہ پھر لیا۔ یہی چیز ہمارے زوال کا باعث بنی۔ حالانکہ اس نظام میں ہر دور کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی استعداد اور گنجائش موجود ہے۔ باقی آپ سے ملاقات ہوتی رہے گی۔ آپ جب کبھی لاہور تشریف لائیں تو ہمارے مہمان بنیں''۔ مولوی صاحب نے یہ کہہ کر اجازت لی اور اس کے ساتھ ہی تربیتی نشست بھی اختتام کو پہنچی۔



کنونشن کے بعد کچھ روز سکون رہا۔ جیسے تند و تیز بہنے والی ندی ساون کے ختم ہوتے ہی سکون میں آجاتی ہے۔ لیکن یہ سکون وقتی ثابت ہوا۔ انہیں اندازہ نہیں تھا لیکن دراصل وہ ایک بڑا قدم اٹھا چکے تھے۔ اور جن کے خلاف یہ قدم اٹھ رہے تھے انہوں نے ان سے نمٹنے کی منصوبہ بندی کر لی تھی۔

صبح ہی صبح صابر کی آنکھ کھل گئی۔ کوئی اس کی کھڑکی پیٹ رہا تھا۔ تھوڑی دیر تو اسے سمجھ نہ آئی وہ نیم خوابی کی کیفیت میں ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ پھر جھٹ سے کھڑکی کھول کر باہر جھانکا تو نذیر انجم دو لڑکوں کے ساتھ کھڑا تھا۔

''کیا بات ہے بھئی کوئی برا خواب دیکھا ہے رات کو''؟ ان کے چہروں سے ہوائیاں اڑتے ہوئے دیکھ کر صابر نے پوچھا۔

''ریاض اور نذیر تبسم کو پولیس پکڑ کر لائی ہے''۔ نذیر انجم نے جواب دیا۔

''مگر کیوں''؟

''خان حمید دورے پر آیا ہوا تھا نا......''۔

''تو پھر''؟ انصاری بیچ میں بول پڑا۔

''اس کے آنے پر ریاض انقلابی نے اپنے ہوٹل پہ سیاہ جھنڈا لہرادیا۔ اس پر پولیس نے ان دونوں کو پکڑ لیا''۔ نذیر نے اپنا جواب مکمل کیا۔

''ان کی ایسی کی تیسی، چلو میں گیٹ کھولتا ہوں تم اندر آؤ تو بات کرتے ہیں''۔ صابر انہیں اندر لے آیا۔

''تم لوگ اتنی جلدی کالج کے لیے تیار ہو''؟ صابر نے پوچھا۔

نذیر انجم نے پانی کا گلاس پیا اور بولا ''یار میں نے تو رات بڑی مشکل سے گزاری ہے،

صبح ہوتے ہی اِن کو ساتھ لے کر یہاں آ گیا۔ کالج ٹائم تک انتظار کا حوصلہ نہ تھا''۔
صابر انہیں بٹھا کر ان کے لیے ناشتے کا بتانے چلا گیا۔
''تو اب کیا کریں''؟ نذیر نے پوچھا۔
''میرا تو دماغ خراب ہو گیا ہے بھئی۔ یہ کوئی بات ہے کہ کالا جھنڈا لہرانے پر تم لوگوں کو اس طرح ہراساں کرو؟ یہ اپنے آپ کو مغلوں اور ڈوگروں کا جانشین سمجھتے ہیں کہ جو چاہیں کریں۔ یہ تو نہیں ہونے دیں گے''۔ صابر غصے میں تلملا رہا تھا۔
''دراصل وہ ہمیں خوفزدہ کرنا چاہتے ہیں''۔ نذیر بولا۔
''ہم کیوں خوفزدہ ہونے لگے۔ خوفزدہ تو انہیں ہونا چاہیے جو اس ملک کے ساتھ غداری کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ ۱۸ سال سے یہ لوگ عوام کے ساتھ جھوٹ بول رہے ہیں۔ اب انہیں ڈر ہے کہ کہیں ان کا پردہ چاک نہ ہو جائے۔ سچ میں بڑی طاقت ہے دوستو، یہ جس کے دل و دماغ میں اتر جائے اسے دنیا کی کوئی دوسری طاقت نہیں ڈرا سکتی''۔
کالج پہنچ کر انہوں نے کلاسوں کا بائیکاٹ کر دیا اور حکومت کے اس عمل کے خلاف احتجاج کرنے لگے۔ بڑی تعداد میں طلبہ جمع ہو گئے انہوں نے احتجاجی جلوس نکالا، حکومت کے خلاف نعرے بازی کی اور خوب لتاڑا۔ شام کے وقت پولیس راٹھور، جاوید نظامی اور فاروق سہیل کو بھی پکڑ کر لے گئی۔ صبح خبر ملی کہ رات ان کی خوب پٹائی ہوئی۔ وہ دن چھٹی کے باعث خاموشی سے گزر گیا۔ رات کو صابر، نذیر انجم اور چند دیگر لڑکے جمع ہوئے اور انہوں نے ہاتھ سے پوسٹر اور ہینڈ بل لکھے۔ دوسرے دن جب انہوں نے کالج جا کر ہینڈ بل تقسیم کرنا شروع کیے تو کوئی بھی انہیں ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ کوئی اِدھر بھاگ رہا ہے، کوئی اُدھر۔ بہر حال صابر، کامریڈ مشتاق، نذیر انجم اور ان کے ساتھی جمع ہوئے تو انہوں نے جلوس نکالا۔ کچہری میں بھی ہینڈ بل تقسیم کیے اور جب ڈی سی آفس کے قریب پہنچے تو پولیس نے انہیں گرفتار کر لیا۔ دوسرے دن چھ لڑکوں، صابر، راٹھور، جاوید نظامی، فاروق سہیل، کامریڈ مشتاق اور ریاض انقلابی کو جہلم شفٹ کر دیا گیا۔ نذیر انجم اور اس کے دوسرے ساتھیوں کو گجرات بھیج دیا گیا۔

''دیکھو صابر تمہیں یاد ہے میں نے کہا تھا کہ آزاد کشمیر کی سطح تک تنظیم سازی کے حوالے سے جو رسپانس ہمیں مل رہا ہے یہ زبانی کلامی باتیں ہیں۔ عمل کے میدان میں ہمیں مایوسی کا سامنا ہوگا۔ وہ سب لوگ جو کنونشن تک ہمارے ساتھ تھے آج کدھر گئے؟ میں یہ نہیں کہتا کہ ہمیں یہ قدم نہیں اٹھانا چاہیے تھا لیکن مناسب وقت پر۔ نظامی کو یقیناً بولنے کا حق تھا۔' ہم جو چند متحرک لوگ تھے وہ اندر ہو گئے تو معاملہ ٹھپ ہو گیا۔ حکومت خوف و ہراس پھیلانے میں کامیاب ہو گئی ہے اور ہم اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ پائیں گے۔ اس تمام صورتحال کا ہمیں صرف اور صرف نقصان ہے''۔

''تمہاری بات سے میں نے پہلے بھی انکار نہیں کیا تھا اور اب بھی نہیں کرتا ہوں'۔ ریاض میلے سے بدبودار تکیے کو دور پھینکتے ہوئے بولا۔ 'لیکن کہیں نہ کہیں سے شروعات تو کرنا تھی۔ ہم نے آغاز کر دیا، دس بارہ لوگ ہم گرفتار ہوئے ہیں۔ کم سے کم ہمارے ذہن سے ہر قسم کا خوف تو جاتا رہے گا۔ ہماری تربیت شروع ہو چکی ہے آہستہ آہستہ اور لوگ بھی آتے جائیں گے۔ بارش کا پہلا قطرہ زمین پر پڑتے ہی بجھ جاتا ہے۔ مگر وہ باقیوں کو قربانی کی دعوت دے جاتا ہے۔ پھر ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ جل تھل جل تھل دھرتی پہ بارش کے قطرے کس قدر پر جوش برستے ہیں۔ خُوشی میں وہ پھُولے نہیں سماتے۔ پھر بنجر ویرانوں میں سبزہ اُگ آتا ہے۔ باغوں میں پھُول کھلتے ہیں۔ کھیت سیراب ہوتے ہیں فصلیں لہلہاتی ہیں۔ زمین ابھی بہت خشک ہے نظامی، اس کی پیاس بجھنے اور اس پر فصل تیار ہونے میں بڑا وقت لگے گا۔ ابراہیمؑ جب آتش نمرود میں کودے تھے تو ان کا ساتھ دینے والا کوئی نہ تھا۔ مگر بعد میں آنے والے سارے نبی ان کی نسل سے گزرے ہیں۔ اس لیے مایوسی کی کوئی بات نہیں''۔

''باتیں تو تم بہت خوبصورت کرتے ہو انقلابی''۔ راٹھور نے سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے کہا۔

''صرف باتیں ہی کرتا ہوں''؟ ریاض کے لہجے میں طنز تھی۔

''تمہارا کیا مطلب ہے باتیں کرنا کوئی معمولی کام ہے' راٹھور نے جواباً کہا' تمہاری باتوں نے ہی تو ہمیں مروایا ہے''۔

''ہمارا مرنا ہی ہمارے حق میں بہتر ہے''۔ ریاض نے کہا۔

''ٹھیک ہے مگر دیکھو کوئی دعا درود کرنے والا بھی ہو''۔ راٹھور نے سگریٹ کا راکھ جھاڑ دی۔

''ان کی فکر نہیں کرو'ریاض نے ہنستے ہوئے کہا' وہ پیدا ہو جائیں گے''۔

''پیو مرے پُتر جمے، کس کاری''؟ راٹھور کی بات پر قہقہہ لگا۔

''یار ریاض انقلابی، ایک بات تو بتاؤ''۔ جاوید نظامی بولا۔

''پوچھو''۔

''یہ تجھے کالا جھنڈا لگانے کا کیا خیال آیا''؟ نظامی نے سوال کیا۔

''تو تمہارا کیا خیال ہے میں اس کلموہی حکومت کا سُرخ جھنڈے سے استقبال کرتا''؟ ریاض نے کہا۔

''ٹھیک ہے تو پھر اب مزہ چکھو''۔ نظامی نے کہا۔

دو تین دن تک نہ تو وہ کھانا اچھی طرح کھا سکے نہ چائے پی سکے۔ کھانے کا ذائقہ ہی خراب نہ تھا بلکہ برتن بھی گندے تھے۔ چائے بالکل گدلے پانی کی جیسی تھی۔ پہلے تو پی ہی نہ جاتی اور پی لیں تو طبیعت خراب ہو جاتی۔

''یہ کھانا تو ہم سے نہیں کھایا جائے گا صابر''۔ نظامی نے کہا۔

''صابر تمہارے لیے گھر سے منگوائے گا صبر کرو''۔ صابر نے کہا۔

''کچھ سوچنا پڑے گا بھئی' راٹھور بولا' یہ کھانا تو ہم نہیں کھا سکتے''۔

''تو پھر کیا کریں''۔ ریاض نے پوچھا۔

''جیل سپرنٹنڈنت سے بات کرتے ہیں''۔ فاروق بولا۔

شام کو انہوں نے طے شدہ پروگرام کے تحت کھانا واپس کر دیا اور کہا کہ وہ جیل انتظامیہ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔ رات یونہی گزر گئی۔ صبح کا ناشتہ بھی انہوں نے واپس کر دیا مگر پھر بھی ان کی شکائت سننے کوئی نہ آیا۔ حتیٰ کہ دن بھی آ گیا مگر جیل انتظامیہ کی طرف سے کوئی نہ آیا۔ ان سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ رات سے کچھ نہیں کھایا تھا لیکن اب کھائیں بھی تو کیسے۔ کھانا واپس کر کے وہ کسی قدر پچھتا بھی رہے تھے۔ دن کا کھانا

لوٹانے کے بعد وہ اپنے بستروں پر لیٹ گئے۔ کوئی کسی سے بات نہیں کر رہا تھا، جیسے سب ایک دوسرے سے ناراض ہوں۔

''یہ بھوک بھی کیا ظالم چیز ہے، انسان کو ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ آدمی کتنی دیر بھوک برداشت کر سکتا ہے۔ دو دن، تین دن، پانچ دن...... خوراک کے انتظار اور امید میں شاید اس سے بھی زیادہ مگر کب تک؟ اور اگر دس دن تک اسے کچھ نہیں ملتا تو کیا کرے گا؟ اگر جنگل میں ہے تو کسی جانور کو مار کر کھائے گا۔ وہ نہ ہاتھ آئے تو درختوں کے پتے چبائے گا۔ اگر صحرا میں ہے تو جڑی بوٹیاں، مگر پیاس کی وجہ سے جلد ہی مر جائے گا۔ اور اگر شہر میں ہے تو؟

کمزور و ناتواں ہے تو بھیک مانگے گا، کچرے کے ڈھیر تلاش کرے گا۔ جو یہ نہ کر سکے چوری کرے گا۔ دوسری، تیسری، چوتھی، حتیٰ کہ اسے پیشہ بنا لے گا، پھر ایک نہ ایک دن پکڑا جائے گا۔ تھانے جیل کی ہوا، مار کھائے گا...... چور سے ڈاکو بنے گا، چند اور بھوکوں کو اپنے ساتھ ملائے گا۔ پولیس کو مار بھگائے گا یا اپنے ساتھ ملائے گا۔ یوں ڈاکوؤں کا ایک گروہ اور گروہ کا سرغنہ وجود میں آجائیں گے۔ پھر ایک دن پولیس مقابلے میں مارا جائے گا۔ اس کی خون آلود لاش کسی سڑک پر پڑی ہوگی اور پولیس اخبار والوں کے ذریعے اس کی تصویریں اتروا رہی ہوگی۔ دوسرے دن کے اخبارات میں ایس پی اس فتح کا جشن مناتے ہوئے نظر آئے گا۔ جبکہ دوسری طرف افسران کسی اور سرغنہ سے اپنا حصہ وصول کر رہے ہوں گے۔ پھر کچھ ہی عرصے کے بعد اُس سرغنہ کے بچے...... بھیک، کچرے کے ڈھیر، کسی امیر گھرانے، کسی ہوٹل کے برتن دھونے، یا چوری میں سے کسی ایک آپشن کو چن لیں گے''۔

راٹھور دونوں ہاتھ سر کے پیچھے باندھے نیم دراز لیٹا سوچ رہا تھا۔ وہ اٹھا اس نے تکیے کے نیچے سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی، سگریٹ سُلگایا اور کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ اس کی بھوک ختم ہو چکی تھی، آنکھیں بھیگ رہی تھیں اور ذہن سُلگ رہا تھا۔

''ایک دن کی بھوک پریشان کر دیتی ہے اور انسان غصے میں پاگل ہونے لگتا ہے۔ نسلوں کی بھوک کیا اثرات چھوڑتی ہوگی......! فقط پیٹ کے بارے میں سوچنا زندگی کی کتنی بڑی تذلیل ہے۔ اور جہاں یہ سوچ روگ بن جائے وہاں زندگی کس قدر خوفناک ہوتی ہوگی۔ نسلوں

سے غربت کا عذاب سہنے والے لوگ زندگی کو کس نظر سے دیکھتے ہوں گے؟ غریبوں سے دنیا کتنی نفرت کرتی ہے اور یہ بچارے معاشرے کے اندر سے اٹھنے والے نفرت کے انبار کو چپ چاپ ہضم کر جاتے ہیں۔ لیکن عجیب بات ہے کہ امیر لوگوں کے لیے ان کے دلوں میں نفرت نہیں پیدا ہوتی۔ شاید وہ اس سب کچھ کو اپنا مقدر سمجھ کر سہہ جاتے ہیں۔ کبھی انہوں نے سوچا ہوگا کہ وہ غریب کیوں ہیں؟ غربت ایک کوڑھ ہے جو انسان کی صلاحیتوں کو لگ جاتا ہے اور وہ گل سڑ کر گر جاتی ہیں۔ یہ کارخانوں میں چیزیں بناتے ہیں مگر خود انہیں خرید نہیں سکتے، سڑکیں بناتے ہیں مگر خود پیدل چلتے ہیں۔ غلے اور اناج کے ڈھیر پیدا کرتے ہیں مگر خود بھوکے رہتے ہیں۔ سکول اور کالج، یونیورسٹیاں بناتے ہیں مگر ان کی اولاد ان پڑھ رہتی ہے۔ اس غریب سے تو بیل گاڑی کا بیل اچھی حالت میں ہوتا ہے''۔

شام تک وہ غصے کے مارے کروٹیں بدلتے رہے۔

''جب تمہیں پتہ ہے کہ ہم کوئی چیز نہیں کھا پی رہے تو برتنوں کے ساتھ اپنا منہ اٹھائے کیوں ادھر آ جاتے ہو؟ دس منٹ کے اندر اپنے باپ کو ادھر بھیجو ورنہ ہمیں جو ملا اسے الٹا لٹکا دیں گے''۔ ریاض چائے والے سے الجھ گیا اور چائے کے برتن اٹھا کر پھینک دیے۔

کسی نے کوئی بات نہ کی۔ ساتھ والے کمرے سے چند لوگ اس طرف آ نکلے۔ وہ بھی سیاسی قیدی تھے۔ انہوں نے ماجرا سنا تو افسوس کیا اور کہا کہ ہمیں بتایا ہوتا تو یہ نوبت نہ آتی۔

جیل کے عملے کے تین چار آدمی دوڑتے ہوئے آئے اور آتے ہی ان سے الجھ پڑے۔ دوسرے کمرے والوں نے بیچ بچاؤ کروایا۔ وہ انہیں اپنے کمرے میں لے گئے اور سمجھایا۔

''بھئی یہ سب اسٹوڈنٹس ہیں اور سیاسی قیدی ہیں۔ تم لوگوں کا سلوک ان سے اچھا نہیں ہے۔ ان کے لیے بہتر کھانے، بستر اور تمام سہولتیں جو سیاسی قیدیوں کو ملتی ہیں ان کا فوری بندوبست کرو ورنہ تمہارے لیے مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں''۔

وہ واپس جانے لگے تو ریاض انقلابی نے انہیں آواز دی اور کہا۔

''ایک گھنٹے کے اندر اندر اگر جیل مینوئل کے مطابق سہولتیں نہ دی گئیں تو یاد رکھو ہمارے کالج کے ساتھی تمہارے جیل کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دیں گے''۔

ان تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کوئی جواب دیے بغیر روانہ ہو گئے۔

آدھے گھنٹے بعد ان کے کمرے کی صفائی شروع ہو گئی، تمام بستر چادریں ہر چیز تبدیل کر دی گئی اور ان کے لیے فروٹ لا کر رکھ دیا گیا۔ رات کا کھانا انہوں نے جیل کی میس میں کھایا اور انہیں بتایا گیا کہ وہ چاہیں تو یہاں آ کر کھائیں چاہیں تو کمرے میں منگوا لیں۔ اخبار، قرآن پاک، چند ایک رسالے انہیں مہیا کیے گئے۔ کپڑے وغیرہ دھونے اور دیگر کام کاج کے لیے مشقتی بھی دیے گئے۔ وہ سب کچھ دیکھ کر وہ خود بھی حیران تھے۔ جیل مینوئل کا انہوں نے فقط نام سن رکھا تھا، سیاسی قیدیوں کے حقوق کے بارے میں انہیں کچھ خاص معلومات نہ تھیں۔

''بھئی اگر ایسی ٹہل سیوا ہوتی رہے تو ہر تین ماہ بعد ادھر کا چکر لگانا چاہیے''۔ جاوید نظامی بولا۔

لیکن نظامی کی قسمت خراب نکلی چند دن بعد اس کا بڑا بھائی آ کر اسے لے گیا۔

جیل میں ان کے شب و روز بہت اچھے گزرے۔ وہ ایک ماہ وہاں رہے۔ ایک دن راٹھور اور صابر انصاری کو کہا گیا کہ وہ تیار ہو جائیں انہیں رہا کیا جا رہا ہے۔ اس دن ان کی باری نہیں تھی انہیں گرفتار ہوئے ۲۹ دن ہوئے تھے۔ جبکہ ریاض انقلابی اور فاروق سہیل کو ایک مہینہ ہو گیا تھا۔

فاروق سہیل بڑے غصے میں آیا اور کہنے لگا۔

''باری ہماری ہے تم لوگوں کو کیسے رہا کیا جا رہا ہے''؟

''یار اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔ ہم نہ تو اپنی مرضی سے آئے تھے نہ اپنی مرضی سے جا رہے ہیں''۔ صابر نے جواب دیا۔ ''ویسے میرے خیال میں یہ ہمیں رہا نہیں کر رہے۔ انہوں نے باہر جا کر کوئی اور ہی پنگا کرنا ہے''۔

صابر کی بات سچ ثابت ہوئی۔ جیل سے نکلے تو پھر پولیس کا سامنا تھا۔ میر پور پولیس کی گاڑی کھڑی تھی جس میں انہیں بٹھا دیا گیا۔ رات انہیں میر پور تھانے میں رکھا گیا اور دوسرے دن پتہ چلا کہ انہیں دلائی کیمپ بھیجا جا رہا ہے۔ دلائی کیمپ بدنامِ زمانہ عقوبت خانہ تھا۔ انہوں نے اس پر کوئی ردعمل نہیں کیا اور چپکے سے ان کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ دلائی کیمپ پہنچے تو ہتھکڑیوں سے نجات مل گئی۔ لیکن عجیب نئے ماحول میں طرح طرح کے خوف نے انہیں گھیر رکھا تھا۔ سونے پہ

سہا گا یہ کہ دونوں کو علیحدہ علیحدہ بند کر دیا گیا۔

جب ان کے دلائی کیمپ بھیجے جانے کی خبر شہر میں پھیلی تو ہنگامے شروع ہو گئے۔ اب کی بار لڑکوں نے بڑی ہمت کی، جلسے جلوس، نعرے بازی، پولیس کے ساتھ جھڑپیں اور لاٹھی چارج، مار کٹائی آئے روز کا معمول بن گیا۔ کافی دن تو لڑکے گرفتاریوں سے چھپتے بچتے رہے مگر بالآخر ایک ایک کر کے پکڑے گئے۔

''یہ حکومت کو کیا ہو گیا ہے چوہدری''؟ راجہ سرور نے چوہدری فضل سے پوچھا۔

چوہدری فضل نے حقے کا گہرا کش لگایا اور دھوئیں کے ساتھ بڑی ننگی گالی اگل کر خاموش ہو گیا۔

''پٹاخ'' راجہ سرور بڑی دیر سے اِس چوہے کی تاک میں تھا۔ اب کی بار جونہی وہ بوری کے سوراخ سے باہر نکلا اس کے دس نمبر کے چپل کا شکار ہو گیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ نالی کے کنارے پڑا ہوا تھا۔ دو بلیاں اس کی طرف لپک پڑیں۔

''دیکھو میں تمہارے علاقے میں نہیں آتی ہوں' دُبلی بلّی موٹی پر غرّائی 'تم اِدھر آ کر بدمعاشی نہ کرو''۔

''یہ تمہارے باپ کی جاگیر ہے کیا''؟ موٹی زیادہ زور سے چلاّئی۔

''تم اپنی طرف تو کسی کو پھٹکنے بھی نہیں دیتی اور دوسرے کے حق پر جھپٹ پڑتی ہو' دُبلی بلّی غصے میں آ گئی 'یہ حرام کھانا چھوڑ دو''۔

''حرام کھاتے ہوں گے تمہارے پچھلے''۔ موٹی نے جواب دیا۔

''میرے پچھلوں کا نام نہیں لو ورنہ زبان کھینچ لوں گی''۔ دُبلی نے کہا۔

''جا جا اپنی شکل دیکھ زبان کھینچنے والی' موٹی نے بڑھک لگائی 'ایک تھپڑ دوں گی تو منہ پھیر کے رکھ دوں گی''۔

''آؤ نا ذرا آگے آ کے تو دکھاؤ آج' دُبلی نے آستینیں اوپر کر لیں 'کمزور سمجھ کے تم سر پہ چڑھ گئی ہو۔ بتّیس کے بتّیس دانت توڑ کے رکھ دوں گی''۔

اتنے میں ایک کالا بلاّ ادھر آ نکلا اس نے دور کھڑے ہو کر صورتحال کا جائزہ لیا اور پھر

چوہے کو اٹھا کر ایک طرف چل دیا۔ جبکہ دونوں بلیاں ایک دوسری کا منہ دیکھتی رہ گئیں۔

''اوراجیا تیری دکان کی طرح اس حکومت کو بھی چوہے لگ گئے ہیں''۔ چوہدری فضل نے قہقہہ لگایا۔

''پتہ نہیں ان بچوں کے ساتھ خان حمید نے کیوں پنگا لے لیا ہے' سرور نے کہا' میرا تو کبھی کبھی دماغ بالکل ہی گھوم جاتا ہے''۔

''تمہارا کبھی کبھی گھومتا ہے، میرا تو ہر وقت گھوما ہی رہتا ہے' چوہدری فضل نے حقے کا گہرا کش لگایا' ابھی دیکھو! ایک مہینہ انہیں پنجاب کی جیلوں میں بند کیے رکھا۔ اب دلائی کیمپ بھیج دیا۔ کوئی پوچھے تو اس سے کہ تمہارا بگاڑا کیا ہے ان لڑکوں نے؟ کوئی قصور تو بتاؤ ان کا۔ کوئی حد ہوتی ہے بدمعاشی کی''۔

''مگر پوچھے کون فضل حسین، سب کے سب ملے ہوئے ہیں''۔ سرور نے کہا۔

''اسی لیے تو میرا خون کھولتا ہے نا، ملے ہوئے نہ ہوں تو اس کی جرأت تھی یہاں سے لڑکے اٹھا کر لے جانے کی۔ اور ابھی دیکھو ہفتے بھر سے کالج کے لڑکوں کے ساتھ پولیس نے کیا تماشہ لگا رکھا ہے''۔ فضل حسین سارا غصہ حقے کے ذریعے اپنے آپ پر نکال رہا تھا۔

''اور کتنوں کو پکڑ کر بند کر دیا ہے، شہر کا نظام بھی درہم برہم کر کے رکھ دیا ہے''۔

میر پور سے مظفر آباد تک ہتھکڑیوں سمیت سفر کرنا بڑا تکلیف دہ تھا۔ وہ راستے میں جہاں کہیں بھی رکتے لوگ انہیں دیکھ کر نفرت کا اظہار کرتے۔ اُس دور میں ''سیاسی قیدی'' کی اصطلاح عام نہیں ہوئی تھی۔ لوگ ہر قیدی کو ملزم بھی نہیں مجرم تصور کرتے تھے۔ اگر لوگ اس اصطلاح سے واقف ہوتے بھی تو کون سا ان کے ماتھے پہ سیاسی قیدی کی پٹی لکھی ہوئی تھی۔ دو تین جگہ ہوٹل پر رکنے کے بعد انہیں اپنے آپ پر افسوس ہو رہا تھا۔ وہ بالکل بھول چکے تھے کہ انہیں کس جرم کی پاداش میں ہتھکڑیاں پہنائی گئی ہیں۔ ایک بزرگ کی شفقت نے انہیں رُلا ہی دیا تھا۔ چائے پیتے ہوئے ساتھ والی میز سے اُٹھ کر آئے اور راٹھور کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

''کیا کیا ہے پُتر''؟

راٹھور نے بے بسی سے صابر کی طرف دیکھا۔ ''چوری کی ہے بابا''! اس کی بے بسی

بڈھے کا منہ چڑا رہی تھی۔

''کوئی بات نہیں ہے بیٹا، سچے دل سے توبہ کرلو اللہ بڑا معاف کرنے والا ہے''۔

بزرگ نے پولیس والوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کس کی چوری کی ہے پتر''؟ بابا نے ایک اور پتھر مارا۔

''حکومت میں بیٹھے ہوئے ڈاکوؤں کی''۔راٹھور نے جواب دیا۔

راٹھور نے ٹھیک ہی کہا تھا، وہ سیاستدانوں کے راز چوری کر کہ لوگوں کو بیچ رہے تھے۔

''فضول باتیں نہیں کرو، چلو اٹھو''۔کانسٹیبل چائے کا آخری گھونٹ انڈیلتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

''بیٹھ جاؤ......''۔راٹھور ہتھکڑی والا ہاتھ میز پر مارتے ہوئے چلایا۔

اس کی آنکھیں غصے سے سُرخ ہو رہی تھیں۔اُس نے سگریٹ سلگایا اور دھواں دھواں ہو گیا۔

دلائی کیمپ کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں پہنچ کر خوش ہوا جائے۔مگر ہتھکڑیاں کھلنے پر انہوں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔یہاں کے حالات بہت خراب تھے۔دونوں کو الگ الگ بند کر دیا گیا تھا اور انہیں ایک دوسرے کی کوئی خبر نہ تھی۔انہیں سخت ذہنی اذیت سے دوچار رکھا گیا۔رفع حاجت کے لیے انہیں جیل کے احاطے سے باہر لے جایا جاتا اور پانی نہ دیا جاتا۔پینے کے لیے جو پانی انہیں ملتا اس سے ہاتھ دھو لیتے۔یہ چیز ان کے لیے بہت اذیت کا باعث تھی۔ایک دن عملے کے دو آدمی اور ایک فوٹو گرافر آئے۔ایک کے ہاتھ میں سلیٹ تھا جس پر اس نے نمبر لکھا اور صابر کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

''آپ اسے اپنے گلے میں ڈال دیں''۔

''ہیں! سلیٹ گلے میں ڈال لوں''؟ صابر نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں جی ہاں، بس یہ فوٹو اتارنے کے لیے ہے''۔اس نے کہا ''اس سلیٹ پر نمبر لگا ہوا ہے''۔

اس کے بعد تفتیش شروع ہوگئی۔

مرزا نام کا ایک انسپکٹر تھا جس کا تعلق پاکستان سے تھا اور بڑا سخت گیر افسر تھا۔ایک دن

صابر کو بلا لیا۔ وہ ایک کمرے میں چھوٹی سی میز کے پیچھے لکڑی کی کرسی پر اکڑ کر بیٹھا ہوا تھا۔ صابر کمرے میں داخل ہوا تو اس نے کہا

''نیچے بیٹھ جاؤ''۔

صابر کو نیچے بیٹھنا گوارا نہ ہوا جس پر انسپکٹر چڑ گیا اور اس نے صابر کو لتاڑنا شروع کر دیا۔

''تم لوگ کون ہو بھئی۔ تمہاری کیا اوقات ہے؟ کیا حیثیت ہے تم لوگوں کی؟ کھاتے ہمارا ہو اور باتیں خودمختاری کی کرتے ہو۔ خودمختار ہو کہ کھاؤ گے کیا۔ کبھی سوچا بھی ہے......''؟

انسپکٹر نے ایک لمبی تقریر جھاڑی جسے صابر نے خاموشی سے سننے کے بعد دریا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ جو لکڑی کی گیلیاں جا رہی ہیں ان کی آمدن ہی ہمارے لیے کافی ہے''۔

''حساب لگا لو' انسپکٹر نے کہا' روزانہ کتنی گیلیاں جاتی ہوں گی''۔

''تم ہی بتاؤ'' صابر نے کہا۔

''یہی کوئی ڈھائی تین سو تک ہوں گی''۔ انسپکٹر بولا۔

فی گیلی ۲۰۰ روپیہ قیمت ٹھہری۔ ایک دن پھر ایک مہینہ پھر ایک سال کا حساب لگایا تو یہ ۲ کروڑ ۱۹ لاکھ روپیہ بنا۔

''اب پچھلے ۱۹ سال کا حساب لگاؤ' صابر نے کہا' جو ہمارا بنتا ہے ہمیں دو اور جو ہمیں دیا ہے اس میں سے کاٹ لو''۔

انسپکٹر اس حساب سے سٹپٹا گیا۔ ''یہ تم نے کیسا حساب لگایا ہے''۔

''یہ تو بالکل سیدھا حساب ہے اور صرف لکڑی کی ان گیلیوں کا ہے' صابر بولا' ساری لوٹ کھسوٹ کا ہو تو تمہارے ہوش ٹھکانے آ جائیں''۔

انسپکٹر صابر سے خاصا الجھ گیا اور اسے برا بھلا کہا۔ صابر نے بھی نتائج کی پرواہ کیے بغیر اسے خوب کھری کھری سنائیں۔

''اس وقت میں تم لوگوں کے قبضے میں ہوں جو مرضی سلوک کرو۔ چاہے ٹانگیں توڑ دو، مار کہ دریا میں بہا دو۔ لیکن یہاں سے زندہ نکلا تو شہید چوک میں جا کر خودمختاری کا نعرہ ہی

لگاؤں گا''۔

''تم ایک نمبر کے بدمعاش ہو، میں تمہاری ہڈی پسلی ایک کر کے رکھ دوں گا' انسپکٹر نے کہا 'چلو اب جاؤ اور اگر خیر چاہتے ہو تو اپنی زبان بند رکھو''۔

دوسرے دن انسپکٹر نے راٹھور کو بلا لیا۔

''یہ تم نے کیا خود مختاری خود مختاری لگا رکھی ہے''۔ راٹھور کے کمرے میں داخل ہوتے ہی انسپکٹر نے سوال کر دیا۔

راٹھور نے ادھر ادھر نظر دوڑائی لیکن اسے بیٹھنے کے لیے کوئی جگہ نظر نہ آئی۔ اس نے سگریٹ سلگایا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

''تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا''۔ انسپکٹر نے غصے میں کہا۔

''تمہاری کسی بات کا جواب دینا میرے اوپر فرض، یا واجب تو نہیں ہے'' راٹھور نے جواب دیا۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم سیدھے طریقے سے بات نہیں کرو گے''؟ انسپکٹر نے رعب دار آواز میں کہا۔

راٹھور کھڑکی کے پاس کھڑا نیچے دریا کی جانب دیکھ رہا تھا۔ وہ مڑا اور انسپکٹر کے پاس آ کر کھڑا ہوا اور کہا۔

''دیکھو مرزا ایک بات کا خیال رکھو کہ یہ تھانہ نہیں جیل ہے اور میں نے جیل کے کسی قانون کی خلاف ورزی نہیں کی جو تم اس لہجے میں بات کرو''۔

انسپکٹر کا رنگ فق ہو گیا مگر وہ خاموش رہا۔

''دوسری بات یہ ذہن نشین کر لو کہ تم سے ڈرتے ہوں گے چور، اُچکّے اور لفنگے، جنہیں کوئی ضمانت دینے والا بھی نہیں ملتا۔ ہم کوئی لاوارث لوگ نہیں ہیں۔ ہماری پُشت پہ پورے آزاد کشمیر کے سٹوڈنٹس ہیں جن سے ابھی تک تمہارا واسطہ نہیں پڑا'۔ راٹھور نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ 'تم اگر یہ سمجھتے ہو کہ ہم ان گرفتاریوں اور قید و بند سے گھبرا جائیں گے تو یہ تمہاری خام خیالی ہے۔ ہم نہ پاکستان سے ڈرتے ہیں، انڈیا سے نہ ان کے پالتو کشمیری حکمرانوں سے۔

ہمارے ٹکڑے ٹکڑے کردو تمہیں ہر ٹکڑے سے آزادی آزادی کی صدا آئے گی۔ ہم ہزاروں سالہ تاریخ، تہذیب اور ثقافت کے وارث ہیں۔ تم اسے ہم سے نہیں چھین سکتے۔ یاد رکھو دنیا کی کوئی طاقت کشمیریوں کو ان کی آزادی کی جدو جہد سے باز نہیں رکھ سکتی۔ ہمیں تقسیم کر کے غلامی کے اندھیروں میں جھونک رہے ہو تو یاد رکھو تمہیں بھی روشنی نہیں ملے گی، راستہ نہیں ملے گا۔ تم کشمیریوں کو غلام رکھ کر اپنی نسلوں کی قبریں کھود رہے ہو"۔

"بکواس بند کرو"۔ انسپکٹر چلاّیا۔

"یہ بکواس نہیں وہ سچ ہے جسے سننے کا تم میں حوصلہ نہیں۔ تم ظالم ہو اور خدا ظالموں کی ہرگز مدد نہیں کرتا بلکہ انہیں عبرت کا نشان بنا کر رکھ دیتا ہے'۔ راٹھور کی آواز پورے کمرے میں گونج رہی تھی۔ 'تم جاہل مطلق ہو اور برصغیر کی تقسیم کا مطالبہ تمہاری جہالت کی دلالی کرتا ہے۔ جس نظریے کی بنیاد پر تم نے ہندوستان کو تقسیم کیا ہے وہ نظریہ انسانوں کو تقسیم کرنے اور ان کے درمیان نفرتیں پھیلانے کے حق میں ہرگز نہیں ہے۔ یہ نظریہ ساری انسانیت کے لیے ہے کسی مخصوص گروہ، علاقے اور ملک کے لیے نہیں ہے۔ تم نے اسے محدود اور محصور کرنے کی ناپاک کوشش کی ہے۔ یاد رکھو تمہیں اس جرم کی سزا ضرور ملے گی۔ تم کہ جن کی گردنوں پر لاکھو ں انسانوں کا خون ہے، تم سے ہمیں کوئی توقع نہیں۔ بچھڑے ہوئے کشمیری خاندانوں سے تمہیں کیا ہمدردی ہو سکتی ہے۔ تمہیں زمین چاہیے اور اس زمین کے وسائل، اس زمین پر بسنے والوں سے تمہیں کوئی دلچسپی نہیں، کوئی سروکار نہیں۔ یہ غیر انسانی رویہ تمہیں دن بدن انسانیت سے دور لے جائے گا۔ اور ایک وقت ایسا آئے گا کہ تم اپنی ہی زمین پر خود کو اجنبی پاؤ گے۔ نفرتوں اور عداوتوں کا جو جنگل تم اگا رہے ہو اس میں تمہاری شناخت ختم ہو کر رہ جائے گی۔ ہم اپنے وطن کی آزادی چاہتے ہیں، ہمارے راستے میں حائل ہونا ہرگز تمہارے مفاد میں نہیں۔ تم اپنا راستہ دیکھ کر چلو، ہمیں راستے سے ہٹاتے ہٹاتے خود بھٹک جاؤ گے۔ اور ہاں مجھے دوبارہ بلانے کی زحمت نہ کرنا"۔

راٹھور نے بات ختم کی اور کمرے سے نکل گیا۔

تقریباً پندرہ دن بعد ان پر عائد پابندیوں میں نرمی کی گئی۔ پہلی بار صابر اور راٹھور آپس میں ملے۔ اب انہیں نہانے کے لیے دریا پر لے جایا جاتا۔ کھانا انہیں فوجی میس سے ملتا تھا جس

کے ۱۶/۱۷ روپے مہینے کے آتے تھے اور دوسری میس سے اچھا تھا جس کا مہینے کا خرچ ۱۲/۱۱ روپے تھا۔ بہر حال دلائی کیمپ میں ان کے تین مہینے پورے ہونے کے بعد انہیں مظفرآباد بھیج دیا گیا جہاں سے انہیں رہا کیا جانا تھا۔ جب انہیں رہا کرنے کے لیے باہر نکالا گیا تو ایک کاغذ ہاتھ میں تھما دیا گیا کہ اس پر دستخط کرو۔

''یہ کیا ہے''؟ راٹھور نے پوچھا۔

''تم لوگوں پر تین ماہ تک اپنے اپنے اضلاع سے باہر جانے پر پابندی عائد کر دی گئی ہے۔ یہ اقرار نامہ ہے تمہیں اس پر دستخط کرنا ہوں گے''۔ انہیں بتایا گیا۔

انہوں نے اس کاغذ پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ اہلکاروں سے کافی تلخی ہوئی مگر وہ دستخط کرنے پر راضی نہ ہوئے۔ حتیٰ کہ ان کی رہائی کا معاملہ کھٹائی میں پڑتا نظر آنے لگا۔ بالآخر راٹھور نے کہا۔

''یار انصاری بندے کے پتر بنو، میری بے مر جائے گی۔ چار مہینے ہو گئے اور کتنی جیل کاٹیں گے''۔

''ٹھیک ہے میں دستخط تو کر دوں گا مگر ساتھ ہی یہ نوٹ بھی لکھ دوں گا کہ میں نے حکومت کا یہ آرڈر پڑھ لیا ہے اس کی تعمیل کروں یا نہ کروں یہ میری مرضی ہے''۔ صابر نے کہا

بہر حال اہلکار بھی اس بحث مباحثے سے تنگ آ چکے تھے، ان کے دستخط لے کر انہیں روانہ کر دیا گیا۔

وہ راولاکوٹ تک اکٹھے آئے۔ وہاں سے راٹھور کو پلنگی اور صابر کو میرپور بھیج دیا گیا۔

میرپور میں صابر کو ایس پی کے حوالے کر کے حکم نامہ دیا گیا۔

ایس پی قاضی بشیر تھا۔ صابر کو دیکھ کر کہا۔

''کوئی آرام آیا ہے''؟

''تم نے تو حوالداری کے پھول لگوا لیے ہیں' صابر نے کہا' میرا کچھ بھی نہیں گیا''۔ صابر نے جواب دیا۔

''تم اور تمہارا چچا دونوں ہی پاگل ہو' ایس پی نے جواب دیا' چل دفع ہو جا''۔

صابر اور راٹھور کے درمیان یہ طے ہوا تھا کہ وہ گھر جائیں گے بے سے ملیں گے اور اس کے بعد اس حکم کی خلاف ورزی کریں گے۔ لیکن راٹھور کو شاید بے نے گھر سے نکلنے نہیں دیا۔ دوسری طرف صابر بھی ایل ایل بی کے ایڈمیشن میں ڈھائی ماہ لیٹ ہو چکا تھا۔ وہ داخلہ کے لیے لاہور گیا لیکن وہاں داخلہ نہ ہو سکا جس کے باعث اسے کراچی جانا پڑا۔



آج کے سٹڈی سرکل میں لڑکوں نے نذیر انجم کو مدعو کر رکھا تھا۔ نذیر طے شدہ وقت پر پہنچ گیا لیکن لڑکے ابھی لیٹ تھے۔ بہر حال آدھے گھنٹے میں تقریباً ۵۰/۶۰ طلبہ جمع ہو گئے۔ اس نے مزید وقت ضائع کیے بغیر اپنی بات شروع کر دی۔

''دوستو یہ میرے لیے بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ اپنی نصابی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ اس طرح کی تربیتی نشستوں کا اہتمام کر رہے ہیں۔ میں آج کی نشست میں ریاست کے پاکستان کے ساتھ الحاق کے حوالے سے بات کروں گا۔ انتہائی افسوس کی بات ہے کہ ہمیں جو پڑھایا یا سُنایا جا رہا ہے وہ سراسر جھوٹ ہے۔ جس قوم کی لیڈر شپ جھوٹ پر اتر آئے خود اندازہ کیجیے کہ اس کا مستقبل کیا ہو گا۔ قیامت تک اندھیروں سے نہیں نکل سکتی۔ لیکن اگر ہم چاہیں تو بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ ہمارے اوپر بڑی ذمہ داری ہے۔ ہمیں اپنے نصاب سے ہٹ کر اپنی تاریخ کو کھنگالنا پڑے گا اور پھر قوم کو بھی حقائق سے آگاہ کرنا ہو گا۔

آج کی اس نشست میں ہم زیادہ پیچھے نہیں جائیں گے۔ بات ۱۹۴۷ء سے شروع کرتے ہیں جہاں سے جھوٹ کا آغاز ہوا۔ ۱۹۴۷ء میں مہاراجہ ہری سنگھ اور مسلم کانفرنس میں سمجھوتہ طے پا گیا تھا۔ یہ سمجھوتہ ریاست بھوپال کے حکمران نواب حمید اللہ خان نے کروایا تھا۔ بھوپال کا حکمران مسلمان تھا۔ وہ مہاراجہ ہری سنگھ کا دوست تھا اور دونوں برطانیہ میں اکٹھے پڑھتے تھے۔ سمجھوتہ یہ ہوا تھا کہ ریاست جموں کشمیر آزاد اور خود مختار رہے گی۔ مہاراجہ ملکہ برطانیہ کی طرح برائے نام بادشاہ ہو گا اور اس کے پاس حکومت کا کوئی خاص اختیار نہ ہو گا۔ وہ محض علامتی سربراہ ہو گا اور اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کے حوالے کر دیا جائے گا۔ جب یہ سمجھوتا طے پایا اس وقت چوہدری غلام عباس جموں جیل میں تھے۔ مسلم کانفرنس کے قائمقام صدر چوہدری حمید اللہ تھے جو اسمبلی کے ممبر بھی تھے۔ چوہدری حمید اللہ نے اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔

''ہم نے ریاست جموں کشمیر کو پاکستان اور بھارت دونوں سے الگ رکھنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ہمیں کچھ ایسی اطلاعات مل رہی ہیں کہ پاکستان کی طرف سے کشمیر پر حملہ ہونے والا ہے۔ اگر پاکستان نے حملہ کیا تو حمید اللہ اپنی تلوار کے ساتھ خود پاکستان کے خلاف جنگ لڑے گا''۔

اب آپ دیکھیں کہ یہ مسلم کانفرنس والے کل کیا کہتے تھے اور آج کیا کہہ رہے ہیں۔

اس کے بعد چوہدری حمید اللہ نے مسلم کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے ۲۸ مئی ۱۹۴۷ء کو جموں کے ایک ہوٹل میں پریس کانفرنس کی تھی۔ یہ پریس کانفرنس اس وقت کے اخبارات میں چھپی ہوئی ہے۔ میں انہی کے الفاظ آپ کو سناتا ہوں۔

''ہندوستان کے ساتھ الحاق کرنے سے مسلمانوں میں بے چینی پھیلے گی اور پاکستان کے ساتھ الحاق ہندوؤں کو ناگوار گزرے گا۔ اس لیے ہم نے جو بہترین فیصلہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ ہم ریاست کو انڈیا اور پاکستان دونوں سے علیحدہ رکھنا چاہتے ہیں۔ ہمارا فائدہ اسی میں ہے کہ ہم دونوں سے علیحدہ رہیں۔ دونوں میں سے کسی ایک کے ساتھ الحاق ایک طرح کی غلامی ہی ہو گی۔ ہم دونوں کے ساتھ مساوی تعلقات رکھنا چاہتے ہیں اور دونوں میں سے کسی ایک کو بھی اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیں گے۔ ہم نے کشمیر چھوڑ دو کی تحریک میں شیخ عبداللہ کا ساتھ اسی لیے نہیں دیا تھا کہ ہم اس وقت بھی مہاراجہ کے وفادار تھے اور آج بھی ہم مہاراجہ کے وفادار ہیں۔ خودمختاری مسلم کانفرنس کی آفیشل پالیسی ہے۔ ایک ماہ کے اندر مسلم کانفرنس کی مجلسِ عاملہ کا اجلاس بلایا جائے گا جس میں اس کی منظوری حاصل کر لی جائے گی۔''

اس پریس کانفرنس کے چھ ہفتے بعد ۱۸ جولائی ۱۹۴۷ء کو مسلم کانفرنس کی مجلسِ عاملہ کا اجلاس بلایا گیا۔ اس اجلاس میں مجلسِ عاملہ نے متفقہ طور پر خودمختار کشمیر کی قرارداد منظور کر لی۔ مسلم کانفرنس کے آئین میں ہے کہ مجلس عاملہ کے فیصلے کی توثیق جنرل کونسل سے کرائی جاتی ہے۔ ۱۹ جولائی کو جنرل کونسل کا اجلاس بھی بلایا جا چکا تھا لیکن یہ اجلاس نہ ہو سکا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ چند روز پہلے مسلم کانفرنس نے ریاست میں ہڑتالیں اور ہنگامے وغیرہ کیے اور دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کی تھی۔ جس کے باعث مسلم کانفرنس قیادت کے وارنٹ گرفتاری پہلے ہی جاری ہو چکے

تھے۔اس طرح جنرل کونسل کے اکثر ممبران یا تو گرفتار ہو گئے تھے یا پھر گرفتاری سے بچنے کے لیے رُوپوش ہو چکے تھے۔ ۲۰۰ ممبران جنرل کونسل میں سے صرف ۱۰ یا ۱۲ ممبران سری نگر پہنچے۔ یوں کورم پورا نہ ہونے کی وجہ سے اجلاس آئینی طور پہ ہو ہی نہیں سکتا تھا اس لیے مسلم کانفرنس کے جنرل سیکریٹری پروفیسر اسحاق قریشی نے ۱۹ جولائی والا اجلاس منسوخ کر دیا تھا اور اس تاریخ کو کوئی اجلاس سرے سے ہوا ہی نہیں۔ پروفیسر اسحاق قریشی خود کہتے ہیں کہ:

''۱۹ جولائی کو ۲۰۰ ممبران میں سے درجن بھر ہی پہنچ سکے تھے۔ اس لیے کورم پورا نہ ہونے کی وجہ سے اجلاس منسوخ کر دیا گیا تھا۔اور اگر اجلاس ہو بھی جاتا تو جنرل کونسل نے ۱۸ جولائی کو پاس ہونے والی قرارداد کی توثیق کرنی تھی۔الحاق کی قرارداد تو ایجنڈے پر تھی ہی نہیں۔ آزاد کشمیر کے لیڈر جو کہہ رہے ہیں کہ ۱۹ جولائی کو سردار ابراہیم صاحب کے گھر الحاق پاکستان کی قرارداد پاس ہوئی ہے یہ بالکل جھوٹ ہے۔ایسا کوئی اجلاس نہیں ہوا۔ جو ۱۰/۱۲ آدمی آئے تھے، سردار صاحب نے انہیں چائے پلائی تھی۔سردار ابراہیم صاحب کی رہائش گاہ اتنی چھوٹی تھی کہ وہاں پر زیادہ لوگوں کے بیٹھنے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔انہوں نے وہاں ایک ہاؤس بوٹ میں دو کیبن کرائے پر لیے ہوئے تھے۔ایک میں ان کی فیملی اور دوسرے میں وہ خود رہتے تھے۔نہ وہاں کوئی برآمدہ تھا نہ صحن ۔۱۹ جولائی کو ہم نے وہاں چائے پی ، گپ شپ کی اور چلے آئے۔ It was a private gup shap ۔نہ یہاں پر کوئی اجلاس ہوا، نہ فیصلہ''۔

سردار ابراہیم صاحب نے اس سلسلے میں 'متاعِ زندگی' میں بھی کوئی ذکر نہیں کیا۔

پروفیسر اسحاق قریشی جموں کے رہنے والے تھے۔ پرنس آف ویلز کالج جموں میں انگریزی کے پروفیسر رہے اور ۱۹۴۷ء میں مسلم کانفرنس کے مرکزی جنرل سیکریٹری تھے۔ وہ کے ایچ خورشید کے بہنوئی تھے۔انہوں نے کہا کہ ۱۰ جولائی ۱۹۴۷ء کو قائدِ اعظم نے انہیں اور مسلم کانفرنس کے صدر کو دہلی بلایا۔اس وقت قائدِ اعظم پاکستان کے گورنر جنرل نامزد ہو چکے تھے لیکن ابھی حلف نہیں ہوا تھا۔قائدِ اعظم نے انہیں اپنے چیمبر میں بٹھایا اور کہا کہ

''میں نے تم دونوں کو اس لیے بلایا ہے کہ پاکستان بننے والا ہے۔ پاکستان کے شمال

میں چین اور روس ہیں۔ اِدھر سے ہمیں ہمیشہ خطرہ رہے گا۔اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ ریاست جموں کشمیر خودمختار ملک کے طور پر continue کرے۔اس طرح ایک بفر سٹیٹ بیچ میں آ جائے گی اور یوں شمال کی طرف سے پاکستان کی سرحدیں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائیں گی۔میرا تم مسلم کانفرنس والوں کو مشورہ ہے کہ تم لوگوں کو مہاراجہ کا ساتھ دینا چاہیے اور اس کی سپورٹ کرنی چاہیے۔مہاراجہ کے ساتھ میرا ایک مشترکہ دوست (ریاست بھوپال کا حکمران) کے ذریعے رابطہ ہے۔مہاراجہ خود بھی خودمختاری چاہتا ہے اور ہم بھی یہی چاہتے ہیں''۔

چوہدری محمد علی نے اپنی کتاب Emergence of Pakistan میں لکھا ہے کہ میں اس وقت قائدِ اعظم کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔مسلم کانفرنس کے وفد نے قائدِ اعظم سے الحاق کی بات کی تو قائدِ اعظم نے انہیں جھاڑ پلا دی۔

(پروفیسر اسحاق قریشی نے ۱۲ مارچ ۱۹۹۳ء کو ڈان اخبار کو ایک انٹرویو دیا تھا جس میں ان تمام باتوں کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے)

نذیر کی بات ختم ہونے پر سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا۔

سوال: آپ کے بقول قائدِ اعظم کی خواہش تھی کہ کشمیر خودمختار ریاست رہے۔جبکہ انہوں نے کشمیر کو پاکستان کی شہ رگ قرار دیا ہے۔اس سلسلے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

جواب: آپ نے بہت اچھا سوال کیا ہے۔پہلی بات تو یہ ہے کہ قائدِ اعظم کی خواہش ہی نہیں انہوں نے کوشش بھی کی کہ کشمیر ایک الگ ملک کے طور پر قائم رہے۔جیسے اس سے پہلے ذکر ہوا،قائدِ اعظم نے خود بتایا کہ مہاراجہ کے ساتھ بھوپال کے حکمران کے ذریعے رابطہ ہے۔تو یہ رابطہ انہوں نے مہاراجہ کے ساتھ رشتہ داری کرنے کے لیے نہیں کیا تھا۔پھر انہوں نے مسلم کانفرنس کے صدر اور سیکریٹری جنرل کو بلا کر باقاعدہ ہدائت کی کہ وہ اس سلسلے میں مہاراجہ کا ساتھ دیں۔ان تمام باتوں کے حوالے موجود ہیں۔پروفیسر اسحاق قریشی سے اس بارے میں تصدیق لی جا سکتی ہے۔آپ جائیں کوٹلی میں جا کر سکندر حیات صاحب کے والد سردار فتح محمد کریلوی صاحب سے پوچھ لیں کہ کیا اس وقت کی نمایاں سیاسی شخصیات خودمختار کشمیر کے معاملے میں

مہاراجہ کے ساتھ نہ تھیں۔ آپ پونچھ کے لوگوں سے پوچھ لیں بابائے پونچھ کرنل خان محمد خان آخری وقت تک مہاراجہ کے خلاف لڑائی کے لیے آمادہ نہ تھے۔ اس کی کیا وجہ تھی؟ کیپٹن حسین خان شہید سے ان کا اختلاف کس بات پر تھا؟ لیکن چونکہ ڈوگرا دور کے ستائے ہوئے لوگ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہو گئے تھے اور وہ کسی قیمت پر مہاراجہ کی بات سننے کو تیار نہیں تھے اس لیے مجبوراً خان صاحب نے مہاراجہ کے خلاف ہتھیار اٹھائے۔ وہ ۱۹۳۴ء سے ۱۹۴۶ء تک کشمیر اسمبلی میں تحصیل باغ اور سدھنوتی کی نمائندگی کرتے رہے۔ ۱۹۴۶ء میں انہوں نے سردار ابراہیم صاحب کو اپنی جگہ منتخب کروایا تھا۔ جہاں تک شہ رگ والی بات کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں ہم پاکستان کی اسٹبلشمنٹ سے یہ سوال کرتے ہیں کہ ہمیں یہ بتایا جائے کہ قائدِ اعظم نے یہ بات کب اور کس موقع پر کہی۔ کوئی اخباری بیان، کوئی تقریر، کوئی پریس کانفرنس کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ بات خواہ مخواہ قائدِ اعظم کے کھاتے میں ڈال دی گئی ہے اس کا کوئی حوالہ، کوئی ثبوت ان کے پاس نہیں ہے۔ ہم انہیں چیلنج کرتے ہیں لیکن وہ مہیا نہیں کر سکتے''۔

سوال: ''کیا ۱۹۴۷ء کے بعد ہم بہتر پوزیشن میں نہیں ہیں؟ ہماری ایک حکومت ہے، صدر ہے الگ جھنڈا ہے۔ سب کچھ تو ہے ہمارے پاس''۔

جواب: نذیر تبسّم نے زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا ''میرے دوست یہی تو ہمارا المیہ ہے کہ ہمیں نہ تو ۱۹۴۷ء سے پہلے کی اپنی حیثیت کا پتہ ہے نہ اُس کے بعد کی ہی ہمیں خبر ہے کہ ہمارے ساتھ کتنا بڑا دھوکہ ہوا ہے اور مسلسل ہو رہا ہے۔ ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۶۴ء تک نہ تو یہاں پر اسمبلی تھی نہ لوگوں کو ووٹ کا حق تھا۔ حکومت پاکستان مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ کے کسی ممبر کو آزاد کشمیر کا صدر نامزد کر دیتی تھی اور وہ مظفر آباد پہنچ کر اپنا چارج سنبھال لیتا تھا۔ پھر جب وہ چاہتے اسے ہٹا کر کسی اور کو لے آتے۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ ان کے سامنے اعتراض کر سکے۔ ایک مرتبہ ۱۹۵۵ء میں ایف سی اور پی سی کے ذریعے آزاد کشمیر پر چڑھائی کی گئی۔ اس کے بعد پاکستان کی طرف سے ہونے والی تقریریوں پر کسی نے احتجاج نہیں کیا۔ یہی ہمارا المیہ ہے کہ ہمارے لیڈروں نے عوام کے ساتھ دھوکہ کیا۔ انہوں نے لوگوں کو بتایا کہ ہم نے آپ کو آزادی

دلوائی ہے۔اب کوئی پوچھے کہ خاک آزادی دلوائی ہے۔مہاراجہ نے ۱۹۳۴ء میں کشمیر میں قانون ساز اسمبلی قائم کردی تھی۔اور جموں کشمیر کے لوگوں کو ووٹ کا حق دے دیا تھا۔۱۹۴۷ء میں آکر آپ نے ووٹ کا یہ حق بھی ختم کر دیا اور اسمبلی بھی اور دعویٰ یہ کیا کہ ہم نے تمہیں آزادی دلوائی ہے۔(قہقہے)۔

۱۹۶۴ء میں کے ایچ خورشید پہلا آدمی تھا جس نے بالواسطہ ووٹ یعنی بی ڈی سسٹم نافذ کیا۔یونین کونسلیں بنیں،ان میں الیکشن ہوئے۔پھر سٹیٹ کونسل بنی جس کا انتخاب بی ڈی ممبر کرتے تھے۔کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آزاد کشمیر کے لوگوں کے ساتھ دھوکہ ہوا۔آپ کے صدر کی حیثیت یہ ہے کہ وزارتِ امورِ کشمیر کا ایک کلرک انہیں ہدایات جاری کرتا ہے۔اور جب چاہا جسے چاہا نوکری سے فارغ کر دیا۔ایسی حکومت،صدر اور وزرا پر تو ماتم کرنا چاہیے۔



دو سال پلک جھپکتے گزر گئے۔ این ایس ایف کے دوسرے کنونشن کا اعلان ہو گیا۔ ریاض جنجوعہ اس وقت شیخو پورہ میں ہوتا تھا اس نے میر پور کے متحرک دوستوں کو بلایا جن میں صابر انصاری، راجہ رشید، چوہدری مجید وغیرہ شامل تھے۔ وہاں پر مشورہ ہونے لگا کہ صدارت کے لیے کس کو لایا جائے۔ سب نے صابر کا نام تجویز کیا لیکن وہ انکاری رہا۔

''بھئی آخر وجہ تو بتاؤ، تم کیوں نہیں آنا چاہ رہے''؟ ریاض جنجوعہ نے پوچھا۔

''وجہ یہ ہے کہ لوگ کہیں گے این ایس ایف محاذ رائے شماری کی شاخ بن گئی ہے۔ پہلے بھی باتیں ہوتی رہی ہیں اس لیے میں نہیں آؤں گا''۔ صابر نے جواب دیا۔

''یہ تو کوئی بات نہ ہوئی' ریاض بولا' اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم ساری زندگی ایسے ہی رہو گے، کچھ نہیں بنو گے''؟

''ضروری نہیں ہے کہ جو لوگ کام کریں وہ عہدے بھی لیں اور جو عہدے لیں فقط وہی کام کریں''۔ صابر نے کہا۔

بہر حال کافی بحث و تمحیص کے بعد وہاں پر یہ فیصلہ ہو گیا کہ صابر انصاری کو صدر بنایا جائے گا۔ یہ طے ہونے کے بعد وہ لوگ واپس آ کر کنونشن کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ دو ہی دن گزرے تھے کہ محمود اختر نے اسے خبر دی۔

''تمہیں پتہ ہے چوہدری مجید صدر آنا چاہتا ہے''۔ محمود اختر نے کہا۔

صابر نے حیران ہوتے ہوئے محمود کی طرف دیکھا اور کہا۔

''یہ نہیں ہو سکتا، تمہیں کسی نے غلط بتایا ہے''۔

''اس میں غلطی کی کوئی بات نہیں ہے''۔ محمود نے کہا۔

''لیکن بھئی ریاض جنجوعہ کے ہاں سب لوگوں نے طے کیا تھا، حالانکہ میں نہیں مان رہا تھا'۔ صابر نے کہا۔ 'وہاں پر ہی بتا دیتا تا کہ آپس میں غلط فہمی نہ پیدا ہوتی''۔

ریاض جنجوعہ کو جب اس کی خبر ہوئی تو اس نے کانوں کو ہاتھ لگا لیے۔ کہنے لگا۔

''اگر یہی بات ہے تو پھر اسے سامنے آنے دو الیکشن میں سب کو اپنی حیثیت کا پتہ چل جائے گا''۔

''نہیں میں اس کے حق میں نہیں ہوں' صابر نے کہا' مجھے سو فیصد یقین ہے کہ الیکشن میں کوئی مجھ سے نہیں جیت سکتا۔ میں شروع دن سے میر پور سے لے کر مظفر آباد تک بھاگ رہا ہوں۔ میر پور کی حد تک لابنگ کر کہ صدر نہیں بنا جا سکتا۔ باہر جا کر دیکھ لو کس کس کو لوگ جانتے ہیں۔ لیکن مسلئہ یہ ہے کہ ہمارے درمیان پیدا ہونے والا معمولی سا اختلاف بھی بہت نقصان کا باعث بن سکتا ہے۔ حکومت ہمارے خلاف ہے، تمام سیاسی پارٹیاں ہمارے خلاف ہیں۔ ایسے ماحول میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے''۔

''لیکن ہماری یہ کمزوری تو کبھی ختم نہیں ہوگی' ریاض نے کہا' اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں ہر بار سمجھوتے کرنا پڑیں گے''؟

''ہم سمجھوتہ کسی غیر سے، اپنے دشمنوں سے نہیں، اپنے دوستوں سے کر رہے ہیں'۔ صابر نے جواباً کہا۔' اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ہماری کمزوریوں سے ہمارے دشمن فائدہ اٹھا لیں یہ ہماری نااہلی ہوگی''۔

ریاض انقلابی بھی پوچھنے لگا۔

''تو پھر کیا کرنا ہے''؟

''وہ میں نے سوچ لیا ہے کیا کرنا ہے''۔ صابر نے جواب دیا۔

کنونشن والے دن دوسرے اضلاع سے لوگ آنا شروع ہو گئے۔ سب نانگی میں جمع ہوئے تو صابر نے انہیں یہاں کی صورتحال سے آگاہ کرتے ہوئے پوچھا کہ کس کو صدر بنانا چاہیے۔ سب نے صابر کے حق میں رائے دی۔ لیکن وہ نہیں مانا اور اس نے پوچھا کہ اگر میں نہیں آتا تو دوسرا کون ہونا چاہیے۔ سب نے کہا کہ اس صورت میں چوہدری بشیر کو رکھ لیں۔ یہ فیصلہ ہونے کے بعد تمام لوگ کلیال ہوٹل پہنچ گئے جہاں کونسل کا اجلاس ہونا تھا۔ صابر نے اجلاس میں صدارت کے لیے چوہدری بشیر کا نام تجویز کیا۔ یہ تجویز سب کے لیے حیران کن تھی۔ کسی نے

اس پر اعتراض نہ کیا۔ البتہ ایک آدمی نے کھڑے ہو کر کہا کہ چوہدری مجید بھی صدارت کے لیے امیدوار ہے۔ لیکن چوہدری مجید نے بھی حالات کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے اپنا نام واپس لے لیا۔ یوں چوہدری بشیر صدر اور کوٹلی سے عطا محی الدین جنرل سیکریٹری بنے۔

۳۰ جنوری ۱۹۷۱ء کو گنگا طیارے کی ہائی جیکنگ نے مسئلہ کشمیر کو سرد خانے سے نکال کر ایک Burning issue کے طور پر دنیا کے سامنے لا کھڑا کیا۔ انڈین ائر لائن کے اس طیارے کو سری نگر سے جموں جاتے ہوئے اغوا کر کہ لاہور ائر پورٹ پر اتارا گیا۔ ہاشم قریشی اور اشرف قریشی نے ہائی جیکرز کا رول ادا کیا جبکہ اس پلان کے ماسٹر مائنڈ مقبول بٹ تھے۔ اس واقعہ نے تحریک آزادی کشمیر میں نئی روح پھونک دی۔ کشمیریوں نے اس پر پوری دنیا میں خوشیاں منائیں۔ محاذ رائے شماری اور این ایس ایف کے کارکنان نے ہائی جیکرز کا لاہور ائر پورٹ پر جا کر استقبال کیا۔ پاکستانی حکومت نے بھی شروع میں اس اقدام کو سراہا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے مقبول بٹ اور ہائی جیکرز کا ستقبال کیا۔ لیکن چند دنوں بعد ہی حکومت نے اپنی پوزیشن تبدیل کر لی۔ ہائی جیکرز سمیت مقبول بٹ اور محاذ کی قیادت کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے ساتھ محاذ اور این ایس ایف کے بے شمار کارکنوں اور قیادت کو گرفتار کر کہ شاہی قلعہ اور دلائی کیمپ مظفر آباد میں بند کر دیا گیا۔ جہاں ان پر بے انتہا تشدد کیا گیا۔ ان گرفتاریوں اور تشدد کے خلاف آزاد کشمیر بھر میں احتجاج ہوا۔ مقبول بٹ، ہائی جیکرز اور محاذ کی قیادت کے خلاف کیس چلا۔ جس میں تمام لوگ بری ہو گئے البتہ ہاشم قریشی کو عدالت نے ۸ سال کی سزا سنائی۔ بعدازاں عوامی احتجاج کے نتیجے میں ہاشم قریشی کو اپیل کا حق دیا گیا اور وہ ۱۹۸۰ء میں رہا کیے گئے۔

اس کے بعد پاکستان میں الیکشن ہوئے جن کے نتیجے میں بنگلہ دیش الگ ہو گیا اور پاکستان کے ۹۰،۰۰۰ فوجی انڈیا کی قید میں چلے گئے۔ پاکستان میں پیپلز پارٹی کی حکومت برسرِ اقتدار آ چکی تھی اور اس کا سب سے بڑا چیلنج قیدیوں کی رہائی تھا۔ اس سلسلے میں پاک بھارت سربراہی ملاقات جون ۱۹۷۲ء کو شملہ میں طے پائی۔ ۲۸ جون سے ۲ جولائی تک جاری ان مذاکرات کے کئی دور ہوئے۔ ان مذاکرات میں بھٹو اور اندرا گاندھی کے درمیان کشمیر کے معاملے میں اس بات پر اتفاق ہوا کہ موجودہ سیز فائر لائن کو مستقل سرحد میں تبدیل کر

دینا چاہیے۔ البتہ بھٹو اس شق کو معاہدے میں تحریری طور پر شامل کرنے سے گریزاں تھے۔ جسے بالآخر بھارت نے تسلیم کر لیا۔ لیکن دونوں ملکوں کے درمیان یہ طے ہو گیا کہ موجودہ تقسیم کو مستقل کرتے ہوئے سیز فائر لائن کو سرحد میں تبدیل کر دیا جائے۔ یہ حل کشمیریوں کو کسی صورت قبول نہ تھا لیکن محاذ رائے شماری کے علاوہ کسی سیاسی جماعت نے اس پر اختلاف نہ کیا۔ این ایس ایف نے پورے آزاد کشمیر میں شملہ معاہدہ کے خلاف احتجاجی تحریک چلائی، لوگوں کو حقائق سے آگاہ کیا اور اس معاہدہ کو کنڈم کیا۔

شملہ میں کشمیر پر ہونے والے غیر تحریری معاہدہ کے تناظر میں بھٹو نے آزاد کشمیر کو پاکستان کا صوبہ بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس سلسلہ میں ۱۹۷۳ء میں بھٹو نے میرپور کا دورہ کیا جس میں آزاد کشمیر کو صوبہ بنانے کا اعلان کیا جانا تھا۔ اس دورہ کے اعلان کے ساتھ ہی این ایس ایف نے اس صورتحال سے نمٹنے کے لیے اجلاس بلائے اور حکمتِ عملی طے کی۔

''یار یہ شملہ میں کیا ہوا ہے''؟ انیس نے عبدالغفور انقلابی سے پوچھا۔

''پاکستان کے ذرائع ابلاغ کچھ اور کہہ رہے ہیں جبکہ بی بی سی اور دیگر غیر جانبدار ذرائع کا تجزیہ مختلف ہے'۔ عبدالغفار نے کہا۔ 'کشمیر کے معاملے میں اعلامیہ میں دو چیزیں بہت اہم ہیں۔ ایک تو یہ کہ سیز فائر لائن کا نام بدل کر کنٹرول لائن رکھ دیا گیا ہے۔ اور دوسری یہ کہ دونوں ممالک نے کنٹرول لائن کی خلاف ورزی نہ کرنے کا معاہدہ کیا ہے۔ ان دو باتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بھارت اور پاکستان کشمیر کی موجودہ تقسیم پر خوش ہیں اور وہ اسے نہ صرف برقرار رکھنا چاہتے ہیں بلکہ اس کی خلاف ورزی نہ کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ دونوں طرف کے کشمیریوں کو بھی وطن کے دوسری طرف جانے کے حق سے باضابطہ طور پہ مستقلاً محروم کر دیا جائے۔ اور ان کی طرف سے ہونے والی خلاف ورزی کو کنٹرول کیا جائے گا''۔

''یہ صورتحال تو ہمیں پہلے سے ہی درپیش ہے'۔ انیس نے کہا۔ 'یہ تو کوئی نئی بات نہیں ہے''۔

''تمہاری بات بالکل درست ہے'۔ عبدالغفار نے کہا۔ 'فرق یہ ہے کہ پہلے یہ صورتحال عارضی سمجھی جاتی تھی۔ مسئلہ کشمیر اقوام متحدہ کے ایجنڈے پر تھا اور قراردادوں کے مطابق دونوں ممالک استصواب رائے کروانے کے پابند ہیں۔ گو کہ ان قراردادوں میں ہمارے حقِ خود

ارادیت کو محدود کر دیا گیا ہے کہ ہمیں بھارت یا پاکستان میں سے کسی ایک کے ساتھ الحاق کرنے کا پابند بنا دیا گیا ہے۔ آپ منافقت کی انتہا دیکھو کہ ۱۹۴۸ء میں پاس ہونے والی قرارداد میں سے تیسرے آپشن یعنی خودمختار کشمیر کے آپشن کو پاکستان نے ختم کروایا ہے۔ یعنی کشمیر بھارت کے ساتھ چلا جائے یہ تو پاکستان کو منظور ہے مگر یہ منظور نہیں کہ یہ ایک آزاد ریاست بن جائے۔ بہر حال اس محدود حقِ خودارادیت کی بنیاد پر اگر استصوابِ رائے ہوتا ہے تو غالب امکان یہ ہے کہ کشمیری پاکستان کے حق میں رائے دیں گے۔ یہی امکان اس استصوابِ رائے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اگر تیسرے آپشن کو اقوام متحدہ کی قراردادوں میں سے نہ نکلوایا جاتا تو شاید بھارت استصوابِ رائے کے لیے تیار بھی ہو جاتا۔ موجودہ تقسیم یا صورتحال کے عارضی ہونے کی یہی ایک وجہ تھی۔ اب اگر بھارت اور پاکستان موجودہ تقسیم کو حتمی شکل دینے پر تیار ہو چکے ہیں تو یقیناً یہ ایک بڑی اور خوفناک تبدیلی ہے۔

دراصل بھٹو ایک ہوشیار سیاستدان ہے اس نے محسوس کر لیا ہوگا کہ بھارت کسی بھی طور پوری ریاست کو پاکستان کے حوالے نہیں کرے گا۔ جنگ کے ذریعے کشمیر کو حاصل کرنے کا تجربہ بھٹو اور اس کے ساتھی ۱۹۶۵ء میں کر چکے ہیں۔ اور استصوابِ رائے کی راہ میں روس حائل ہے۔ لہٰذا اس نے سوچا ہوگا کہ موجودہ تقسیم کو ہی فائنل کر دیا جائے''۔

''تمہاری بات میں بہت وزن ہے۔ مجھے بھی شک پڑتا ہے کہ ایسا ہی ہوا ہوگا''۔ خضر نے کہا۔

''او چھوٹے......'' انیس نے ویٹر کو آواز لگائی۔

''کیا چاہیے صاحب''؟ لڑکے نے پوچھا۔

''گولڈ سٹار کی ایک ڈبی پکڑ لاؤ''۔ انیس نے جیب سے پیسے نکال کر دیتے ہوئے کہا۔

''اس پر کوئی ردعمل تو سامنے آنا چاہیے''۔ خضر نے کہا۔

''پچھلی میٹنگ میں تو یہ طے ہوا تھا کہ شملہ مذاکرات کے بعد میٹنگ بلائی جائے گی۔ دیکھو قیادت کیا فیصلہ کرتی ہے''۔

''لیکن ہم اس سلسلے میں کیا کچھ کر پائیں گے۔ لبریشن لیگ اور محاذ رائے شماری کے

علاوہ تو کوئی بھی اس کے خلاف آواز نہیں اٹھائے گا''۔انیس نے کہا۔

''یہی تو ہمارا المیہ ہے۔مسلم کانفرنس تو پچھلے ۲۵ سالوں سے اقتدار کے مزے لوٹ رہی ہے۔ریاست کی آزادی سے اس کا کوئی سروکار نہیں۔ان کے منہ میں اقتدار کی ہڈی ہونی چاہیے۔اور پاکستانی حکمران ہماری اس کمزوری سے اچھی طرح آگاہ ہیں''۔غفاری نے کہا۔

''نہ پاکستان کو یہ اختیار حاصل ہے نہ بھارت کو اور نہ ہی کسی اور طاقت کو کہ وہ ہمارے مستقبل کا فیصلہ کرے۔اور فیصلہ بھی ایسا کہ جس میں ریاست اور اس میں بسنے والے انسانوں کو جبری طور پہ تقسیم کر دیا جائے۔ہم ایسے کسی فیصلے کو تسلیم نہیں کرتے۔اندرا گاندھی اور بھٹو نے شملہ کے مقام پہ بیٹھ کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ موجودہ سیز فائر لائن کو مستقل سرحد بنائیں گے۔لیکن ہم انہیں بتا دینا چاہتے ہیں کہ اس فیصلے پر عمل درآمد اتنا ہی مشکل ہے جتنا بھارت اور پاکستان کا پھر سے اکٹھا ہونا۔پاکستان تقسیم ہو گیا ایک اور ملک بنگلہ دیش بن گیا مگر یہ بھارت کا حصہ نہیں بنا۔ ایسے ہی یہ ریاست بھارت اور پاکستان میں سے کسی ایک کا بھی مستقل حصہ نہیں بن سکتی۔ہماری قوم ،ہزاروں سالہ تاریخ کی وارث قوم آج اپنی تاریخ کے نازک ترین دور سے گزر رہی ہے۔ہمارے حکمران اور ہمارے سیاستدان بک چکے ہیں۔لیکن یاد رکھو کہ اس وطن کے ۸۰ لاکھ عوام نہ کل بکے تھے، نہ آج بکے ہیں، نہ کل بکیں گے۔ان کی گردنیں کٹ سکتی ہیں، جھک نہیں سکتیں۔ یہ مر سکتے ہیں بک نہیں سکتے..........''

''کشمیر رہا ہے خود مختار''

''کشمیر رہے گا خود مختار''

''ہم کیا مانگیں آزادی''

''اِس پار بھی لیں گے آزادی''

''اُس پار بھی لیں گے آزادی''

''ہے حق ہمارا آزادی''

''ہم چھین کے لیں گے آزادی''

شہید چوک میں ایک نوجوان طلبہ کے جلسے سے مخاطب تھا۔

''آج اس نام نہاد آزاد کشمیر کے حکمران بھی سن لیں اور خطے کے حکمران بھی کہ ہم پاکستان اور بھارت کے درمیان ہونے والے کسی معاہدے کے پابند نہیں ہیں۔ہم وطن کی جبری تقسیم کو مانتے ہیں نہ رائے شماری کے محدود حق کو۔تم جتنے مرضی معاہدے کرلو، جتنی مرضی فوجیں پال لو، جتنا مرضی اسلحہ اکٹھا کرلو، کشمیریوں کو ان کی جدوجہد سے باز نہیں رکھ سکتے۔تمہارے پاس سنگینیں ہیں، گولیاں ہیں، توپیں ہیں...... ہمارے پاس سر ہیں اور سینے ہیں۔تمہارا کوئی وار خالی جائے گا نہ تمہاری کوئی گولی خطا جائے گی۔کشمیری ہر محاذ پر لڑیں گے...... ہر دشمن سے لڑیں گے......آخری سانس تک لڑیں گے......قیامت تک لڑیں گے......''۔

یہ جولائی ۱۹۷۲ء کا دوسرا ہفتہ تھا۔جونہی شملہ معاہدہ کی تفصیلات سامنے آئیں تو آزاد کشمیر میں اس کے خلاف احتجاج شروع ہو گیا۔کالجوں میں تعلیمی سرگرمیاں معطل ہوگئیں اور گلی کوچوں میں آزادی کے نعرے گونجنا شروع ہو گئے۔پولیس اور لڑکوں کے درمیان پتھراؤ آنسو گیس کا تبادلہ ہوتا۔شہر میدانِ جنگ بن جاتے۔دکانیں بند ہو جاتیں اور لوگ دور دور کھڑے ہو کر یہ لڑائی دیکھتے رہتے۔

راجہ سرور نے آج پانچویں دن عصر کے بعد دکان کھولی تو چوہدری فضل بھی آ گیا۔

''راجہ صاحب جلدی کرو مجھے تین کلو چینی، دو کلو پیاز، ایک پاؤ ہلدی، گرم مصالحہ دے دو''۔منحنی سے ایک شخص نے اپنی تھیلیاں آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''صبر کرو صبر، مجھے پہلے حقے کا بندوبست کر لینے دو''۔راجہ سرور نے حقے میں تمبا کو بھرتے ہوئے کہا۔

''لیکن راجہ صاحب جی، فیر پُلس آ جائے گی لڑکوں کے ساتھ دھمال کھیلنے اور خالی ہاتھ گھر گیا تو آج میری خیر نہیں''۔گاہک نے کہا۔

''صبر کرو نا ایک بار کہا ہے۔شہر کو آگ لگی ہوئی ہے اور اسے اپنی چینی پتی کی پڑی ہے''۔اس نے دہکتے ہوئے چھوٹے چھوٹے سرخ انگاروں کو تمبا کو پر رکھتے ہوئے جواب دیا۔

گُڑ گُڑ گُڑ گُڑ...... گُڑ گُڑ گُڑ گُڑ...... گُڑ گُڑ گُڑ گُڑ......اُس نے حقے کے تین

چار لمبے لمبے کش لگانے کے بعد حقے کی نال چوہدری فضل کو تھماتے ہوئے کہا۔

''لے فضل دین اپنے مُردار حکمرانوں پر ماتم کریں اس کم بخت کو نمٹا لوں''۔

اتنے مین اس کی دکان پر گاہکوں کی لائن لگ گئی اور وہ ان کو سامان دینے میں مشغول ہو گیا۔ جب وہ فارغ ہوا تو حقہ بجھ چکا تھا۔ اس نے پھر سے حقہ تازہ کیا اور دو چار کش لگانے کے بعد فضل دین سے پوچھا۔

''فضل دین انڈیا یا پاکستان اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے''؟

''رکاوٹ تو کوئی نظر نہیں آ رہی''۔ چوہدری فضل نے جواب دیا۔

''پاکستان سے خوف آنے لگا ہے فضل دین''۔ سرور نے کہا۔

''کل تک تو تم پاکستان کے نعرے لگا رہے تھے اب کیوں خوف آنے لگا ہے''؟ چوہدری فضل نے سوال کیا۔

گُڑ گُڑ گُڑ گُڑ............ گُڑ گُڑ گُڑ گُڑ............ گُڑ گُڑ گُڑ گُڑ............ سرور کے چہرے اور پیشانی پر پڑے بَل اور بھی گہرے ہو گئے اور وہ خود جیسے ان بھول بھلیوں میں کہیں کھو گیا۔ دور مغرب میں ڈھلتے ہوئے سورج کے ساتھ اس کی آنکھوں کی ویرانی بھی بڑھ گئی۔ حقے کے زوردار کش کے ساتھ اس کے گال پچک جاتے، اس کی آنکھیں اندر کو دھنس جاتیں اور کبھی کبھی کھانس بھی لیتا البتہ سفید مونچھوں کے اُلٹے بال کھڑے کے کھڑے ہی رہتے۔ یوں لگتا جیسے بہت سارے فوجی محاذ جنگ کی طرف پیش قدمی کر رہے ہوں۔

''کیسے پاکستان کا خواب دیکھا تھا ہم نے''؟ اس نے دل ہی دل میں سوچتے ہوئے شکائت بھری نظروں سے فضل دین کی طرف دیکھا۔ تھوڑی دیر مزید حقہ گُڑگُڑانے کے بعد اس نے نال فضل دین کی طرف بڑھائی اور اٹھ کر دکان کے برآمدے میں پڑے پتھر جمع کرنے لگا۔

بھٹو کے دورۂ میر پور کا بڑا چرچا تھا، بلکہ یوں کہیے کہ شور شرابہ تھا۔ انتظامیہ مسلسل بخار میں مبتلا تھی۔ یہ دورہ ان کے لیے سوہانِ روح بنا ہوا تھا۔ سپاہی سے افسر اور چوکیدار سے حاکم تک ہر کوئی بھاگ دوڑ میں مصروف تھا۔ آزاد کشمیر میں پیپلز پارٹی نئی نئی بنی تھی اور دن بدن پھیلتی جا رہی

تھی۔ نئے نئے لوگ پیپلز پارٹی میں شمولیت کے لیے پر تول رہے تھے۔اس دورے سے انہیں بہت توقعات وابستہ تھیں۔لوگوں کا جوش وخروش دیدنی تھا۔لوگ بھٹو کو ذاتی طور پر پسند کرتے تھے اوراس کی شخصیت سے متاثر تھے۔بھٹو کے استقبال کی تیاریاں عروج پر تھیں۔خیر مقدمی بینر تیار ہو رہے تھے،شہر اور سڑکوں کی صفائی جاری تھی۔ہر طرف نقل وحرکت تھی۔شہر کے جانور بھی حیران تھے کیا ہونے والا ہے۔لوگوں کی خوشی دیکھ کر وہ اندازہ لگا رہے تھے کہ ان کا مالک آ رہا ہے۔

دوسری طرف پچھلے تین دن سے وہ چار، چھ دوست سر جوڑے بیٹھے تھے۔وہ شدید غصے میں تھے اور مسلسل اس بات پر سوچ رہے تھے کہ پاکستان کے وزیر اعظم کو اس کے منصوبے میں کس طرح ناکام کیا جائے۔ نئے دوستوں کا ایک تانتا بندھا رہتا تھا۔وہ ان سے پوچھتے کہ اس موقع پر ان کا کیا پروگرام ہے۔لیکن وہ تو ابھی خود کسی نتیجے پر نہیں پہنچے تھے۔وہ مختلف آپشنز پر غور کرتے رہے۔کبھی ان کے ذہن میں آتا کہ ابھی سے ہڑتالیں اور جلسے جلوس شروع کر دیے جائیں تاکہ خراب حالات کے باعث وزیر اعظم کا مجوزہ دورہ ملتوی ہو جائے۔لیکن اس میں خامی یہ تھی کہ زیادہ سے زیادہ گرفتاریاں کر کے شہر میں چند دن کے لیے امن قائم کیا جا سکتا ہے۔کبھی وہ سوچتے کہ عین جلسے والے دن ہڑتال کی جائے۔لیکن اس دن شہر میں موجود کئی گنا زیادہ پولیس اور دیگر سیکیورٹی فورسز معاملات کو کنٹرول کر لیں گی۔

تو پھر کیا کیا جائے؟

یہ ایک ایسا سوال تھا جس نے انہیں پریشان کر رکھا تھا۔

بظاہر تو سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا۔جہلم میں پانی موج در موج دیار کی گیلیوں کو اپنے سینے پر بٹھائے بہہ رہا تھا۔منگلا کے پاور ہاؤس کی ٹربائنیں مسلسل چل رہی تھیں۔کونجیں غول در غول منگلا جھیل پر اترتیں، اشنان کرتیں مچھلیوں کا شکار کرتیں اور کھا پی کر اڑ جاتیں۔بیل صبح صبح اپنے کام پر جُت جاتے اور دن چڑھے تک ہل کھینچتے رہتے۔گائیں اور بھینسیں پیٹ بھر کر چرتیں اور ڈولے بھر بھر دودھ دیتیں۔کتے دن بھر آرام کرتے اور رات بھر بھونکتے رہتے، روٹی ملے نہ ملے ان کی پہرے داری میں چنداں فرق نہ آتا۔بلیاں دن رات چوہوں کی درک میں لگی رہتیں اور چوہے برابر چاچا سرور کی دکان سے چوری کرنے میں مصروف رہتے۔چیونٹیاں رینگ

رینگ کر غلہ جمع کرنے میں مصروف رہتیں۔ رات کو گیدڑ روتے اور بھیڑیے بھونکتے رہتے۔ مینڈکیں تالابوں اور کنوؤں میں ٹرٹراتی رہتیں۔ سورج وقت پر نکلتا اور غروب ہوتا۔ ہوا اپنی رفتار سے چل رہی تھی۔ کسی کو دم گھٹنے کی شکائت نہ تھی۔ گویا کہ سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا کہیں بھی کوئی گڑ بڑ نظر نہیں آ رہی تھی۔ لیکن شہر میں کچھ لوگوں کا دم گھٹا جا رہا تھا۔ سانس رُک رُک کر آ رہی تھی۔ ان کے لیے سورج کی آنکھیں بدلی ہوئی تھیں۔ چاند کی چاندنی پھیکی پھیکی معلوم ہو رہی تھی۔ یہ چند لڑکے بھی بے قرار تھے۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ ان کی بے قراری میں اضافہ ہو رہا تھا۔ یہ اضافہ انہیں دیوانگی کی طرف دھکیلتا رہتا کہ وہ اپنا توازن کھو بیٹھتے۔ بالآخر کئی دنوں کی مغز ماری کے بعد وہ ایک پروگرام ترتیب دینے میں کامیاب ہو گئے۔

انہوں نے پورے ضلع سے ایسے دوستوں کو جمع کیا جن پر وہ مکمل اعتماد کر سکتے تھے۔ کل ملا کر کوئی ۲۰ کے قریب لوگ جمع ہوئے۔ یہ تمام لوگ پچھلے پانچ چھ سالوں سے اکھٹے تھے۔ وہ اپنے ایک ساتھی کے گھر میں جمع ہوئے۔ ان میں سے ایک نے بات شروع کی۔ آمدہ جلسے کے بارے میں انہیں بتایا اور کہا۔

''دیکھو دوستو! شملہ معاہدے نے ہماری نیندیں اڑا دی تھیں۔ ہم سب نے مقدور بھر اس پہ احتجاج کیا تا کہ ایسے کسی پروگرام پر عمل درآمد نہ ہونے پائے۔ لیکن لگتا ہے کہ خطے کے حکمران کشمیر کے معاملے میں فائنل راؤنڈ کھیلنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ بھٹو اپنے دورۂ میرپور میں کشمیر کو پاکستان کا صوبہ بنانے کا اعلان کرنا چاہتا ہے۔ ہم کافی دنوں سے اس معاملے پر غور کر رہے تھے کہ اس موقع پر کیا کیا جائے۔ ہمارا مقصد فقط احتجاج اور جلسے جلوس کرنا ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ کوئی ایسی صورت اختیار کی جائے کہ بھٹو اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔

اس کے لیے ہم نے سوچ بچار کے بعد جو فیصلہ کیا ہے اسے آپ کے سامنے رکھتے ہیں ۔ اگر آپ لوگ اس سے متفق ہیں تو ٹھیک بصورت دیگر ہمیں کوئی متبادل حکمت عملی اختیار کرنا ہو گی۔ ہم نے یہ طے کیا ہے کہ ہم نے کوئی نعرے بازی، جلسہ جلوس، ہڑتال وغیرہ نہیں کرنی۔ ہم بالکل خاموش رہیں گے اور اپنے پروگرام کے متعلق اپنے بااعتماد ساتھیوں کے علاوہ کسی کو خبر نہیں کریں گے۔ خفیہ والوں کی ہم پر خصوصی نظر ہو گی اس لیے ہمیں محتاط رہنا ہو گا۔ ہمیں دوستوں سے

رابطے کرنا ہوں گے تا کہ ہمارے لوگ زیادہ سے زیادہ تعداد میں جلسے میں شریک ہو سکیں۔ ہمیں طے شدہ وقت پر پنڈال میں جمع ہونا ہے اور تین مختلف جگہوں پر ٹولیوں کی شکل میں اکھٹے بیٹھ جانا ہے۔ جلسے والے دن ہم پنڈال کا معائنہ کرنے کے بعد مخصوص جگہوں کا تعین کر لیں گے۔ میر پور شہر کے ساتھی پنڈال کے درمیان میں سب سے آگے ہوں گے۔ بھمبر اور چکسواری کے دوست دائیں جانب اور ڈڈیال کے دوست بائیں جانب بیٹھیں گے۔ جونہی وزیر اعظم تقریر کے لیے اٹھے گا میر پور کے دوست نعرے بازی شروع کر دیں گے اور اس کے ساتھ ہی دائیں اور بائیں جانب بیٹھے دوست بھی نعرے لگانا شروع کر دیں گے۔ ہماری پوری کوشش ہو گی کہ بھٹو تقریر نہ کر سکے۔ نعروں کے ساتھ ساتھ ہماری کوشش ہو کہ جلسہ ڈسٹرب ہو جائے۔ ہم اگر جلسہ ڈسٹرب نہ کر سکے تو ہمارا مقصد پورا نہ ہو گا۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اتنی تعداد میں وہاں پر جمع ہوں کہ پورے نظام کو درہم برہم کر سکیں۔ لوگوں میں بھگدڑ مچ جائے اور وہ پنڈال چھوڑ کر بھاگنا شروع کر دیں۔ ایک بات کا خیال رکھنا ہے کہ ہم نے کسی صورت نہیں بھاگنا ہے۔ وہاں پر پولیس اور کمانڈوز کی بھاری تعداد ہو گی جو سول کپڑوں میں لوگوں میں گھل مل کر بیٹھے ہوں گے۔ ان کی پوری کوشش ہو گی کہ وہ اس گڑ بڑ کو جلد از جلد کنٹرول کر سکیں۔ اس کے لیے وہ گرفتاریاں کریں گے۔ اس وقت ہم نے بھاگنا نہیں ہے بلکہ مزاحمت کرنی ہے۔ اس دوران ہماری کوشش یہ بھی ہو گی کہ ساؤنڈ سسٹم کو ختم کر دیا جائے......۔ ہم نے اپنی الگ گاڑیاں وغیرہ نہیں لانی۔ جو لوگ استقبال کے لیے آ رہے ہیں انہی کی گاڑیوں میں آنا ہے۔ تمام تنظیمی ساتھیوں کو پروگرام سے آگاہ نہیں کرنا۔ انہیں بس اتنا بتانا ہے کہ ہم نے جلسے میں شرکت کرنی ہے۔ ممکن ہے اس کے بعد ہمارا کوئی پروگرام ہو"۔

پروگرام پر تفصیلی بریفنگ کے بعد اس پر بحث و مباحثہ ہوا۔ چند اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی۔ مجموعی طور پر سب نے اسے پسند کیا مختلف تجاویز سامنے آئیں لیکن پلان میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں ہوئی۔

بالآخر وہ دن آ گیا جس کا انہیں شدت سے انتظار تھا۔ پنڈال میں لوگ جمع ہونا شروع

ہو گئے تھے۔طویل انتظار کے بعد جلسہ شروع ہو گیا۔ وزیرِ اعظم کے آنے کی خوش خبریاں بار بار سنائی جاتیں۔آخر کار بھٹو صاحب تشریف لے آئے۔ پورا پنڈال نعروں سے گونج اٹھا اور دیر تک گونجتا رہا۔لوگ بھٹو کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے بے تابانہ ایک دوسرے کے اوپر سے کود رہے تھے۔لوگوں کو سٹیج سے دور رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔

وزیرِ اعظم پاکستان ...... ذوالفقار علی بھٹو، آپریشن جبرالٹر کا مائنڈ بھٹو، معاہدۂ تاشقند کا ناراض بھٹو، ہزار سال تک کشمیر کے لیے لڑنے والا بھٹو، شملہ معاہدہ کا خالق بھٹو ....! جب سٹیج پر نمودار ہوا تو لوگ خوشی سے ناچنے لگے......۔

کافی دیر بعد لوگ ٹھنڈے ہو کر بیٹھ گئے۔ یہ ایک بڑا جلسہ تھا۔ منتظمین خوش تھے اور مطمئن بھی۔تقریریں ہوتی رہیں ،نعرے لگتے رہے، وقت گزرتا رہا۔حتیٰ کہ وہ لمحہ آن پہنچا جب جذبات نے لوگوں کو دیوانہ کر دیا۔بھٹو کی محبت میں دیوانے ہونے والے جب اپنی باری لگا چکے اور اپنے قائد کو سننے کے لیے خاموش ہو گئے تو مٹی کے دیوانے اٹھ کھڑے ہوئے۔وہ ایسے اٹھے کہ پھر انہیں کوئی بٹھا نہ سکا۔عبدالغفار انقلابی سب سے پہلے اٹھا اور اس نے اٹھتے ہی نعرہ لگایا۔

''بھٹو جی یہ کام نہ ہو گا　　غیرت کا نیلام نہ ہو گا
بچہ بچہ کٹ مرے گا　　کشمیر صوبہ نہیں بنے گا''
''ایک حل ایک امنگ　　گوریلہ جنگ،گوریلہ جنگ
آزادی کا ایک ہی ڈھنگ　　پنڈال گوریلہ جنگ،گوریلہ جنگ میں تین
چار اِس پار بھی لیں گے آزادی　　جگھوں اُس پار بھی لیں گے آزادی　　سے
نعرے ہے حق ہمارا آزادی　　لگنا ہم چھین کے لیں گے آزادی'' شروع ہو
گئے۔یہ　　ایسا نعرہ　　تھا کہ جس

نے لوگوں کے ذہنوں سے بھٹو کا سحر اتار دیا۔ مٹی کی محبت میں لوگ دیوانہ وار نعرے لگانے لگے۔

ذوالفقار علی بھٹو ایک جہاندیدہ شخص تھا اس نے غفار انقلابی کے بارے میں فوری معلومات حاصل کی اور اسٹیج سے اعلان کیا۔

''غفاری کو میرے پاس بھیجو۔ میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں''۔

غفاری گیا لیکن بات بننے کی بجائے بگڑ گئی اور وہ گرفتار ہو گیا۔ بس اس کے بعد ہنگامہ برپا ہو گیا۔

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

بھٹو نے ایسا رنگ بدلتا آسماں یقیناً پہلے کبھی نہ دیکھا ہو گا۔ پاکستان کا مقبول ترین، محبوب ترین لیڈر جس کے اشارۂ ابرو پر لوگ جانیں لٹانے کو تیار تھے۔ اور یہی فضا چند لمحے پہلے یہاں پر بھی تھی۔ لیکن پھر آسماں نے رنگ بدل لیا، زمیں سمٹ گئی۔ ایف ایس ایف کے کمانڈوز اور مقامی پولیس ان لڑکوں پر پل پڑی لیکن سب کوششیں ناکام ہوئیں، بے سُود گئیں۔ وقت کی آواز کو، سچ کی للکار کو کبھی کوئی دبا ہی نہیں سکا...... یہاں بھی نہ دب سکی، بلکہ پھیلتی گئی، حتیٰ کہ بساط ہی الٹ گئی......! لڑکوں اور پولیس کی ہاتھا پائی کے باعث بھگدڑ مچ گئی، افراتفری پھیل گئی۔ لڑکوں پہ تشدد ہوتے دیکھ کر کچھ لوگ ڈر گئے کچھ ڈٹ گئے اور ان دو طرح کے لوگوں نے مزید کام خراب کر دیا۔ لوگوں کی اکثریت جلسہ گاہ سے نکلنا شروع ہو گئی اور کچھ پولیس کے ساتھ الجھ گئے۔ جب مار کٹائی حد سے بڑھ گئی تو عام لوگوں نے بھی کنارا کرنے میں ہی عافیت سمجھی۔ لڑکوں کو بری طرح زمین پر لٹا کر مارا گیا۔ اور یقیناً وہ اس کے حقدار بھی تھے۔ وہ سب گرفتار کر لیے گئے اور ان پر بہت زیادہ تشدد کیا گیا مگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکے تھے۔



یہ جنوری کی ایک یخ بستہ رات تھی اور اسے اپنے دو دوستوں کے ساتھ سڑک کے کنارے بیٹھے ہوئے ایک گھنٹے سے اوپر ہو چکا تھا۔ گاڑی تو درکنار کسی چڑیل کا بھی دور دور تک کوئی نام ونشان نہ تھا۔ ایسے موسم میں گھر سے نکلنا عذاب کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ لیکن وہ تو نکل چکے تھے اور اگر انہوں نے خشک لکڑیاں جمع کر کہ آگ نہ جلا رکھی ہوتی تو ان کے لیے بیٹھنا ناممکن ہوتا۔ کافی دیر تک تو وہ مونگ پھلیاں کھاتے ہوئے خوش گپیوں میں مصروف رہے مگر اب بیٹھ بیٹھ کر ان کی ٹانگیں اکڑ چکی تھیں۔ آخر کار انہیں کافی دور کسی گاڑی کی لائٹیں نظر آئیں۔ ان میں سے ایک لفٹ لینے کے لیے کھڑا ہو گیا، آزاد نے اس کے ارادے کو بھانپتے ہوئے کہا:

''خیال رکھنا کسی چھوٹی گاڑی سے لفٹ نہ لینا''۔

''کیوں......''؟ سلیم نے حیران ہو کر پوچھا۔

''اس لیے کہ چھوٹی گاڑیوں میں ہمیشہ بڑے لوگ سفر کرتے ہیں''۔ اس نے مدھم ہوتی ہوئی آگ پر مزید لکڑیاں ڈالتے ہوئے کہا۔

''اور اگر کوئی بڑی گاڑی نہ ملی تو کیا کریں گے''؟

''آگ تاپتے رہیں گے......! اور تم زیادہ فکر نہ کرو، آرام سے آ کر بیٹھ جاؤ تمہارا پتھر ٹھنڈا ہو رہا ہے''۔ آزاد نے سلیم کو جواب دیا۔

سلیم کو ان کے ساتھ آئے ہوئے چار سال ہو چکے تھے لیکن وہ پہلی بار ان کے ساتھ کہیں جا رہا تھا۔ وہ ان کی طبیعت کو جانتا تھا اس لیے چپ چاپ پتھر پر بیٹھ گیا۔ لیکن اس کے چہرے پر پریشانی اور سردی کے آثار نمایاں تھے۔ اس کے ہونٹ نیلے ہو چکے تھے اور کانوں سے داخل ہونے والی ہوا اس کے دماغ میں سائیں سائیں کر رہی تھی جس کی وجہ سے اس کے سر میں ہلکا ہلکا درد شروع ہو چکا تھا۔ خالد نے اپنا مفلر اتار کر اسے دے دیا۔

''اگر ہمارا کوئی جاننے والا ہوا تو ہم سے ملے بغیر آگے نہیں جائے گا''۔ آزاد نے اسے تسلی دی۔

اتنے میں ایک گاڑی موڑ سے سامنے ہوئی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ان کے پاس سے گزر گئی۔ گاڑی میں چار آدمی بیٹھے تھے۔ ڈرائیور کی بڑی بڑی مونچھیں سردی کی وجہ سے اور بھی تن گئی تھیں جنہیں وہ الٹے ہاتھ سے وقفے وقفے کے بعد دلاسہ دے دیتا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں کل ملا کر پانچ مُندریاں پہن رکھی تھیں جو اس کی موٹی موٹی انگلیوں میں دھنسی ہوئی تھیں جن میں نیلے، سبز اور سرخ رنگ کے پتھر جڑے ہوئے تھے۔ اس کے برابر والی سیٹ پہ گرم اونی ٹوپی اور کوٹ پہنے ہوئے ایک درمیانی عمر کا بھاری بھرکم آدمی سگریٹ سے ہیٹ لے رہا تھا۔ سردی اور اندھیرے نے سب کو چپ کرا رکھا تھا کہ سڑک کے کنارے بیٹھے لڑکوں نے انہیں بولنے پر مجبور کر دیا۔ انہیں دیکھ کر اس بھاری بھرکم آدمی کا چہرہ شکن آلود ہو گیا، اس نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لیا اور ڈرائیور سے پوچھا

''یہ کون لوگ ہیں مشتاق''؟

''سر جی صحیح طراں تے میں وی نئیں پچھان پایاں پر میرا اندازہ ہے کہ ہیک چوہدری سبحان ناں منڈا ہے''۔

''چوہدری سُبحان اپنا نانگی آلا''؟ موٹے آدمی نے استفسار کیا۔

''ہاں جی ہاں جی چوہدری صاحب'' مشتاق نے گردن ہلائی۔

''تے باقی''۔

''باقی اس نے دوست یار......!'' مشتاق نے بڑے وثوق سے جواب دیا۔

''لیکن اے کرنے کے پئے اتھیں اس سردی وِچ''؟ چوہدری صاحب کو حیرت کے ساتھ الجھن بھی ہو رہی تھی۔

''اَگ تپنے پئے ناں سرکار......!''۔ مشتاق نے حیرت سے چوہدری صاحب کی طرف دیکھا۔

چوہدری صاحب نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

پچھلی سیٹ پر ایک آدمی جو سیٹ پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا اس نے ساتھ والے کی طرف دیکھا اور ادھر سے گردن سے جواب دینے کا اشارہ ملنے پر بولا۔

''چوہدری صاحب چرس پینے ہوسن تے ہور اِناں ناں کے کم اے''؟

''اوئے تُسی ہر ویلے چرس نے پچھے پئے رہنے ہو، اتنی دور آنی تے چرس پینے ناں کے جواز آ''؟ چوہدری صاحب نے ناراضگی سے کہا۔

اتنے میں چوتھا آدمی جو ابھی تک خاموش بیٹھا ہوا تھا بولا۔

''چوہدری صاحب اے محاذ رائے شماری آلے انصاری صاحب نے ورغلائے ہوئے کاکے نیں جہیڑے تیہاڑی تیہاڑی سڑکیں اپر نعرے مارنے رہنے نہ آپ پڑھنے تے نہ کسے کی پڑھنے دینے۔ تے آخنے کشمیر کی خودمختار ہونا چاہی ناں''۔

''او سمجھی گیاں یرا تے تو پہلے مریں آل ناں۔ ویسے ساڑھے ناک وچ تے انئیں سوٹا دیتا ناں''۔

چوہدری صاحب صورتحال کو سمجھنے کے بعد جیسے قدرے مطمئن ہو گئے تھے۔

''چوہدری صاحب اے بڑے حرامی لوک دے، اے انڈیا نے ایجنٹ دے تے پاکستان نے خلاف بغاوت کرانا چاہنے''۔ چوتھے آدمی نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

''او تو ایویں نہ ماریا کر، منڈیاں کھنڈیاں نے آخنے اپر بغاوتاں نئیں ہونیاں۔ تے انڈیا وی اتنا پاگل نئیں کہ کالج نے چھوکریاں کی ایجنٹ بنائے۔ کدے کوئی عقل آلی گل وی کریا کر۔ ذرا کل ناں ٹائم ٹیبل دیکھ تے موتی ماسی نے پترے ناں کم میں کی کل ضرور یاد کرائی شوڑیاں۔ پچھلی واری گل ہوئی سی ناں سیکریٹری نال تے اس کے آخیا سا''؟ چوہدری صاحب نے اس سے اختلاف کرنے کے ساتھ ہی دفتر لگالیا۔

''چوہدری صاحب گل تے ہوئی سی لیکن او سجاد حسین شاہ ہوریں ناں نِکا وی نوکری آستے کوشش کرنا پیا...... تے نالے موتی ماسی آسیں کی کتھے کم دیسی۔ شاہ ہور تے چنگیا مندیا کم آنے آلے بندے......''۔

''گل تے توہاڑی ٹھیک ہے باؤ پر جتھے موتی ماسی کم آسی اُتھے شاہ ہور نئیں کم اچھی

سکنے۔موتی وچاری کی پھکے لغنے ہوون تے میں شاہ ہوریں کی خوش کرناں پھراں۔ ویسے شاہ ہوریں تُو کی کے لالچ دیتی نی''۔چوہدری صاحب نے باؤ کوٹٹولا۔

''او چوہدری صاحب تُس تے ایویں ہی شک کرنے لغے ہو اے جئ کوئی گل نئیں''۔باؤ بیچارہ شرمندہ سا ہو کر بولا۔

ڈرائیور اپنی سیٹ پر ایسے ہلنے لگا جیسے چارپائی پہ لیٹا کروٹیں بدل رہا ہو۔چوہدری صاحب اسے دیکھ کر بولے

''مشتاق لگنا تُو کی کوئی گل آئی نی''۔

''چوہدری صاحب گل تے آئی نی فیر گل بڑی ڈاہڈی، تُس کدے باؤ ہوریں کولا اجازت ہنی دیاتے میں بولاں۔ویسے گل باؤ ہوریں نے فائدے نی''۔

''او تُو بول بول، باؤ کولا اجازت کہننیں نی کوئی لوڑ نئیں''۔

چوہدری صاحب سے فائنل اپروول ملنے کے بعد مشتاق نے اپنے دائیں ہاتھ سے مونچھوں کو سہلاتے ہوئے بیک مرر سے باؤ کی طرف دیکھا۔باؤ صاحب کی شکست خوردہ نظروں سے شعلے نکل رہے تھے۔مشتاق خوفزدہ ہو گیا اور کہنے لگا:

''چوہدری صاحب کدرے فیر گل کری شوڑ ساں''۔

چوہدری صاحب نے بناوٹی غصہ کرتے ہوئے کہا:

''اوئے مچھلا تُو کی لاساں ناں میں گڈی اُپرا تے رات اتھیں کُتیاں نال پہو کناں رہسیں تے پھدری تواہاڑے دند نکلے نے ہوسن۔تے گڈی میں تُو کولا چنگی چلائی شوڑ ناں آں تو کی پتہ''۔

مشتاق نے چوہدری صاحب کے گھر ہی پرورش پائی تھی اور چوہدری صاحب کا لاڈلا بھی تھا اس لیے اس کی سادگی بلکہ بیوقوفی کو ہر کوئی نہ چاہتے ہوئے بھی برداشت کرنے پر مجبور تھا۔وہ بڑا خدمتی مزاج کا آدمی تھا اور ہر کسی کے کام آتا تھا اس لیے اس کی بیوقوفیوں پر غصہ بھی وقتی ہی ہوتا تھا۔لہٰذا باؤ صاحب بھی اس کی آمدہ بدتمیزی کو سہنے کے لیے ذہنی طور پہ تیار ہو چکے تھے۔

مشتاق نے ملتجانہ انداز سے بیک مرر پر اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی اور گویا ہوا۔

''چوہدری صاحب اوشاہ ہوریں ناں ساڈو ہے ناں نذیر حسین شاہ......''۔

''کہیڑ ا نذیر حسین شاہ ووئے''؟ چوہدری صاحب نے سوال کیا۔

''اوجس نے جاتکے کی پچھلے مہینے پولیس کولا چھڑائی آنداسا''؟ مشتاق نے جواب دیا۔

''اچھا اچھا او تے اپنا آدمی ہے''۔

''دیکھو ناں چوہدری صاحب ساڑھا تے کم ہی ہوئی گیا''۔ مشتاق نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''کے مطلب''؟ چوہدری صاحب کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

''چوہدری صاحب شاہ ہوریں نی بڑی کڑی اس سال چوہدویں پاس کری ہنسی......''

''تو نزا آٹے ناں کِٹ ہیں ووئے، توہاڑی کِسے گلاناں کوئی اگو پچھو وی تھیا''؟ چوہدری صاحب سچ مچ غصے ہو گئے۔

مشتاق بھونچکا ہو کر رہ گیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے چوہدری صاحب کو ساری بات کی سمجھ آ گئی اور جیسے اپنے الفاظ واپس لیتے ہوئے کہا۔

''او میں سمجھی گیاں، شاباش اوئے مچھلا، پہلی واری کوئی کے نی گل کیتی اے''۔

مشتاق نے ایک مرتبہ پھر اپنے دائیں ہاتھ سے مونچھوں کو سہلایا، بائیں ہاتھ سے قمیض کا کالر پیچھے کی طرف کھینچا، سینہ پھیلایا اور فخریہ و فاتحانہ انداز سے بیک مرر کو گھورا۔ لیکن باؤ صاحب کسی نوخیز دوشیزہ کی طرح شرماتے ہوئے شیشے سے باہر دیکھ رہے تھے۔ چوہدری صاحب اپنی کسی کیلکولیشن میں لگے ہوئے تھے، فارغ ہونے کے بعد باؤ صاحب سے مخاطب ہوئے۔

''عزیز آس میر پور کدوں مڑساں''؟

''چوہدری صاحب کل تے چنبہ ہاؤس وچ کابینہ نی میٹنگ اے تے اس تھی فوراً بعد صدر صاحب ناں گولڑہ شریف زیارت اُپر حاضری دئی تے مظفر آباد جانا اے۔ چار چھ دن تے اتھیں لغی اے جاسن بہوں سارے کم پئے نے''۔ باؤ صاحب نے خالص دفتری زبان میں جواب دیا۔

اب چوہدری صاحب تیسرے آدمی سے مخاطب ہوئے

''ظہیر مظفر آبادوں واپسی اپر یاد کرایاں میں کی گل پُہلی جانی''۔

''ٹھیک ہے سر''۔ ظہیر نے باؤ صاحب کی طرف رشک بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

عزیز شاہ ۴۷/۴۸ سال کا خوش شکل، خوش پوش و خوش مزاج آدمی تھا۔ سکول کے دنوں میں ہی ماں کی ہاتھ بٹائی کے لیے اس کی شادی کروادی گئی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دن کی روشنی میں بیوی خاوند کا ایک دوسرے سے بات کرنا آخری درجے کی فحاشی تصور کی جاتی تھی۔ البتہ رات کو چھپ کر ملنے پر پابندی نہ تھی۔ اسی چھپ چھپائی میں ان کے دو بچے بھی ہو گئے تھے۔ لیکن اس کی بیوی نے ابھی تک نظر بھر کر اپنے خاوند کو دیکھا تک نہ تھا۔ رات کو بہت مختصر وقت کے لیے جلائی جانے والی لالٹین کی یرقان زدہ لو میں خاوند کے اتفاقیہ نظر آ جانے والے چہرے کو وہ دن کی چکا چوند روشنی میں پہچاننے سے قاصر تھی۔ پھر جب وہ پنجاب یونیورسٹی سے گریجویشن اور لاہور میں ایک پرائیویٹ فرم کی کلرکی سے فارغ ہوا تو اپنی محنت اور چوہدری صاحب کی کوششوں سے سیکریٹریٹ میں نوکر ہو گیا۔ تب وہ کبھی کبھی اپنی بیوی کو شہر بلا لیتا اور دونوں ایک دوسرے کو جی بھر کر دیکھتے اور باتیں کرتے۔ اس کے بعد جب چھوٹے بھائیوں کی شادیاں ہو گئیں تو ماں باپ نے اس کے بیوی بچوں کو مستقل طور پر شہر بھیج دیا۔ شادی کے بیس سال بعد شروع ہونے والی ان کی ازدواجی زندگی آٹھ سال بعد بیوی کی وفات پر ایک افسانہ بن گئی۔ آج اس کی بیوی کو فوت ہوئے پانچ سال گزر گئے تھے۔ ماں باپ، بہن بھائیوں، عزیز رشتہ داروں نے اسے بہت زور دیا لیکن وہ راضی نہ ہوا۔ البتہ اب وہ محسوس کر رہا تھا کہ تنہائی کی یہ سیخ اسے لکڑی سے بھی زیادہ کھوکھلا کر دے گی۔ چوہدری صاحب آزاد کشمیر اسمبلی کے ممبر تھے جو اپنے سٹاف کے ساتھ راولپنڈی جا رہے تھے۔ باؤ صدیق ان کے پرسنل سٹاف کا ممبر تھا۔

گاڑی کے چلے جانے کے بعد وہ قدرے پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ سردی بڑھتی جا رہی تھی اور ہواڈیوں میں اترتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ آزاد نے ٹائم دیکھا، رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ شدید سردی میں کتوں کے بھونکنے اور گیدڑوں کے رونے کی آوازیں ان کی کوفت میں اضافہ کر رہی تھیں۔

''کتے تیتھوں اوچے''۔

'' رات کے اندھیرے پر بھونک رہے ہیں۔ ان کی رات تو کٹ ہی جائے گی جانے

ہماری صبح کب ہوگی...... ہمارے کوڑھے دماغوں میں شعور کی کرنیں کب پھوٹیں گی''؟

''ماموں کے گھر کا گیٹ لاک بھی کیا تھا کہ نہیں''؟ اسے معاً خیال آیا۔ اسے بالکل یاد نہیں آرہا تھا لیکن اب تو کچھ نہیں ہوسکتا۔

''آتے ٹائم چوکیدار مرذود بھی تو کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ اس مہینے کا چوکیدارہ بھی باقی ہے۔ اور پتہ نہیں کام کیسا ہوا ہے۔ ماموں نے بھی تو عجیب مصیبت میں ڈال دیا تھا''۔ آگ کے شعلے آزاد کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

اس کے ماموں پانچ سال بعد اپنی فیملی کے ساتھ لندن سے آرہے تھے۔ اتنا عرصہ بند رہنے والے دو کنال پر بنے مکان کی maintenance اس کا نئے سرے سے رنگ روغن، حتیٰ کہ فرنیچر کی پالش بھی آزاد کے ذمے ٹھہری تھی۔ اس نے اس افتاد کا ذکر اپنے ایک دوست سے کیا جس کے مشورہ سے یہ طے پایا کہ اس پورے کام کا ٹھیکہ دے دیا جائے اور کام کی اچھے طریقے سے نگرانی کی جائے۔ لہٰذا تین ٹھیکیداروں کو مکان کی وزٹ کروا کہ سستی کوٹیشن دینے والے کو کم از کم مدت میں کام مکمل کرنے کی شرط پر ورک آرڈر جاری کر دیا گیا۔ یہ کام بیس دن میں مکمل ہوا۔ اس سارے عرصے میں وہ مسلسل اپنی تنظیم کا کام کرتا رہا۔ وہ تنظیم کا ضلعی صدر تھا اور پورے ضلع میں تنظیم سازی اس کی ذمہ داری تھی۔ اس دوران وہ چکسواری، ڈڈیال، سماہنی اور کوٹلی تک جاتا رہا جبکہ گھر والوں کے کھاتے میں وہ ماموں کے گھر میں دن رات مستریوں کے سر پہ کھڑا تھا۔ بہر حال اس نے وقت اور دماغ کا صحیح استعمال کرتے ہوئے دونوں پراجیکٹس پر بڑے اچھے انداز میں کام کروایا۔ وہ اپنی اس پراگریس پر بہت مطمئن تھا۔ البتہ جنوری کی میٹنگ کو سرے سے بھول چکا تھا اور جب اسے یاد آئی تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ جلدی سے نکلا خالد اور سلیم کو ساتھ لیا اور اڈے پر گیا لیکن وہاں کوئی گاڑی اس وقت پنڈی جانے کو تیار نہ تھی۔ وہ پیدل چلتے شہر سے باہر نکل آئے اور سڑک کے کنارے آ کہ بیٹھ گئے۔

اب وہ سوچ رہا تھا کہ شاید غلطی ہوگئی ہے، کہیں واپس نہ جانا پڑ جائے۔ وہ اسی ادھیڑ بن میں مصروف تھا کہ اسے بس کا ہارن سنائی دیا۔ بس ابھی کافی دور تھی لیکن وہ پہلے ہی اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ جب پاس پہنچے تو پتہ چلا کہ یہ بس نہیں ٹرک ہے۔ بہر حال انہیں لفٹ مل گئی جس

پرانہوں نے سکھ کا سانس لیا اور ٹرک پر اس طرح سوار ہوئے کہ آزاد سب سے آخر میں بیٹھا اور اس کے ساتھ کنڈکٹر بچارا ٹرک کی باری سے چپک گیا۔ ٹرک ڈرائیور آزاد کو دیکھ کر مسکرا دیا، گاڑی چل پڑی تو آزاد بھی ڈرائیور کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ ایوب تھا۔

ایوب اس کا سکول کا کلاس فیلو تھا، بلا کا ذہین مگر انتہا کا شرارتی تھا۔ پورا سکول اس سے تنگ تھا۔ مگر اس کے باوجود سکول اسے برداشت کیے ہوئے تھا اس لیے کہ وہ کلاس میں پہلی پوزیشن لے جاتا تھا۔ آخری مرتبہ وہ کلاس روم میں سگریٹ پیتے ہوئے پکڑا گیا اور ٹیچر اسے مارتے مارتے کلاس روم سے باہر برآمدے میں لے گیا۔ ٹیچر نے اسے لات مارنے کی کوشش کی جس پر ایوب آگے سے جو ہٹا تو ٹیچر برآمدے سے پھسل کر آٹھ فٹ نیچے گراؤنڈ میں جا گرا اور لات تڑوا بیٹھا۔ اس کے بعد ایوب سکول نہیں گیا۔ نتیجتاً وہ ڈاکٹر، انجینیئر یا افسر بننے کی بجائے کنڈکٹر، ڈرائیور اور پھر ٹرانسپورٹر بن گیا۔ آزاد کے ساتھ اس کا مسلسل رابطہ تھا۔ وہ اسے تنظیم کے لیے چندہ بھی دیتا اور جب کبھی ضرورت پڑتی گاڑیاں اور افرادی قوت بھی مہیا کر دیتا۔ وہ اپنے کلاس فیلوز میں سے کسی کو بھی نہیں بھولا تھا اور سب کا بہت احترام کرتا تھا۔ بلکہ وہ ہر کسی کی عزت کرتا تھا اور ہر کوئی اس کی عزت کرتا تھا۔ آزاد کا سفر بہت اچھا کٹا وہ سارا راستہ ایوب کے ساتھ اپنے سکول کی یادیں شیئر کرتا رہا۔ اسے ایوب کے ضائع ہو جانے پر بہت دکھ تھا اس لیے اس کے ساتھ اسے ہمدردی بھی بہت تھی۔ بہر حال وہ تقریباً ۱۲ بجے پنڈی پہنچے اور ایوب کے ساتھ کھانا کھا کر رخصت ہو گئے۔

ٹیکسی پر بیٹھتے ہوئے سلیم نے کہا:

''ہم تو بہت لیٹ ہو گئے ہیں''۔

خالد نے اس پر ایک قہقہہ بلند کرتے ہوئے کہا

''سادے آدمی ہم عین وقت پر پہنچے ہیں، تم فکر نہیں کرو یہ میٹنگ صبح تک چلے گی''۔

صدر میں ہوٹل کے پاس پہنچے تو چند دوست سڑک پر ہی مل گئے۔ سلام دعا اور خیر خیریت کے بعد پتہ چلا کہ مظفر آباد اور راولاکوٹ میں شدید بارش کی وجہ سے راستے بند ہیں اور ابھی تک کوئی بھی نہیں پہنچا ہے۔ لہٰذا ان کے آنے تک میٹنگ کو موخر کر دیا گیا ہے۔ البتہ کوٹلی

میر پور اور لاہور سے آئے ہوئے احباب ایک کمرے میں بیٹھے تھے۔ وہ بھی وہاں پہنچ گئے سب سے ملاقات ہوئی اور گپ شپ شروع ہو گئی۔ لیکن آزاد نے محسوس کیا کہ وہ بری طرح سے تھک چکا ہے اور ظاہر ہے خالد اور سلیم کی حالت بھی مختلف نہ تھی۔ اس نے سب کو اپنے سفر کی روداد سنائی اور کچھ دیر آرام کرنے کی اجازت لے کر اٹھ آئے۔ انہوں نے تین بیڈ والا ایک کمرہ لیا اور لیٹ گئے۔ خالد اور سلیم تو لیٹتے ہی سو گئے مگر وہ باوجود کوشش کے نہ سو سکا۔

میر پور شہر جب منگلا ڈیم میں ڈوب گیا تو یہاں کے لوگ بے گھر ہی نہیں بے وطن بھی ہو گئے۔ اپنے ہی گھر میں اپنوں ہی کے ہاتھوں لُٹ گئے۔ دوسروں کے آنگن میں جگمگاتے روشنی کے قمقموں نے انہیں اندھیروں میں دھکیل دیا۔ جہاں وہ رو دھو کر آس امید کے جگنوؤں کے پیچھے بھٹکنے لگے۔ روزگار کی طرف سے تو پہلے سے ہی کسمپرسی کا شکار تھے، گھر بار اور زمینیں بھی جب چھن گئیں تو دیارِ غیر کو ہجرت کے علاوہ ان کے پاس اور کوئی راستہ نہ بچا۔ جس طرف کی ہوا چلی سب ہی کا رخ اُدھر کا ہو گیا۔ نتیجتاً اس شہر غرقاب کے در بدر لوگ پنجاب کے مختلف علاقوں میں بسائے گئے اور کچھ برطانیہ کے ساحل پر اترے جہاں انہوں نے ملازمتیں بھی کیں، کاروبار بھی کیے، صنعتکاری بھی کی اور سیاست بھی۔ وہ ہاؤس آف کامنز اور ہاؤس آف لارڈز کے ممبر بھی بنے مگر آفرین ہے وطن کے ان سپوتوں پر کہ نہ تو وہ اپنی مٹی کو بھولے نہ اس سے جڑے رشتوں کو۔ اپنی مٹی کی خوشبو ان کی سانسوں میں مہکتی رہی، اپنی ماں بولی کا رس ان کی زبانوں سے ٹپکتا رہا اور غلامی کا درد ان کی تحریروں سے جھلکتا رہا۔ وہ جب جب بھی مادرِ وطن کو لوٹے محبتیں اور چاہتیں ان سے بغلگیر ہوئیں اور رفعتوں نے ان کی قدم بوسی کی۔ مگر انہیں وہ گلیاں، ان کی خوشبو نہیں ملی، چڑیوں کے بسیرے وہ پیڑ گھنیرے نہیں ملے...... اپنا بچپن نہیں ملا، لڑکپن، جوانی کی یادوں کے منارے نہیں ملے...... اجداد کی قبروں کے سہارے نہیں ملے!

آزاد کی اپنی ماموں زاد شہناز سے باقاعدہ منگنی تو نہیں ہوئی تھی لیکن یہ طے تھا کہ ان کی شادی ہونی ہے۔ اپنی پڑھائی سے، سیاست کے جھمیلوں سے، گھر کے بکھیڑوں سے اسے جب بھی فرصت ملی اس نے شہناز سے باتیں کیں۔ کبھی جہلم کنارے، جس کے پانی میں انہوں نے کاتک کے چاند اتارے...... کبھی پونچھ ندی میں پاؤں پھلارے انہوں نے ٹھنڈے میٹھے

پانیوں میں ایک ایک کر کے سارے شکوے بہائے......کبھی جھلمل جھلمل کرتے تاروں کی چھاؤں میں انہوں نے سرگوشیاں کیں......کبھی ڈوبتے سورج کے ساتھ ان کے خواب شفق رنگ ہوئے......کبھی سرسبز پونچھ کی فلک بوس چوٹیوں کی ٹھنڈی معطر فضاؤں نے ان کے جذبوں کو تازگی بخشی......جہاں انہوں نے پوٹھی میر خان، بنجوسہ، دیار گلی، دھرمسال، متہ نا کوٹ، ایڑگلی کی دلفریب و دلکش جنتوں میں اپنی محبت کے قصر تعمیر کیے......کبھی انہوں نے سدھن گلی کی جادو نگری میں محبت کا سحر دیکھا......کبھی مظفر آباد کے پرانے پُل پہ ان کے دِل ڈولے......کبھی نیلم کبھی جہلم کی موجوں نے انہیں تلاطم خیز کیا......کبھی پیر چناسی کی پاک ہواؤں میں انہوں نے اپنے وسوسوں کو زمانے کی ثقافتوں سے پاک کیا......اور کبھی سیف الملوک کے کنارے انہیں اپنی چاہتوں کے استعارے ملے......!!

یہ سب کچھ اس کی پہنچ میں تھا لیکن شہناز اس سے دور کوسوں......سمندروں دور تھی۔ اور اس سے بھی دور بہت ہی دور ''وادیِ گُل پوش'' تھی، چناروں، زعفران زاروں کا دیس تھا، ڈل کے کنارے، حضرت بل جیسی عقیدت گاہوں میں پیاسی نگاہوں کے سجدے تھے۔ یہ سب کچھ اس کے خیالوں میں خوابوں میں سرابوں میں تھا۔ اپنی پڑھائی سے، سیاست کے جھمیلوں سے، گھر کے بکھیڑوں سے اسے جب بھی فرصت ملی اس نے شہناز سے باتیں کیں۔ کبھی جہلم کنارے..........۔

انہی خیالوں میں کھوئے جانے کب نیند نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا اور اس نے دیکھا......اس نے دیکھا کہ ایک گھنا جنگل ہے جس میں ایک عورت اپنے بچوں کو لیے بھاگتی جا رہی ہے۔ اس کی اوڑھنی کسی جھاڑی میں الجھ کر چھن گئی ہے اس کا دامن تار تار اور اس کے ننگے پاؤں کے زخموں سے خون رِس رہا ہے۔ اس کی آنکھوں کا خوف اپنی آخری حدوں کو چھو رہا ہے۔ وہ بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتی، بچوں کو سمیٹتی، گھسیٹتی، بھاگتی جا رہی ہے اور دو خونخوار بھیڑیے اس کا تعاقب کر رہے ہیں۔ اس کا چھوٹا بچہ تھک کہ گر جاتا ہے جسے وہ اٹھاتے ہوئے چیخ اٹھتی ہے۔ بچوں کی سانس اکھڑی ہوئی ہے اور وہ خوف و تھکاوٹ کے مارے سِکتے کے عالم میں ماں کے قدموں پر مرے جا رہے ہیں۔ بھاگتے بھاگتے وہ ایسی جگہ پہنچ جاتی ہے جہاں سارے راستے

ایک گھاٹی پر جا کر ختم ہو جاتے ہیں۔ آگے بہت بڑی کھائی ہے جس کی انتہا پر ٹھاٹیں مارتا ہوا جہلم اس شان سے برق رو ہے جیسے صلاح الدین ایوبی کا لشکر فلسطین کی سرزمین پر دشمنوں پر حملہ آور ہو رہا ہو۔ وہ گھاٹی کے کنارے پہنچی تو غراتے ہوئے بھیڑیے اس کے سر پر تھے۔ اس کے پاس سوچنے کو وقت نہ تھا اس نے دونوں بیٹوں کو بازوؤں میں اٹھایا اور گھاٹی سے نیچے کود گئی۔ اس نے بھیڑیوں کی خوراک بننے کی بجائے جہلم میں کودنے کو ترجیح دی......۔

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کی سانس بری طرح چل رہی تھی، وہ پسینے میں شرابور اور سخت خوفزدہ تھا۔ تھوڑی دیر اسے کچھ سمجھ نہ آ رہی تھی کہ کیا ہو رہا ہے، کیوں ہو رہا ہے۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل پر پڑا جگ اٹھایا اور منہ سے لگا لیا۔ جب طبیعت ذرا بحال ہوئی تو اس نے خود سے سرگوشی کی ''شکر ہے یہ خواب تھا''۔ مگر دوسرے ہی لمحے کوئی اس پر ہنس رہا تھا۔

''بیوقوف یہ خواب نہیں حقیقت ہے''۔

اس نے گھڑی پر نظر ڈالی، صبح کے دس بج چکے تھے۔ خالد اور سلیم ابھی تک سو رہے تھے۔ وہ کافی دیر سویا رہا لیکن سردی جیسے اس کی ہڈیوں میں اتر گئی تھی۔ اس نے دھوپ سینکنے کی غرض سے کھڑکی کا پردہ ہٹایا تو باہر کا منظر اس کی سوچ کے برعکس نکلا۔ تیز موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔

''گویا موسم بھی سیاست اور حالات کے رُخ پر ہے''۔ اس نے سوچا۔

بارش کو دیکھ کر اس میں سردی کا احساس اور بھی بڑھ گیا تھا۔ اس نے کمرے کا بغور جائزہ لیا۔ سیم زدہ دیواروں سے اترا ہوا پلستر اس کی حالت پر دانت نکالے ہوئے تھا۔ چھت جا بجا اکھڑے ہوئے پلستر کی وجہ سے اسے ایسے نظر آ رہی تھی جیسے کسی بیوہ کی پھٹی ہوئی چادر ہو۔ عین درمیان میں پھانسی پہ لٹکا ہوا پنکھا اسے بالکل فضول لگ رہا تھا۔ بازو والی دیوار کے ساتھ لکڑی کی دو کرسیاں اکڑی پڑی تھیں جن کے سامنے چیچک زدہ میز چائے کے انتظار میں لم سم لیٹی ہوئی تھی۔ اپنے سوئے ہوئے دو ساتھی اسے کشمیری قیادت کی طرح لگے۔

اس نے اکتا کر بیل پر ہاتھ رکھ دیا اور پھر بیرے کا انتظار کرنے لگا۔ دس منٹ بعد اس نے پھر بیل دی لیکن شاید موسم نے ہوٹل کے نظام میں خلل ڈال دیا تھا۔ وہ چائے کی تلاش میں

اٹھ کر نیچے چلا گیا۔ استقبالیہ پر ایک عدد آدھی کالی آدھی سفید مونچھوں والے لاغر سے ادھیڑ عمر آدمی کی سانس سگریٹ کے دھوئیں کے ساتھ یا سگریٹ کا دھواں اس کے سانس کے ساتھ جاری تھا۔ اس کی لکڑی نما انگلیاں سیگریٹ کو بمشکل تھامے ہوئے کانپ رہی تھیں۔ اس کی سفید شیو بڑھی ہوئی تھی، اونی ٹوپی اس کے سر کو ڈھانپنے کے بعد اس کے کانوں اور کسی قدر آنکھوں کو بھی اپنے حصار میں لیے ہوئے تھی۔ اور وہ گردونواح سے بے خبر اخبار پہ جھکا ہوا تھا۔

''اسلام علیکم''۔ آزاد نے تھوڑی دیر انتظار کے بعد اسے دوبارہ سلام دے کر اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔

''اس موسم میں ریسپشن کے لیے ہوٹل انتظامیہ کا انتخاب اچھا ہے۔ اس بے کار کے کار کے لیے کار آمد آدمی کو ضائع کرنا کہاں کی عقلمندی ہے''۔ اس نے سوچا۔

اس نے بابا جی سے مایوس ہو کر ادھر ادھر دیکھا۔ گیٹ کی طرف سے آنے والا تلوار نما لال مونچھوں والا اونچا موٹا آدمی فوجی بوٹ اور براؤن اونی پینٹ پر لنڈے کا گرم کوٹ پہنے اسے سلام کر رہا تھا۔

''وعلیکم اسلام''۔ اس نے جواب دیتے ہوئے ہاتھ ملایا تو اسے یوں لگا جیسے اس کا ہاتھ کہیں گم ہو گیا ہے۔ وہ تو خیریت گزری کہ دوسری طرف سے زیادہ گرمجوشی کا مظاہرہ نہیں ہوا ورنہ اس کی چیخیں نکل جاتی تھیں۔

''جناب کوئی خدمت''؟ بڑے آدمی نے پوچھا۔

''بھائی صاحب ناشتہ کرنا ہے''۔ آزاد نے جواب دیا۔

''آپ کون سے روم میں ٹھہرے ہوئے ہیں''۔ بڑے آدمی نے پوچھا

''۲۰۳ میں''۔

ٹھیک ہے آپ روم میں چلے جائیں میں لڑکے کو بھیجتا ہوں''۔ آزاد جواب پا کر بہت مطمئن ہوا اور اس سے پوچھا۔

''یہ بابا جی کو کیوں تکلیف دے رکھی ہے''؟

''اس لیے کہ اگر یہاں سے نکالا تو مر جائے گا''۔ بڑے آدمی کا تسلی بخش جواب پا کر

آزاد نے کمرے کی راہ لی۔راستے میں وہ سوچتا رہا کہ پتہ نہیں لڑکا آئے گا بھی کہ نہیں۔

کمرے میں پہنچا تو خالد نے لحاف کے اندر سے ہی لیٹے لیٹے پوچھا ''کدھر تھے چوہدری صاحب''؟

''یار تم لوگوں کے لیے ناشتہ لانے گیا تھا''۔خالد نے جواب سن کر منہ باہر نکال کر دیکھتے ہوئے پوچھا

''کدھر ہے''؟

''آ رہا ہے''۔آزاد نے اسے تسلی دی۔

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔کھولا تو سچ مچ کا لڑکا برآمد ہوا۔پورے کا پورا صحیح سالم۔

''جناب ناشتے میں کیا لیں گے''۔لڑکے نے دریافت کیا۔

''ہاف فرائی انڈے، پراٹھے اور چائے''۔آزاد نے اسے آرڈر دیا۔

''سر کتنے آدمیوں کے لیے''؟لڑکے نے سوال کیا۔

''تین آدمیوں کے لیے''۔آزاد نے اسے جواب دیا۔

''سر ایک انڈہ ہو یا دو دو''؟

''دو''۔

لڑکا جونہی پلٹا خالد نے اسے آواز دی۔

وہ حاضر ہوا تو خالد نے اسے کہا:

''کہیں سے گولڈ لیف کی ایک پیکٹ بھی پکڑ لانا''۔

''ٹھیک ہے سر،لیکن اس کے لیے پیسے دے دیں''۔لڑکے نے شرط لگا دی۔

خالد نے اسے پیسے دیتے ہوئے سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا۔وہ سولہ سترہ سال کا نوجوان لڑکا تھا۔اس کے کپڑے اس ٹھنڈے موسم کے لیے انتہائی نامناسب تھے۔اس نے پاؤں میں چپلیاں پہن رکھی تھیں جو سردی کی وجہ سے نیلے ہو رہے تھے۔اس کی سیلن زدہ گندی نیلی سویٹر خود اس سردی سے بچنے کے لیے کسی پناہ کی تلاش میں نظر آتی تھی۔

''اس لڑکے کی کیا حالت ہے بھئی،ان ہوٹل والوں کو اس کی حالت پر ترس بھی نہیں

آتا''۔ خالد نے آزاد سے کہا۔

''یہاں پر کسی کو کسی پر ترس نہیں آتا ہے دوست، جو جتنا ظلم کر سکتا ہے کر رہا ہے اور کوئی اسے روکنے والا نہیں، نہ اس کا ضمیر نہ معاشرہ نہ قانون۔ ہم ایک جنگل کے باسی ہیں جس میں درندگی دن بدن بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ پاکستان کی سیاست اور ظالمانہ سماج کے اثرات ہمارے اوپر بھی مرتب ہو رہے ہیں اور وہ وقت دور نہیں جب ہمارا سماج بھی طبقوں میں بٹ کر مفاداتی سیاست کی چراگاہ بن جائے گا۔ جس کی کوکھ سے جہالت، غربت، استحصال اور بیماریوں کے عفریت جنم لیں گے۔ ہم پاکستان کی بدترین کالونی بن کر رہ جائیں گے اور مفاد پرست طبقہ اسٹبلشمنٹ کی پشت پناہی پر ہمارے وسائل کو لوٹ کر ہماری نسلوں کو اپنا غلام بنا لے گا۔ ہمارے سیاستدانوں کی اکثریت کو اس کا شعور نہیں ہے اور جن کو شعور ہے یا جو اس کے خلاف بولیں گے انہیں سیاست کی مین سٹریم سے نکال باہر کر دیا جائے گا۔ یوں ایسے لوگ ہمارے نمائندے بن کر سامنے آئیں گے جو آزاد کشمیر کی کرسی تک پہنچنے کے لیے اپنی قوم کا سودا کر لیں گے''۔ آزاد کے لہجے میں زہر بھرا ہوا تھا۔

''یہ تو بڑی خوفناک صورتحال ہے''۔ سلیم نے آزاد کی بات سن کر اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

''اسی لیے تو ہم مارے مارے پھرتے ہیں دوست'۔ آزاد نے بولنا شروع کیا۔ 'ہمیں نہ تو سیاست کا شوق ہے نہ مروّجہ سیاست سے ہمارا کوئی سروکار۔ ہم تو ان حالات سے نمٹنے کے لیے تیاری کر رہے ہیں۔ عوام کو اپنی تاریخ، ان کے حقوق اور غاصبوں کے کردار سے آگاہ کرنا ہمارا فرض ہے۔ ہم اس وقت تک قومی آزادی کی جدوجہد کو منظّم نہیں کر سکتے جب تک ہمیں اور ہمارے عوام کو اپنے خلاف ہونے والی سازشوں اور ان سازشوں میں استعمال ہونے والے اپنے سیاستدانوں کے کردار کا مکمل ادراک نہ ہو۔ ہمارے ریاستی وجود کے حصے بخرے ہو چکے ہیں جس نے ہمیں ایک عجیب اور کٹھن صورتحال سے دوچار کر رکھا ہے......''۔

دروازے پر دستک ہوئی اور دوسرے ہی لمحے ان کی تنظیم کے پانچ ساتھی کمرے میں داخل ہوئے۔ سب ایک دوسرے سے بڑے تپاک سے ملے۔

''ہم نے سوچا تم لوگ ذرا آرام کر لو اس لیے دیر سے تمہاری طرف آئے ہیں۔ سناؤ

رات کیسی گزری''؟ مہمانوں میں سے ایک نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''رات گزر چکی ہوتی تو یہاں کیا کر رہے ہوتے......! آگے کی بتاؤ کیا پروگرام ہے''؟ آزاد نے جواب دیا۔

''مظفر آباد کے لوگ تو پہنچ گئے ہیں۔ بچاروں کو بڑی مصیبت اٹھانا پڑی۔ کوہالہ روڈ کئی جگہوں سے ٹوٹ گئی تھی۔ وہ واپس مظفر آباد گئے اور ایبٹ آباد کے راستے صبح پہنچے ہیں اور ابھی کوئی نو بجے سوئے ہیں۔ راولاکوٹ والوں کی تا حال کوئی خبر نہیں ہے۔ بہر حال میٹنگ رات کو ہی ہونی ہے۔ اس لیے کہ جو پہنچ چکے ہیں وہ بھی کسی نہ کسی کام سے نکلے ہوئے ہیں''۔ مجید نے اسے صورتحال سے آگاہ کیا۔

اتنے میں ناشتہ آ گیا۔ خالد نے ان کے لیے ناشتہ منگوانا چاہا لیکن وہ انکار ہو گئے البتہ چائے پر کسی کو اعتراض نہیں تھا۔

بس کے نکلنے میں ابھی آدھ گھنٹہ باقی تھا جسے گزارنے کے لیے وہ قریبی چائے خانے میں داخل ہو گئے۔ شدید سردی کے باعث ان کے دانت بج رہے تھے۔ وہ گیٹ کے سامنے والی میز پر بیٹھ گئے۔ سامنے دکان کے برآمدے میں ایک خارش زدہ کتا دکاندار کی غیر حاضری کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے بوریوں میں گھس بیٹھنے کی کوشش میں تھا لیکن اس کی خارش مانع تھی۔ اس کا جسم خارش کے باعث لال سرخ ہو چکا تھا اور جگہ جگہ سے خون رِس رہا تھا۔ خارش اور سردی دونوں نے مل کر اسے مرغِ بسمل بنا رکھا تھا۔ اس کی حالت یہ ہو چکی تھی کہ وہ اپنے خارش زدہ جسم کو جگہ جگہ سے کاٹ رہا تھا۔ اتنے میں اوپر بسم اللہ چوک سے ایک بھوت نما چیز نمودار ہوئی۔ اس کا لباس بوریوں اور ٹاٹ کے ٹکڑوں پر مشتمل تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا کونڈا تھا جس پر رنگ برنگے کپڑوں کے چیتھڑے بندھے ہوئے تھے۔ پاؤں میں جوتا نما کوئی چیز تھی جو اپنی اصل ہیئت کھو چکی تھی۔ اس کی پیٹھ پر ایک تھیلا تھا جس کی رسی اس کی گردن اور سینے کے گرد لپٹی تھی۔ مٹی اور گندگی سے جڑے ہوئے اس کے بالوں کی لِٹیں گردن سے نیچے لٹک رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں کے چشمے اور ان سے بہنے والے ندی نالے جانے کب کے سُوکھ چکے تھے۔ ان میں اب پانی کی جگہ ریت اور پتھر بکھرے پڑے تھے۔ وہ اڈے کی جانب چلا آرہا تھا کہ اس کی نظر چُوں چُوں کرتے

خارشی کتے پر پڑی۔ وہ سیدھا گیا اور برآمدے کے کچے فرش پر بیٹھ گیا۔ اس نے کندھے سے اپنا تھیلا اتارا، کونے میں پڑے ہوئے گتے کے ڈبے اکھٹے کیے، نالی میں پڑی ہوئی لکڑی کی پٹیاں اکھٹی کر کہ گتوں کے اوپر رکھیں اور تھیلے سے ایک بوتل نکال کر ان پر کچھ انڈیلا اور انہیں آگ لگا دی۔ کتا آگ کے قریب آکر کھڑا ہو گیا اس نے فقیر کو دیکھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

''تم کتنے اچھے ہو بابا......! شکر ہے خدا نے تم جیسے لوگوں کو پیدا کرنا ختم نہیں کیا۔ میں کب سے شہر در شہر بھٹک رہا ہوں لیکن مجھے تم جیسا کوئی نہیں ملا۔ ابھی کل ہی کی بات سنو پچھلی گلی کے ایک ہوٹل والے نے ڈنڈا مار کر میری ایک ٹانگ ہی توڑ دی ہے''۔

فقیر اور کتا کافی دیر تک آگ تاپتے اور آنکھوں کی زبان میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے۔ پھر فقیر نے اپنے تھیلے سے دو بند نکالے اور کتے کے آگے ڈال دیے۔ کتا ایک بند کھا کر پیچھے ہٹ گیا۔ فقیر نے بند اس کے قریب کرتے ہوئے کہا۔

''میں نے کھا لیا ہے تم کھاؤ، مجھے تمہارے پاس واپس آتے آتے بہت دیر ہو جائے گی''۔

فقیر نے اپنے کونڈے (لاٹھی) سے ایک چیتھڑا اتارا بوتل سے غالباً مٹی کا تیل اس پر ڈالا اور کتے کے جسم پر ملنا شروع کر دیا۔ کتے کی تکلیف اور بڑھ گئی اس کے منہ سے طرح طرح کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ کھڑا رہا۔ فقیر نے کتے کے پورے جسم پر تیل ملا اور چیتھڑا بجھتی آگ پر ڈال کر کتے سے رخصت ہو گیا۔ فقیر کا چہرہ جذبات سے بالکل عاری تھا...... جیسے لکڑی کا ہو۔ لگتا تھا دل و دماغ سے اس کے چہرے کا کنکشن کٹ چکا ہے۔ ورنہ اتنی خدمت پر وہ کوئی خاص آدمی ہوتا تو اس کا چہرہ خوشی سے چمک رہا ہوتا۔

امجد چائے خانے میں بیٹھا یہ ساری فلم دیکھتا رہا۔ اسے پہلی بار محسوس ہوا جیسے وہ کسی اور ہی دنیا میں پہنچ گیا ہے۔ اسے وہ دن شدت سے یاد آیا جب وہ اسلم کو دوستوں کے ہمراہ بڑی مشکل سے اٹھا کر رات ۱۰ بجے ہسپتال پہنچا تھا تو انہیں کوئی ڈاکٹر نہیں ملا تھا۔ اور جب وہ ڈاکٹر کو اٹھانے اس کی رہائش پر گئے تھے تو اس کے ساتھ ان کا جھگڑا ہو گیا تھا۔ اور جھگڑا جب ختم ہوا تو مریض بھی ختم ہو چکا تھا۔ دوسرے دن جب وہ میت دفنا کر اپنے دوست کی جدائی پر ماتم کناں

تھے اسلم کی والدہ نے انہیں دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

''اس نی زندگی اے اتنی سی مہاڑیو پُتر وتُس کیاں رونیا تے کیاں ڈاخٹر یں کنّے چھگڑے کرنیا۔ زندگی ڈاخٹر یں نے ہتھّے وِچ تھوڑی اے دی۔ ہیک تہیاڑے تے او آپے وی مری گینے۔ مُولے نئیں موتو کی روکی سکنیں۔ اللہ نا حکم کُن ٹالی سکنا۔

ڈاخٹر اکبر (صوبیدار ریٹائرڈ آرمی میڈیکل کور) کتنا سیانا ڈاخٹر سا تہیاڑی رات اسلم نے پیو کول کھلتا نا واہا فیر اُس کی نئیں بچائی سکیا......''۔

''لیکن کھلتا نا تے واہا ماسی ......آس کدوں آخنے دیاں کوئی ڈاخٹر موت کی ٹالی سکنا لیکن مریض کی تڑفنیاں چھوڑی تے سونا کُتھنا نی انسانیت دی''۔ امجد نے اسلم کی ماں کو جواب دیا۔

''او مہاڑیو پُتر وتُس کس کس کی انسانیت سکھالیا۔ اسلم نی پہن اپنے سکّے ماموں زاد نے کھرسی تے کل راتی او اُس کی طلاق دئی تے کھڈّی گیا تے بچہ وی کھسّی ختیس۔ بہوں مشکلیں کنّے اسلم میں روکیا لیکن پہنؤ نا دُکھ برداش نئیں کری سکیا تے بے ہوش ہوئی گیا۔ فیر تُس ٹھوائی ہنّی گیاس تے مُڑی آنی تے قبرا تہری شوڑیا۔ کُسے نا کے چارا......! اللہ سُہو نے نی مرضی، جہیڑا کی مرضی لخی شوڑے کوئی اُس نا قلم پوڑی سکنا؟ انسانیت انسانے وِچ ہونی پُتر وتُس جتھیں اُس لوڑنیا اتھیں اُس ناکے کم''؟

اسلم کی ماں اتنا کہہ کر اٹھ گئی اور امجد اور اس کے دوست پتھر بنے بیٹھے رہ گئے۔ وہ انہی سوچوں میں گم تھا کہ بس کا زوردار ہارن بجنا شروع ہو گیا۔ وہ چاروں اٹھے اور گاڑی پر سوار ہو گئے۔ ابھی وہ ٹوپہ تک ہی پہنچے تھے کہ برفباری شروع ہو گئی۔ اوپر سے بس کی رفتار بھی بہت آہستہ تھی۔ ڈرائیور ہر موڑ پر زور دار ہارن بجاتا اور اوپر پہاڑی کی طرف دیکھتا شاید کوئی ایک آدھ سواری مل ہی جائے۔ ٹوٹی پھوٹی تنگ دامن سڑک جس پر گاڑیوں کی رفتار ۱۵/۲۰ کلومیٹر سے اوپر نہیں جا سکتی تھی ڈرائیور کی آس امید اسے مزید کم کیے دیتی تھی۔ گویا اس کا چلنا اور کوئے یار سے نکلنا ایک برابر تھا۔ ان حالات میں انہیں اپنا پنڈی پہنچنا مشکل نظر آنے لگا۔ دو گھنٹے دھکے کھانے کے بعد جب وہ جسہ پیر کے مقام پر پہنچے تو پتہ چلا کہ رات کو ہونے والی بارش ایک فرلانگ سڑک

کو اپنے ساتھ لے کر کھسکتی ہوئی نیچے سرسوں کے کھیتوں میں جا رکی ہے۔ اور جہاں سے سڑک گزرتی تھی وہاں سے اب آدمی کا گزرنا بھی محال تھا۔ مسافر اس نئی صورتحال کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے، نیچے اترے اور کافی دیر تک ادھر ادھر گھوم پھر کر پیچ و خم کھاتے اور بھیگتے ہوئے واپس گاڑی میں آ کر بیٹھ گئے۔ سب کو پتہ تھا کہ آگے جانا ناممکن ہے لیکن اس کے باوجود کوئی بھی پیچھے جانے کو تیار نظر نہ آتا تھا۔ جیسے ہر کوئی معجزے کے انتظار اور امید میں ہو کہ کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا، کوئی راستہ نکل ہی آئے گا۔

یہ مٹی بھی اپنے اندر عجیب تاثیر رکھتی ہے کبھی تو یہ انتہائی مایوس کن حالات میں بھی امید کے سہارے انسان کو زندہ رکھتی ہے اور کبھی ہوا کے ہلکے جھونکے سے اس کے خواب نگر میں کھلے پھولوں کی پتیاں بکھر جاتی ہیں۔ مایوسی اور امید دونوں اپنے اندر مثبت اور منفی پہلو لیے ہوئے ہیں۔ حالات سے مایوس ہو کر خدا سے ناراض ہو بیٹھنا یا پھر زندگی کو بوجھ سمجھ لینے کے رویے فرد کو تاریکی میں دھکیل دیتے ہیں۔ اسی طرح اچھے وقت کی امید میں دستیاب مواقع اور وقت کو گنوا دینا امید کا وہ تاریک پہلو ہے جس کی کوکھ سے فقط خود فریبی ہی نہیں اور بھی کئی بیماریاں جنم لیتی ہیں۔ امید اور مایوسی کے منفی اثرات وہ کینسر ہے جو فرد اور تحریک کی زندگی سے جان نکال دیتا ہے۔ زندگی فقط سانس لینے یا روائتی و تقلیدی نقل و حرکت کا نام نہیں ہے بلکہ ہر سانس ایک آزاد سانس کے لیے لڑتے رہنے کا نام زندگی ہے۔

ایک زندہ آدمی پورے قبرستان کو شہر میں بدل سکتا ہے جبکہ ایک ہزار مُردے مل کر بھی آزادی کا نعرہ نہیں لگا سکتے۔

مُردے اپنی قبروں سے باہر نہیں نکل سکتے، یہ قبریں مٹی کی ہوں یا خواہشات کی۔ خواہشات کی قبروں والے مُردے پورے پورے شہروں کو قبرستان میں بدل دیتے ہیں۔ یہی وہ لاشیں ہوتی ہیں جن پر قوموں کے مقبرے بنتے ہیں۔ لاشوں کے ڈھیر تلے دبے ہوئے ذی روح بھی تعفن کا شکار ہو کر دم توڑ دیتے ہیں۔

امجد اور اس کے دوست کافی دیر کہو (جنگلی زیتون) کے نیچے چپ چاپ کھڑے رہے۔

''کیا کرنا چاہیے''؟ امجد نے دوستوں سے رائے لی۔

''جانا تو ضروری ہے''۔ایک نے جواب دیا۔

''پر کیسے جائیں اس کی بھی تو وضاحت کرو''۔اختر نے اسے ٹوکا۔

''سلائیڈ کراس کر کہ آگے چلتے ہیں شاید کوئی صورت نکل آئے......کم از کم پیچھے جانے یا کھڑے رہنے سے تو بہتر ہے''۔

امجد نے باقیوں کی طرف دیکھا تو انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔تھوڑی دیر بعد وہ بس والے سے رخصت ہو کر روانہ ہو گئے۔انہیں سڑک سے نیچے اتر کر ایک لمبا چکر کاٹنا پڑا۔ برف تیز ہو گئی اور وہ زیادہ دور تک دیکھنے کے قابل نہ رہے۔آگے کوٹھے پر ایک آدمی ''پُولیس'' پہنے لات دے رہا تھا۔اختر نے اس سے پوچھا:

''بھائی صاحب اوپر سڑک کی طرف راستہ کدھر سے جاتا ہے''؟

''کہاں سے آئے ہو بھائیو''؟ سوال کے بدلے سوال کرنے والا مرد نہیں عورت تھی۔ شاید اس کا مرد فوج میں کسی سرحدی مورچے میں بیٹھا ہوگا۔یا پھر مشرق وسطیٰ کے کسی صحرا کی ریت بن رہا ہوگا۔

''سڑک سے ہی نیچے اترے ہیں''۔اختر نے دوستوں کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''تو پھر جدھر سے اترے ہو ادھر سے ہی اوپر چڑھ جاؤ''۔عورت نے جواب دیا۔

وہ چاروں سر جھکا کر چل دیے۔انہیں احساس ہو رہا تھا کہ سڑک سے ان کا فاصلہ کم ہونے کی بجائے بڑھ رہا ہے۔بہر حال وہ کوئی ایک ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت کے بعد سڑک تک چڑھ آنے میں کامیاب ہو گئے۔تھوڑی دیر چلنے کے بعد وہ نکا بازار پہنچ گئے۔بازار کے کونے میں چھوٹے سے ہوٹل نے انہیں خوش آمدید کہا۔مٹی کے تیل والے اسٹوو کی شاں شاں نے پورا ہوٹل سر پر اٹھا رکھا تھا۔پانچ سات آدمیوں میں گرما گرم چائے اور سیاسی بحث چل رہی تھی۔چائے والا چائے پھینٹ رہا تھا اور چائے کی اڑتی ہوئی خوشبو انہیں بے قرار کر رہی تھی۔بحث میں مشغول لوگوں نے باری باری ان اجنبیوں کو دیکھا اور پھر اپنے کام میں لگ گئے۔

''کہاں سے آ رہے ہو''؟ ہوٹل والے نے چائے ان کے سامنے رکھتے ہوئے پوچھا۔

''راولاکوٹ سے''۔

''کیسے پہنچے ہو سڑک تو ٹوٹ چکی ہے''؟ ہوٹل والے نے اپنے لمبے اونی کوٹ کی جیب سے سگریٹ نکالتے ہوئے پوچھا۔

''ہماری گاڑی تو واپس ہوگئی ہے،ہم پیدل چل کر آئے ہیں''۔اختر نے اسے جواب دیا۔

''پنڈی جا رہے ہو کیا''؟ ہوٹل والا سگریٹ سلگا کر اپنے فینسی لائٹر کو دیکھ رہا تھا۔

''یہ لائٹر تو دکھائیں چاچا''۔اختر نے اس سے درخواست کی۔

''پہلے میرے سوال کا جواب دو''۔وہ کچھ ناراض سا دکھائی دیا۔

''ہاں جی ہم پنڈی جا رہے ہیں آپ ہماری کیا مدد کر سکتے ہیں''۔اختر نے کسی قدر طنزیہ انداز میں کہا۔

''دیکھو لڑکو مجھے اتنا گیا گزرا بھی نہ سمجھو، چاہوں تو پہنچا بھی سکتا ہوں، لیکن یہ بتاؤ کہ نوکری پیشہ تو لگتے نہیں ہو ایسا کیا ضروری کام ہے کہ اس موسم میں گھر سے نکلے ہو۔کہیں سعودیہ کی بھرتی ہو رہی ہو تو بتاؤ اپنے لڑکے کو بھی تمہارے ساتھ کر دوں''۔ہوٹل والے نے گویا تفتیش شروع کر دی۔

''نہیں چاچا ایسی کوئی بات نہیں ہے ہم نہ تو نوکری کرتے ہیں نہ کہیں بھرتی ہونے جا رہے ہیں''۔اختر نے جواب دیا۔

اس سے پہلے کہ وہ یہ الزام لگاتا کہ کوئی واردات کر کہ بھاگ رہے ہو امجد نے اسے کہا۔

''چاچا اگر آپ کے پاس بند ہوں تو دے دیں''۔

''ارے بند تو بہت ہیں، کتنے کھاؤ گے،دو دو دے دوں سب کو''؟ چاچا نے خوش ہو کر پوچھا،

''ہاں جی دے دیں''۔

اتنے میں ایک نوجوان ہوٹل میں داخل ہوا۔اسے دیکھ کر وہ چاروں چونک پڑے اور خوشی سے کھڑے ہو کر اسے ملنے لگے۔حفیظ ان کا کالج فیلو تھا۔انہوں نے ایکدوسرے کے حال احوال لیے۔

''اس موسم میں گاڑی کا ملنا کسی معجزے سے کم نہ ہوگا،بہتر ہے کہ تم لوگ رات میرے

ساتھ گزارو کل تک شاید کوئی صورت نکل آئے''۔نو وارد نے اپنے دوستوں کو تجویز دی۔

چاچا نے اس کے سامنے چائے رکھتے ہوئے پوچھا'' یہ تمہارے دوست ہیں''؟

'' ہاں چاچا یہ میرے دوست ہیں''۔نوجوان نے جواب دیا۔

'' دیکھو نصیب جان کا لڑکا آیا ہوا ہے اس نے آج واپس جانا تھا پتہ کرو اگر ماں نے روکا نہیں ہے تو یہ لوگ اس کے ساتھ جا سکتے ہیں''۔چاچا نے نوجوان کو مشورہ دیا۔

'' چاچا آپ اپنے بھانجے میجر نسیم کی بات کر رہے ہیں''۔حفیظ نے دریافت کیا۔

'' میرا بھانجا ہوا کرتا تھا جب میرے کندھے پر سواری کرتا اور پستول کا نشانہ لگانا سیکھا کرتا تھا''۔ چاچا نے جواب دیا۔

میجر ابھی تک ماں کے لیے Minor ہی تھا اس لیے روک دیا گیا۔ان کے لیے رات رکنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا لیکن انہوں نے سوا کراس تک پیدل جانے کا فیصلہ کرلیا کہ ہجیرہ ،عباسپور یا کہوٹہ سے آنے والی کوئی نہ کوئی گاڑی مل ہی جائے گی۔حفیظ بھی ان کے ساتھ ہولیا۔ ان کی خوش قسمتی کہ منگ سے انہیں یو این او کی ایک جیپ مل گئی جو پلندری جا رہی تھی۔وہ مغرب سے ذرا پہلے سوا کراس پر پہنچے۔ بہت دیر انتظار کے بعد انہوں نے پھر پیدل چلنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر چلنے کے بعد انہیں دور آگ جلتی نظر آئی۔رات کے وقت اتنی شدید سردی اور ویرانے میں آگ کا کیا کام۔تجسّس کے ساتھ ساتھ انہیں کچھ الجھن بھی ہوئی، کسی نے کسی سے کوئی بات نہ کی اور چلتے رہے۔بچپن میں ان سب نے چڑیلوں اور بلاؤں کے قصے سن رکھے تھے۔امجد کے ایک پڑوسی فوجی کا کلیجہ ہی چڑیل نے نکال کھایا تھا جب سردیوں کی ایسی ہی ایک رات کو وہ گھر آرہا تھا۔دوسری صبح نالے کے کنارے اس کی لاش پڑی ملی تھی۔منہ سے نکلے ہوئے خون سے اس کی قمیض لال ہوگئی تھی۔اور برف پر کسی ''چیز'' کے ننگے پاؤں کے نشانات صاف نظر آرہے تھے۔ تب سے کم ہی لوگ رات کو اس راستے پر چلتے تھے۔

کتنی بار تو انہوں نے خود چڑیل کو رات رات بھر روتے ہوئے سنا تھا۔کتنی خوفناک آواز ہوتی تھی اس کی۔ہُو ہُو کرتی ہوئی جب وہ نکلتی تھی تو کتے اس کے پیچھے ہو جاتے تھے۔گھر میں کتے کا بڑا سہارا ہوا کرتا تھا، چور سے لے کر چڑیل تک کسی کو گھر کے سامنے نہیں آنے

دیتا تھا۔ حفیظ کے گھر میں تو کوئی ''چیز'' کتے کو ٹکنے ہی نہیں دیتی تھی۔ کتنے اچھے اچھے شکاری کتوں کے کلیجے اس نے چاٹ لیے تھے۔ سنا ہے کتوں کو مارنے والا ''مسان'' ہوتا تھا۔ خود امجد کے گھر کے پچھواڑے تو چڑیل کا پکا ڈیرہ تھا۔ کتنی مرتبہ اس کی والدہ نے اسے مغرب کے وقت کنگھی کرتے دیکھا تھا۔ تبھی تو بچوں کو اس طرف نہیں جانے دیا جاتا تھا۔ اب بھی امجد رات کو جب دیر سے گھر آتا تو وہاں سے گزرتے ہوئے اس کے بال کھڑے ہو جاتے اور وہ اس جگہ سے بہت تیزی سے گزر جاتا۔ یہ بلائیں شرارتیں بھی بہت کرتی تھیں۔ ڈولے میں رکھا دہی کھا جاتیں، رات رات کو بھینس کا دودھ پی جاتیں، مرغیوں کی گردنیں مروڑ کر مار دیتیں، بچوں کو ڈرا لیتیں اور وہ پوری پوری رات روتے رہتے۔ مولوی صاحب دم ڈالتے تو آرام آتا۔ اختر کے ایک پڑوسی کو کسی ''چیز'' نے بچپن میں ایسا زور کا چانٹا مارا کہ بچارا بھینگا ہو گیا۔ کتنے لڑکے اور لڑکیاں ایسے ہیں جنہیں ان چیزوں کا سایہ ہو جاتا ہے۔ زندگی بھر جان نہیں چھوڑتے۔ بعض چیزیں تو اتنی سخت ہوتی ہیں کہ بڑے بڑے عامل بھی کچھ نہیں کر پاتے۔ خوب مار کٹائی کی حتیٰ کہ مرچیوں کی دھونی بھی دے دی پر مریض کو آفاقہ نہ ہوا۔ کتنے بچاروں کی تو جان نکل گئی پر جن نہ نکلا۔

سب کو اپنے بچپن کے واقعات یاد آرہے تھے۔ اور یہ موسم بھی تو اس مخلوق کے لیے بڑا آئیڈیل تھا۔ مگر وہ کچھ بولے نہیں اور ایک دوسرے کے سہارے چلتے رہے۔ ذرا قریب پہنچے تو آوازیں بھی آنا شروع ہو گئیں۔ گویا یہ کوئی بڑا ڈیرا تھا جہاں کم و بیش ایک آدھ کنبہ آباد تھا۔ لیکن وہ ہر طرح کے حالات کے مقابلے کو تیار تھے۔ مدت سے ان کے قصے سنتے آرہے ہیں آج سر پہ آپڑی ہے تو دو دو ہاتھ ہو ہی جائیں۔ لیکن جب بالکل قریب پہنچے تو جنات سے بھی زیادہ سخت جان مخلوق سے سامنا ہوا۔ ایک ڈرائیور، کنڈکٹر اور ہیلپر۔ ان کے ٹرک نے چڑھائی چڑھتے ہوئے ٹائی راڈ توڑ دیا تھا اور وہ ایک ''بجّی باری'' سلور کی کیتلی میں پتی ابال کر قہوہ تیار کر رہے تھے۔ وہ ان کے پاس رک کر آگ تاپنے لگے۔ تھوڑی دیر میں قہوہ تیار ہو گیا جس سے ان کی تواضع کی گئی۔ ''لُھوٹھ'' لگا ہوا یہ قہوہ انہیں ووڈ کا سے بھی زیادہ اچھا لگا۔ گاڑی کا ڈرائیور پچاس کے پیٹے میں تھا اور خاصا دلچسپ آدمی معلوم ہوتا تھا۔

اختر نے اس سے پوچھا ''استاد جی ڈرائیور کیسے بنے''؟

استاد جی نے اپنے کنڈکٹر اور ہیلپر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس اچانک سوال کا فر فر جواب دیا ''ان سے پوچھو''۔

ہیلپر کی عمر ۱۵ سال تھی اس کے چہرے سے معصومیت ٹپک رہی تھی، آنکھیں نیند کی وجہ سے اندر دھنسی ہوئی اور ہاتھ موبل آئل سے سیاہ ہو چکے تھے۔ ہاتھ سے بُنی ہوئی سویٹر کا گلا اُدھڑا ہوا تھا اور پلاسٹک کے جوتے ٹوٹے ہوئے تھے۔ وہ باری باری سب کو چائے پلا رہا تھا۔ کنڈکٹر ۲۲/۲۳ سال کا کڑیل جوان تھا لیکن اس کے کپڑوں کی حالت بھی کچھ اچھی نہ تھی۔ اس نے شاید ہاتھ دھونے کی کوشش کی تھی لیکن انہیں صاف کرنے میں ناکام رہا تھا۔ گاڑی کا ٹوٹا ہوا ٹائی راڈ کھولنے میں ان دونوں کی حالت ناگفتہ بہ ہو چکی تھی۔ اسے کچھ کچھ اندازہ ہو گیا تھا کہ ڈرائیور کیسے بنا جاتا ہے۔

''دیکھو میرے عزیز و علم بڑی دولت ہے۔ یہ بات ہم اپنے بڑوں سے سنا کرتے تھے لیکن سمجھ نہیں آتی تھی...... اب سمجھ آ رہی ہے اور دکھ بھی ہوتا ہے۔ سڑک پر لگے ہوئے انگریزی میں لکھے بورڈ میرا مذاق اڑاتے رہتے ہیں اور مجھے اپنے باپ کی نصیحتیں رہ رہ کر یاد آتی ہیں''۔ استاد جی نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

''آپ ان کی نصیحتوں پر عمل کیوں نہ کر سکے''۔ اختر کے اس سوال پر سب نے ہی اسے گھورا۔

''اللہ والد صاحب کی مغفرت کرے بابو جی...... مجھے پڑھانے کی انہوں نے بڑی کوشش کی لیکن نصیحت کچھ اس انداز سے کرتے تھے کہ الٹا اثر ہوتا تھا۔ پھر گھر سڑک کے کنارے تھا اور گاڑیاں چلتے پھرتے اچھی لگتی تھیں۔ انسان کو چاند پر جانے کا اتنا شوق نہ ہوا ہو گا جتنا مجھے گاڑی چلانے کا شوق تھا۔ سو بابو جی اللہ نے پورا کر دیا۔ انسان جو شوق پالتا ہے اس کی پرورش بعض اوقات اپنے خون سے کرنا پڑتی ہے''۔ استاد جی نے جواب دیا۔

قہوہ پینے کے بعد استاد نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ آزاد پتن تک چلے جائیں وہاں انہیں کھانے پینے اور سونے کی پریشانی نہ ہو گی۔

''تو آپ لوگوں کا کیا پروگرام ہے'؟' اختر نے اس سے پوچھا۔

''ہمارا پروگرام ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے وہ اوپر سے بن کر آتا ہے اس لیے پریشانی کی ضرورت نہیں ہے آپ لوگ جائیں''۔ استاد جی نے جواب دیا۔

''لیکن پھر بھی آپ کی رات کیسے کٹے گی''؟ اختر نے پھر پوچھا۔

''ہماری تو زندگی یونہی کٹ رہی ہے باؤ جی آپ ایک رات کی بات کرتے ہیں''۔ استاد جی نے چوتھی اور پانچویں انگلی میں دبے ہوئے سگریٹ کا گہرا کش لگا کر جواب دیا۔

''ہم انہی سڑکوں پر پلے بڑھے، جوان ہوئے، اب تو اُترائی لگے ہیں''۔ ڈرائیور نے پھر بولنا شروع کیا۔

''جانے کب بریک فیل ہو جائے، ٹائی راڈ ٹوٹ جائے، انجن سیز ہو جائے......۔

یہ منگ روڈ دیکھی ہے باؤ جی بالکل زندگی کی طرح ہے!

ٹوٹی پھوٹی، اونچی نیچی موڑ پہ موڑ اور گہری کھائیاں۔ سٹیرنگ کنٹرول میں رہنا بڑا ضروری ہے بابو جی۔ لیکن ہم اسے سیدھا نہیں رکھتے۔ گاڑی تو سڑک پر ہے لیکن زندگی سڑک سے اتری ہوئی ہے......۔

ہم صدا کے مسافر ہیں صبح شام سفر، دن رات سفر......، صدا بہار مسافر، ہم دوہرے مسافر ہیں باؤ جی۔ ہمارا ایک دن لوگوں کے کئی کئی دنوں کے برابر ہے۔ پھر بھی پتہ نہیں کیا بات ہے بابو جی یہ منگ روڈ ہمیں پنجاب کی سیدھی سڑکوں سے اچھی لگتی ہے۔ آدھی زندگی پنجاب کی سڑکوں پر گزر گئی ہے لیکن آج بھی پتن کا پل پار کر کے دل تھوڑا تھوڑا ہونے لگتا ہے۔ واپسی پر پل گزرتے ہی لگتا ہے ماں نے اپنی گود میں لے لیا ہے۔ جسم میں نئی روح داخل ہو جاتی ہے۔ جیسے کبوتر پنجرے سے نکل کر اونچی اڑان بھرتے، قلابازیاں کھاتے اور خوش خوش ہو جاتے ہیں یہی حال ہمارے دل کا ہوتا ہے۔ اپنی مٹی بھی کیا شے ہے بابو جی بے زبان ہے لیکن لوریاں سناتی ہے۔ ہمارا دل بھی اسی پر دکھ سکھ کھولتا ہے۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں لوگ پردیس میں کیسے جی لیتے ہیں۔ پتہ نہیں جیتے بھی ہیں کہ نہیں''۔

ڈرائیور کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں اس نے ایک اور سگریٹ سلگایا اور خاموش ہو گیا۔

''او بنکیا دیکھ ذرا کیتلی میں کچھ بچا ہے تو مہمانوں کو پلا کر رخصت کرو''۔ استاد جی نے

لڑکے سے کہا۔

اتنے میں دولڑکے لالٹین کی روشنی میں نمودار ہوئے۔وہ ڈرائیور اور اس کے ساتھیوں کے لیے کھانا لے کر آئے تھے۔مکئی کی روٹیاں کڑی مکھن اور چھوٹی بالٹی میں پانی۔امجد اور اس کے ساتھی بمشکل اجازت لے کر روانہ ہو گئے۔

آزاد پتن پہنچ کر وہ ایک ہوٹل پر رکے کھانا کھایا اور ہوٹل والے کے ساتھ مل کر ایک ٹین میں آگ جلا کر تاپنے لگے۔دس بجے کے لگ بھگ ہوٹل والے نے انہیں ایک کمرہ مع دو چارپائیوں ،ضعیف ونحیف تلائیوں اور مسکین صورت بدبُو دار رضائیوں کے حوالے کیا اور اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑے فخر سے کہا:

''یہ شاہی بستر ہیں شاہی،تمہارے بڑے بڑے وزیران پر سوئے ہیں۔آج کی رات تمہارے بھی نصیب جاگے ہیں،دیکھنا کیسی مزے کی نیند آئے گی''۔

رات کا زیادہ تر حصہ انہوں نے جاگتے گزار دیا۔انہیں پہلی بار احساس ہوا کہ یہ ڈرائیور کنڈکٹر لوگ کس قدر مشقت کی زندگی گزارتے ہیں۔

''امجد صاحب' حفیظ بولا' یہ ڈرائیور تو ان پڑھ آدمی ہے لیکن کیسی عجیب باتیں کر رہا تھا''۔

''زندگی سِکھا دیتی ہے دوست' امجد نے جواب دیا' بعض لوگ بہت کچھ پڑھ کر بھی کچھ نہیں سیکھ پاتے اور بعض لوگ ان پڑھ رہ کر بھی زندگی کا راز پا لیتے ہیں''۔

''کیا وجہ ہے''؟اختر نے پُوچھا۔

''وجہ یہ ہے کہ زندگی اس کی سمجھ میں آتی ہے جو اسے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے' امجد نے بولنا شروع کیا' جو سچ کو گلے لگا کر اس کا سامنا کرتا ہے زندگی اس پر اپنا سینہ کھول دیتی ہے۔جو زندگی سے آنکھیں چراتے ہیں زندگی ان پر کبھی اپنی حقیقت کو نہیں کھولتی۔تعلیم انسان کے خمیر کو نہیں بدل سکتی بلکہ اکثر صورتوں میں یہ اسے تقویت پہنچاتی ہے''۔

''مجھے تو سمجھ نہیں آئی'' حفیظ بولا۔

امجد نے پانی پیا،سگریٹ سلگایا اور بولا۔

''دیکھو بات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ کوئی مثال پیش کی جائے۔ آزاد کشمیر میں فی الحال ایسی صورتحال موجود نہیں ہے اس لیے آؤ پاکستانی معاشرے پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ پاکستانی معاشرہ اس وقت تین بڑے طبقات میں بٹا ہوا ہے۔ ایک طرف جاگیردار اور سرمایہ دار ہیں تو دوسری طرف کسان اور مزدور جبکہ ایک تیسرا طبقہ مڈل کلاس ہے۔ مڈل کلاس کا تعلق بھی محنت کشوں سے ہے مگر یہ ان سے قدرے بہتر زندگی گزار رہا ہے، اس لیے اُن سے لاتعلق سا رہتا ہے۔ جاگیردار اور سرمایہ دار طبقہ جتنا مرضی تعلیم حاصل کر لے یہ ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑے گی۔ ان کے اندر کا چھپا ہوا جاگیردار یا سرمایہ دار کبھی نہیں مرتا۔ بلکہ اس تعلیم کے ذریعے وہ استحصال کے نت نئے طریقے ایجاد کرتا ہے جو اس کے اقتدار کو دوام بخشتے ہیں۔ سندھ پنجاب اور بلوچستان کا تعلیمیافتہ جاگیردار سکول کے نام سے خوفزدہ ہے اور وہاں پر سکول کھولنا ناممکن ہے۔ سرمایہ دار طبقے نے پاکستان میں انگریز کے جاری کردہ طبقاتی نظامِ تعلیم کو مزید مستحکم کیا ہے۔ یہ نظام تعلیم اس کے لیے ڈاکٹر، انجنیئر، کلرک، پروڈکشن ورکر، فنانس اور مارکیٹنگ کی ٹیمیں تیار کرتا ہے ساتھ ہی ملک کے لیے سپاہی، پولیس، پٹواری اور ''ملازم حسین''، ''غلام حسین''، ''مسکین علی'' جیسے سکول ٹیچر وغیرہ پیدا کرتا ہے۔

اس مخصوص تعلیم سے ملک کے اندر سے پسماندگی بھی ختم نہیں ہوتی اور اونچے طبقے کے مفادات بھی احسن طور پر پورے ہوتے رہتے ہیں۔ یہ نظامِ تعلیم نوکر پیدا کرتا ہے اور اس نوکر کے اندر ملک پر مسلط کیے گئے استحصالی نظام کی تبدیلی کی کوئی فکر پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ بلکہ ان کی پوری زندگی اس کوشش میں صرف ہو جاتی ہے کہ کس طرح وہ اس رائج نظام میں اپنی جگہ بنا سکیں۔ وہ انفرادی ترقی پر یقین رکھتے ہیں، ان کا معیارِ زندگی بہتر ہو جائے یہی ان کے نزدیک ترقی ہے۔ اجتماعی طور پر معاشرہ کس سمت میں جا رہا ہے اس سے انہیں کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ دوسرے لفظوں میں اگر یہ کہا جائے کہ وہ بھی بالا دست طبقے کی طرح خود غرض ہو جاتا ہے تو بے جا نہ ہو گا کہ اس کی تعلیم و تربیت ہی انہی خطوط پر ہوئی ہوتی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام اپنی ضرورت کی حد تک ایسے لوگوں کو absorb کرتا رہتا ہے اور یوں یہ لوگ لوئر مڈل کلاس سے مڈل کلاس اور اپر مڈل کلاس تک بمطابق گنجائش سفر کرتے رہتے ہیں اور اس غلط فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ وہ ترقی کر

رہے ہیں۔ حالانکہ وہ ترقی نہیں کر رہے ہوتے بلکہ وہ حکمران طبقے کے ساتھ مل کر معاشرے کا استحصال کر رہے ہوتے ہیں۔ مڈل کلاس کا حجم جتنا بڑا ہوتا جائے گا اتنا معاشرہ تبدیلی سے دور ہوتا جائے گا۔ دراصل یہی مڈل کلاس انقلاب کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اس کی امیدیں، خواہشات اور وقتی وانفرادی کامیابیاں انقلابی پارٹیوں کو چاٹ جاتی ہیں"۔

امجد مسلسل بولے جا رہا تھا۔

"آپ نے دیکھا کہ ان تینوں طبقات کے خمیر پر تعلیم نے کیا اثرات مرتب کیے۔ ذوالفقار علی بھٹو ایک بڑا سیاستدان ہے، وہ ایک بڑا لیڈر رہے۔ اس کے اندر بڑی صلاحیتیں ہیں وہ ایک حساس انسان ہے، اپنے ملک کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہے۔ مگر اس کے اندر کا جاگیردار اس کے راستے میں کھڑا ہے۔ وہ کسی صورت بھی اسے اس ملک میں ایک جینوئن تبدیلی کے لیے استعمال نہیں ہونے دے گا۔ وہ سوشلزم کی بات تو کرتا ہے مگر سوشلزم کے تقاضوں کو پورا کرنا اس کے بس کی بات نہیں۔ اس نے اگر چاہا بھی تو اس ملک کا حکمران طبقہ اسے ہرگز اس کی اجازت نہ دے گا۔

اندرا گاندھی بھی ایک بڑی لیڈر رہے اس وقت ان دونوں کے پاس ایک بہترین موقع تھا کہ وہ مسئلہ کشمیر کا مثبت حل تلاش کرتے اور بتدریج اس کا اطلاق عمل میں لاتے مگر انہوں نے اس مسئلے کا جو حل نکالا ہے وہ بارود کے ڈھیر پر تیل چھڑکنے کے مترادف ہے۔ فقط کشمیری ہی نہیں اس پورے خطے کی آنے والی نسلیں ان دو لیڈروں کے اس فیصلے کی سزا بھگتیں گی۔ ہم جب کشمیر کی آزادی وخودمختاری کی بات کرتے ہیں تو کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ پاکستان کے دشمن ہیں۔ حالانکہ ہمارے اس مطالبے اور حل میں نہ صرف پاکستان بلکہ پورے خطے کے انسانوں کی بھلائی ہے۔ مگر سامراج کے کاسہ لیس حکمران اور ہمارے ہاں ناچنے والی کٹھ پتلیاں اس مطالبے کو تقویت نہ دے کر دراصل عوام دشمنی کا ثبوت دے رہے ہیں۔

اب آیئے محنت کش طبقہ کی طرف جس میں مزدور اور کسان دونوں شامل ہیں۔ جب بھی اور جہاں بھی کوئی تبدیلی آئی اسی طبقے کے ہاتھوں آئی ہے۔ نوحؑ سے لے کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک اور اس کے بعد کے انقلابیوں کا ساتھ اسی طبقہ نے دیا ہے۔ جب محنت کش طبقہ صف آراء ہو جاتا ہے

اور تبدیلی کی ہوا چل پڑتی ہے تو مڈل کلاس بھی ان کی صفوں میں شامل ہو جاتی ہے۔

اس ساری بات کا حاصل یہ ہے دوستو کہ ہم جس آزادی کی بات کر رہے ہیں اس سے مراد زمین کے ایک ٹکڑے کی آزادی نہیں بلکہ اس آزاد وطن کے اندر ایک ایسے معاشرے کا قیام ہے جو ہر طرح کے استحصال سے پاک ہو۔ جس میں ہر فرد کے لیے تعلیم، صحت، روزگار کے برابر مواقع میسر ہوں۔ ہر ایک کو پیداواری عمل میں اس کی محنت کے بقدر حصہ ملے۔ نجی ملکیت کو مکمل طور پر ختم کر کہ ریاستی تحویل میں دے دیا جائے۔ ریاست معاشرے میں معاشی و سماجی عدل اور امن و امان کی ضامن ہو۔ سوشلزم کا مدعا مقصد یہی ہے۔ اس کے لیے ایک طویل اور صبر آزما جدوجہد کی ضرورت ہے اور ہمیں اس کے لیے خود کو تیار کرنا ہے"۔

صبح کے قریب انہیں نیند نے آلیا اور وہ سو گئے۔ جب اٹھے تو نو بج رہے تھے۔ ہوٹل والے نے انہیں منہ دھونے کے لیے گرم پانی دیا۔ ابھی وہ ناشتہ کر ہی رہے تھے کہ ایک بس آ کر رکی۔ مسافر چائے پانی سے فارغ ہوئے تو بس چل پڑی۔ ا بجے کے قریب وہ راولپنڈی پہنچ گئے۔



''دیکھو ایوب میں چھپ چھپ کر ملنے سے اب تنگ آ چکی ہوں'' غصے سے اس کا چہرہ لال سُرخ ہو رہا تھا۔

''بیٹھو تو سہی' ایوب نے کہا' آج تمہیں کیا ہو گیا ہے''۔

''میں بیٹھنے نہیں آئی تمہیں یہ بتانے آئی ہوں کہ میرے ماں باپ کو راضی کرو''۔

''ایک سال سے اس کوشش میں لگا ہوا تو ہوں لیکن وہ نہیں مان رہے تو میں کیا کروں''۔ ایوب نے کہا

''تو پھر بتاؤ میں کیا کروں''؟

''تمہارے ماں باپ ہیں تم بھی کوشش کر کہ دیکھو''۔

''تمہارا کیا مطلب ہے میں خاموش بیٹھی ہوں''؟

''پھر اس کا کیا حل نکالیں'' ایوب نے اس سے پوچھا۔

''مجھے نہیں پتہ ہے یہ تمہارا کام ہے''۔

''دیکھو رفعت اگر تمہارے والدین کا اعتراض یہ ہوتا کہ ہم لوگ تمہارے ہم مذہب نہیں ہیں تو میں اپنا مذہب ترک کر دیتا، اپنے والدین، بہن بھائی، خاندان، برادری، رشتے ناطے سب کچھ چھوڑ دیتا اور تمہارا دین اختیار کر لیتا۔ لیکن اب تم ہی بتاؤ کہ اگر میں چوہدری اور تم سیّد ہو تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ میں ماں باپ کو چھوڑ بھی لوں لیکن شجرہ تو نہیں بدل سکتا''۔ ایوب نے کہا۔

''میری تو کوئی بات سننے کو بھی تیار نہیں''۔ عفت نے کہا۔

''تم خود سوچو' ایوب نے کہا' کیا ہمارے نبی ﷺ کی تعلیمات یہی ہیں جن پر ہمارے والدین کاربند ہیں''؟

''نبی ﷺ کی تعلیمات پر اور کون چلتا ہے جو ہمارے والدین چلیں گے۔'رفعت نے کہا۔'مذہب کو تو لوگوں نے ہتھیار بنا رکھا ہے۔ بڑے بھائی کا اپنا مذہب ہے، ماں باپ کا اپنا، مولوی کا اپنا، عدالت کا اپنا اور حکومت کا اپنا۔

نبی ﷺ کا مذہب ہے کہاں پر بتاؤ تو سہی۔اور ہر کوئی ہر کسی کو...... اپنے بیٹے، بیٹی کو، رشتے کو، کمی کمین کو، مسکین کو اپنے مذہب کی بھینٹ چڑھا رہا ہے۔اور اگر بھینٹ نہیں چڑھائے گا تو مذہب کیسے باقی رہے گا۔صدیوں سے یہ مذہب انہی قربانیوں پر زندہ ہے ورنہ تو کب کا مٹ گیا ہوتا''!

اتنا کہہ کر وہ بیٹھ گئی اور رونا شروع ہوگئی۔ بہت دیر وہ روتی رہی اور ایوب خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔

یہ کالج کے پچھواڑے ایک ویرانہ تھا جس میں ان کی محبت کے پھول کھلتے تھے۔مگر اب لگتا تھا کہ پھولوں کا یہ موسم ان سے الوداع ہونے کو ہے۔رفعت کا بی اے کا امتحان نزدیک تھا اور اس امتحان کے بعد اسے جانے کون کون سے امتحانوں سے گزرنا تھا۔ بہرحال اسے یقین ہو چلا تھا کہ اس کے ماں باپ کبھی بھی خاندان سے باہر اس کی شادی نہیں کریں گے۔وہ بی اے کے بعد اپنی تعلیم جاری رکھنا چاہتی تھی وہ سوتے جاگتے لیکچرار بننے کے خواب دیکھتی رہتی تھی لیکن اس کے اس خواب کو بڑے خدشات لاحق تھے۔ بلکہ اس کے سارے ہی خوابوں کو خدشات لاحق تھے۔اس کے ہر خواب کے سامنے ایک دیوار کھڑی تھی، ایک نہیں کئی کئی دیواریں...... دیواریں ہی دیواریں،...... غیرت کی دیوار، خاندانی شرافت کی دیوار، رسم و رواج کی دیوار، جہالت کی دیوار......

پر نبی ﷺ کا مذہب کیا ہے، کیا اس کی بھی کوئی دیوار ہے؟

یہ بات اس کے لیے سربستہ راز ہی رہی۔ باوجود کوشش کے وہ نہ جان سکی تھی کہ اس کا مذہب کیا کہتا ہے۔اسے اتنا پتہ تھا کہ نبی ﷺ کے مذہب نے عورت کو بڑا مقام دیا ہے۔

مگر وہ مقام ہے کہاں؟ وہ مقام اسے اب تک کی زندگی میں کہیں ملا نہیں تھا............ سرِ راہ بھی نہیں ملا تھا۔

کہیں کھو گیا ہے شاید!

تھک کہ رُک گیا ہے کہیں...... یا پھر ڈر کہ چھُپ گیا ہے!

کتنا مظلوم ہے، ڈھونڈ نکالو تو اُسے...... ارے کسی کو خبر ہے اُس کی کہاں ہے وہ؟
ارے دیکھو تو یہیں کہیں نہ ہو۔
کسی اجاڑ بیاباں میں دیکھو، گرد سے اَٹا مسافر تھکا ہارا پڑا ہوگا، دور سے شہر کو دیکھ رہا ہوگا۔
ارے کہیں بھی نہیں ہے۔
مسجد میں بھی نہیں ہے کیا؟
نہیں وہاں بھی نہیں۔
تو پھر جاؤ میاں محمد بخشؒ سے پوچھو ضرور اس کی پناہ میں ہوگا۔
بھئی اگر وہاں ہوا بھی تو اکیلا باہر نکلے گا نہیں۔
تو پھر کیا کریں؟
لوگوں سے پوچھو، وہ اسے اپنانے کو تیار ہیں؟
لوگ تو مار دیں گے اُسے۔
دیر بہت دیر دونوں خاموش بیٹھے رہے۔
آخر ایوب بولا۔
''دیکھو رفعت میں اپنی پوری کوشش کرتا ہوں لیکن اگر تمہارے گھر والے نہ مانے تو''؟
''تو کیا مطلب''؟
''میرا مطلب یہ ہے کہ پھر کیا کریں گے''؟ ایوب نے پوچھا۔
''پھر ہمارے کرنے کو کیا باقی رہ جائے گا''؟ رفعت نے کہا۔
''آخر اس کا انجام کیا ہوگا''؟ ایوب نے پوچھا۔
''جو اس سے پہلے ہوتا چلا آیا ہے وہی ہوگا اور کیا ہونا ہے''۔
''میں سمجھا نہیں''۔
''اس میں نہ سمجھ میں آنے والی کیا بات ہے' رفعت نے کہا' میں بھی قربانی کا بکرا بن جاؤں گی تم بھی بن جانا''۔

''مجھ سے تو یہ نہ ہوگا''۔ایوب نے اختلاف کیا۔

''مرد ہونا' رفعت نے کہا' جو مرضی کرو''۔

ایوب کو لگا جیسے رفعت کی چوڑیوں کی ساری کانچ اس کے دل میں اتر گئی ہو۔

پھر ہر طرف خاموشی چھا گئی ، گہری جھیل سی بے بس خاموشی ، دیکھنے میں پرسکون مگر بے قرار و مضطرب، سمندر کی موجوں کی طرح چیختی چلاّتی چٹانوں سے سر ٹکراتی خاموشی!

''اچھا میں اب چلتی ہوں''۔وہ دفعۃً اٹھ کھڑی ہوئی۔

ایوب اسے دیکھتا رہا لیکن نہ تو وہ بول سکا نہ اسے روک سکا۔قربان گاہ کی طرف جاتے ہوئے قربانی کے بکرے کو وہ دیکھتا رہا حتیٰ کہ وہ آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔مگر وہ بیٹھا رہا، چڑیاں گھروں کو لوٹ آئیں وہ بیٹھا رہا، سائے چھپ گئے، رات پڑی وہ بیٹھا رہا، کتے زمانے بھر کو گالیاں دیتے رہے وہ بیٹھا رہا۔

اگلے دو دن وہ گھر پہ پڑا رہا۔تیسرے دن صدیق اس کے کمرے میں آیا۔وہ لیٹا ہوا تھا۔

''ایوب کیا بات ہے تمہاری صحت خراب ہے''؟

''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں''۔

''پھر کیا بات ہے' صدیق نے پوچھا' دو دن سے تم نے گاڑی کی خبر نہیں لی''۔

''گاڑی کی کیا خبر لوں' اس نے جواب دیا' چل رہی ہوگی''۔

''اور کھڑی ہوگئی تو''؟ صدیق نے سوال کیا۔

''تو بھی میں نے کیا کرنا ہے مستری کا کام ہے کر لے گا''۔

صدیق کو سمجھ نہیں آ رہی تھی اسے ہوا کیا ہے۔وہ خاموشی سے باہر نکل گیا۔

''کیا کہہ رہا ہے''؟ ماں نے پوچھا۔

''الٹی سیدھی باتیں کر رہا ہے''۔صدیق نے جواب دیا۔

''دیکھ صدیق تو پریشان نہ ہو' ماں نے کہا' میں اس سے بات کرتی ہوں۔کسی بات پہ بگڑا ہوا ہے ٹھیک ہو جائے گا۔تُو تو اسے جانتا ہی ہے''۔

''ٹھیک ہے اماں میں چلتا ہوں مجھے دیر ہوگئی ہے''۔

ایوب نے بہت کوشش کی کہ خود کو سنبھالے لیکن اس کے بس میں نہ تھا۔ رفعت کا امتحان شروع ہونے والا تھا اس لیے اُس سے ملنا بھی محال تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کرے۔ وہ پورا پورا دن گھر میں پڑا رہتا نہ کچھ کھاتا پیتا نہ کسی سے بات کرتا۔ اس کی نیند ختم ہو چکی تھی اور وہ تقریباً نیم پاگل ہو چکا تھا۔ ایک دن وہ بے ہوش ہو گیا اسے ہسپتال لے جایا گیا جہاں وہ چند روز داخل رہا۔ کچھ حالت سنبھلی تو معروف جو اس کا قریبی دوست تھا والدہ سے اجازت لے کر اسے اپنے ساتھ لے گیا۔

''تمہیں کیا ہو گیا ہے ایوب، ایک لڑکی کے لیے پاگل ہو جاؤ گے''؟ معروف نے اس سے پوچھا۔

''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں''۔ ایوب نے جواب دیا۔

''سراسر حماقت ہے یار' معروف بولا' سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر یوں مجنوں بن جانا تمہیں اچھا لگتا ہے کیا''؟

''کل تک تم لوگوں پر ہنستے تھے، آج خود مجنوں بن گئے ہو۔ یہ سب عارضی باتیں ہیں مگر زندگی خراب کر دیتی ہیں۔ شہر میں ایک سے ایک خوبصورت لڑکی ہے شاہ جی کی لڑکی میں اتنا کیا ہے کہ تم پاگل ہوئے جا رہے ہو''؟

ایوب کو خاموش پا کر وہ پھر بولنا شروع ہوا۔

''بڑے سے بڑے خاندان کا رشتہ مل سکتا ہے تمہیں۔ زمین جائداد ہے، کاروبار ہے۔ اچھا خاصا نام ہے تمہارے والد کا کیوں دھبہ لگانے پر تلے ہو۔ صدیق اکیلا مارا مارا پھرتا ہے تم نے ساتھ نہ دیا تو کاروبار بری طرح متاثر ہوگا۔ میری بات یاد رکھو کل کو تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے، عشق کا یہ وقتی بخار اتر جائے گا، تمہاری شادی ہو جائے گی اور تم بیوی بچوں کے ساتھ خوش باش رہو گے۔ لیکن جس ماں کو تم ستا رہے ہو شاید یہ نہ رہے۔ تمہارا بھائی نہ رہے، یہ کاروبار نہ رہے، تب پچھتانے سے کچھ حاصل نہ ہوگا''۔

معروف نے اس کی طرف دیکھا اور کہا:

''کچھ بولو نا تم بھی آخر کیا چاہتے ہو''؟

ایوب نے سگریٹ سلگایا، تھوڑی دیر تک معروف کو دیکھتا رہا اور پھر بولا۔

''دیکھو معروف دوست اور استاد میں فرق ہوتا ہے اور تمہیں پتہ ہے کہ میں سکول سے بھاگ گیا تھا۔ آدمی اسی وقت تک دوسرے کو مجنون سمجھتا رہتا ہے جب تک اسے خود جنون نہیں ہوتا۔ مسلئہ یہ نہیں ہے کہ مجھے جنون ہو گیا ہے۔ مسلئہ یہ ہے کہ جنون ہوا کیوں ہے؟

اس میں کس کا کتنا حصہ ہے۔ یہ لوگ ہی ہیں جو انسان کو پاگل بناتے ہیں اور پھر پتھر مار مار کر اس کی روح کو بھی زخمی کرتے رہتے ہیں۔ تم انہیں ہوشمند سمجھتے ہو جو اپنے ہاتھ کاٹ کر پھینک دیتے ہیں؟ تم مجھے مجنون کہتے ہو، تمہیں یہ لوگ ذہنی طور پر تندرست نظر آتے ہیں جنہوں نے جھوٹی روایات اور جاہلانہ رسموں کو اپنا خدا بنا رکھا ہے؟ وہ اپنی اولاد کو ان بتوں کے قدموں میں ذبح کر دیتے ہیں اور کوئی ان سے پوچھنے والا نہیں کہ تم یہ کیا کر رہے ہو؟

کیوں کر رہے ہو؟

کب سے کر رہے ہو؟؟

اور کب تک کرتے رہو گے؟؟؟

تم تو میری طرح ان پڑھ ہو، مجھ جیسے پاگلوں کا باپ بننے میں تمہیں مزا آتا ہے۔ لیکن یہاں تو پڑھے لکھے لوگ بھی اس شرک میں مبتلا ہیں۔ قبروں پر سجدے کرنا شرک ہے تو کیا ان بتوں کو سجدے کرنا شرک نہیں ہے؟

رفعت کے والدین کہتے ہیں کہ ہم سیّد ہیں اور غیر سیّد کو لڑکی نہیں دے سکتے۔ پھر ہر کوئی اس پر راضی برضا ہے۔

وہ لوگ تو سیّد ہیں جی وہ تو نہ دیں گے غیر کو رشتہ!

کیوں نہ دیں گے بھائی؟

کوئی وجہ تو بتاؤ، کافر ہوں کیا؟

یا کوئی حدیث ہے ان کے پاس؟ کہ غیر سیّد کو رشتہ نہ دو۔

اور تم لوگ ہو کہ سب مل کر مجھے بھی اس بت کی بھینٹ چڑھانا چاہتے ہو۔

سُن لو میں اس قربانی کے لیے تیار نہیں ہوں۔ تم اپنے چاقو چھریاں لے کر دفع ہو جاؤ اور جا کر اپنے

پیٹ میں گھونپ مرو۔ تم اس زمیں پر بوجھ ہو اور آنے والی نسلوں کے گور کن ہو۔ تم نے انہیں زندہ درگور کرنے کا تہیہ کر رکھا ہے۔ کب سے اس بدبو میں جی رہے ہو۔ کچھ اندازہ بھی ہے''؟

وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوا اور پھر بولا۔

''تمہیں یاد ہے ملک اصغر کی ایک گاڑی مجھے بہت پسند تھی لیکن اس نے مجھے نہیں بیچی اور کسی اور سے سودا طے کر لیا۔ یاد ہے نا پھر کیا ہوا تھا''۔

''ہاں یاد ہے اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا' معروف بولا' چیسی بینڈ ہو گیا تھا اور پھر وہ بن بھی نہ سکی تھی''۔

''سنو معروف' ایوب بولا' اس لڑکی نے مجھے کہا تم ان پڑھ ہو شاید اس وجہ سے میرے گھر والے تمہیں رشتہ نہ دیں۔ اس لیے میں نے پڑھنا شروع کر دیا۔ میں نے سب سے چھپ کر پنڈی جا کر امتحان دیے اور میٹرک کی، پھر ایف اے کیا اور اب بی اے کی تیاری کر رہا تھا''۔

معروف منہ کھولے اسے دیکھتا رہا۔

''شاید تمہیں اس کی خبر نہیں' ایوب نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا' لیکن یہ تو تم اچھی طرح سے جانتے ہو کہ میں نے شراب چھوڑ دی، جوا بھی چھوڑ دیا۔

''معروف' وہ غصے سے کانپ رہا تھا' میں انسان بننے چلا تھا لیکن شاید تم لوگوں کو یہ پسند نہیں ہے۔ تم سب میرا راستہ روکے کھڑے ہو۔

میں آج سے پھر کام پہ جا رہا ہوں ہمیشہ کی طرح۔ لیکن یاد رکھو جو میرے راستے میں آیا میں اس کا چیسی بینڈ کر کے رکھ دوں گا''۔



رات آٹھ بجے اجلاس شروع ہو گیا۔ تنظیم کے جنرل سیکریٹری نے ایجنڈا پڑھ کر سنایا اور کہا کہ اگر کوئی آدمی ایجنڈا میں مزید کوئی پوائنٹ شامل کروانا چاہتا ہو تو بتایا جائے۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی پھر ایک نوجوان بولا:

''تنظیم کی پچھلی ایک سالہ کارکردگی پر بحث ہونی چاہیے''۔

یہ پوائنٹ بالاتفاق شامل کر کے ایجنڈا ممبران میں تقسیم کر دیا گیا۔ جنرل سیکریٹری نے شرکائے اجلاس کو بریفنگ دی اور مستقبل سے متعلق مختلف امور پر رائے طلب کی۔

شرکاءِ میٹنگ نے اپنی آراء بیان کرنا شروع کیں اور چند ایک معاملات پر بحث مباحثہ بھی ہوا، تنقید و تبصرے بھی ہوئے۔ مجموعی طور پر تاثر یہ سامنے آ رہا تھا کہ سینٹرل کمیٹی کے ممبران اور دیگر کارکنان مرکزی کابینہ کی کارکردگی سے مطمئن نہیں ہیں۔ جو توقعات کابینہ سے وابستہ کی گئی تھیں وہ ان پر پورا اترنے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے۔ سینئر کارکنان نے اس بات کو اشارۃً بیان کیا اور اس سلسلہ میں تنظیم کی حکمتِ عملی پر نظرِ ثانی کی اہمیت کو اجاگر کیا۔

صدرِ تنظیم زیادہ تر خاموش رہے جبکہ مختلف اٹھائے گئے سوالوں کے جواب سیکریٹری جنرل اور نائب صدر دیتے رہے۔ اسی دوران سینٹرل کمیٹی کا ایک نوجوان اپنی باری آنے پر زیادہ جذباتی ہو گیا۔ وہ اپنی نشست سے کھڑا ہو کر صدرِ تنظیم سے مخاطب ہوا۔

''جناب آپ پچھلے دو سال سے تنظیم کے صدر ہیں، ہمیں بتایئے اس عرصہ میں آپ نے کیا کیا''؟ سوائے اس کے کہ کمروں میں بیٹھ کر شیخ چلی کے جیسے منصوبے بنائے اور ساتھیوں کو نئے نئے تھیسس سمجھاتے رہے۔ وزارت امور کشمیر نے آزادی کے اس نام نہاد بیس کیمپ کے حکمرانوں کو اپنا نوکر بنا رکھا ہے۔ چیف سیکریٹری اور آئی جی سمیت لینٹ افسروں کی پوری فوج ہمارے اوپر مسلط ہے۔ ہمارے وسائل لوٹے جا رہے ہیں۔ جہلم سے لے کر کراچی تک ہمارا پانی

مفت استعمال ہو رہا ہے۔ دن رات ہمارے جنگلات کا صفایا کیا جا رہا ہے۔ منگلا کی رائلٹی پر ہمارا حق تسلیم نہیں کیا جا رہا۔ ہمارا وطن تین حصوں میں تقسیم ہو چکا ہے، ہم اپنی غلامی کے بدترین دور سے گزر رہے ہیں، ہر طرف سے ہمارا استحصال ہو رہا ہے۔ پاکستان اور انڈیا شملہ میں کشمیر کا سودا کر چکے ہیں اور ہم ہیں کہ شتر مرغ کی طرح ریت میں سر دیے بیٹھے ہیں...... آپ ہم سے کیا چاہتے ہیں؟ یہی کہ ہم بھی اپنے حکمرانوں کی طرح مجرموں کی جیسی خاموشی اختیار کر لیں...... اندھے گونگے اور بہرے بن جائیں، قوم کو دن بدن آزادی کی منزل سے دور ہوتے ہوئے، وطن کو ایک اور تقسیم کی طرف جاتے ہوئے اور اپنے وسائل کو بے دردی سے لٹتے ہوئے بے بسی سے دیکھتے رہیں...... ایسی بے کار کی زندگی سے تو موت بہتر ہے۔ ہم میں اگر آزادی کے لیے مر مٹنے کا جذبہ نہیں ہے تو ہمارے پاس زندہ رہنے کا کیا جواز ہے''۔

سینٹرل کمیٹی کے ایک ممبر کی بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ اجلاس میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ کابینہ اور سینٹرل کمیٹی کے ممبران ایک دوسرے پر برس پڑے۔ الزامات کی بوچھاڑ شروع ہو گئی...... اور یہ سلسلہ دیر تک چلتا رہا۔ حتیٰ کہ کچھ سینئر لوگوں نے حائل ہو کر معاملہ کو ٹھنڈا کروایا تاکہ ایجنڈے پر بات ہو سکے مگر حتی الامکان کوششوں کے باوجود حالات نارمل نہ ہو سکے۔ تنظیم مکمل طور پر دو حصوں میں بٹ چکی تھی۔ تقریباً تین چوتھائی ممبران کابینہ اور سینٹرل کمیٹی کی رائے یہ تھی کہ ہمیں قومی آزادی کے حصول کے لیے پہلے سے زیادہ بہتر انداز میں اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔ اور اس سلسلے میں ایک بھرپور مزاحمتی تحریک کا آغاز کرنا چاہیے۔ جبکہ باقی لوگوں کا موقف یہ تھا کہ تنظیم ابھی اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ کوئی بڑا مزاحمتی رول ادا کر سکے۔

اس صورتحال کو دیکھتے ہوئے سینٹرل کمیٹی کا ایک سینئر ممبر جو اس سے پہلے سیکریٹری جنرل رہ چکا تھا اس نے شرکاء اجلاس سے بات کرنے کی خصوصی اجازت لی اور بولا۔

''دیکھو دوستو ہمیں ایک بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ جو بھی آج اس میٹنگ میں آیا ہوا ہے وہ اپنے کسی ذاتی مفاد کے لیے نہیں آیا۔ ہم میں سے ہر کوئی ایک بڑے مقصد کے لیے بہت کٹھن حالات میں چل رہا ہے۔ اس لیے اگر کوئی جذباتی ہوتا ہے یا غصے میں آتا ہے تو اس پر ہمیں

دلبرداشتہ نہیں ہونا چاہیے۔ تنظیم کے اندر پایا جانے والا اختلاف تنظیموں کو زندہ رکھتا ہے۔ لٰہذا ہر ایک ساتھی کی رائے اور جذبات ہمارے لیے قابلِ احترام ہونے چاہییں۔

جہاں تک موجودہ صورتحال کا تعلق ہے، میں مکمل غیر جانبدار رہتے ہوئے تنظیم کے پچھلے ڈیڑھ دو سال کی کارکردگی آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اس کارکردگی کا غیر جانبدارانہ تجزیہ کریں۔ ہمارا تجزیہ متوازن ہو اور ہر طرح کے تعصب سے پاک ہو۔ غیر متوازن و جانبدارانہ تجزیے اور آراء ہمارے لیے مسائل پیدا کر دیں گے۔ یہ ہماری ایک بڑی کمزوری ہے اور اگر اس پر قابو نہ پایا جا سکا تو نقصان ہوگا۔ اسی طرح ہمیں اپنی دیگر کمزوریوں، کوتاہیوں اور ناکامیوں کو بھی زیرِ بحث لاتے ہوئے ان کا محاسبہ کرنا ہوگا۔ ان کمزوریوں کو مل کر دور کرنا ہوگا۔ تاکہ ہم ایک ایسی تنظیم بنانے میں کامیاب ہو سکیں جو تحریک کا بوجھ اٹھا سکے۔ تنظیم ہماری بنیادی اور سب سے اہم ضرورت ہے۔

آپ کو یاد ہوگا جب بھٹو گاندھی مذاکرات کی بات چلی جس کے نتیجے میں شملہ معاہدہ ہوا تو ہم نے بھرپور احتجاج کیا۔ پورے آزاد کشمیر میں اس کے خلاف لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہمیں توقع سے زیادہ سپورٹ ملی لیکن اس کے باوجود ہم اس سے بھرپور فائدہ نہ اٹھا سکے۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ہم نے محنت نہیں کی، ہم نے اپنی تمام تر توانائیاں صرف کر دی تھیں، ہم کھانا پینا سونا بھول چکے تھے۔ لیکن اصل مسئلہ یہ تھا کہ ہمارے پاس تنظیم کا فقدان تھا۔ بعض جگہوں پر بالکل نئے لڑکے تھے اور بعض پر تو سرے سے کوئی موجود ہی نہ تھا۔ بعد میں ہم نے کوشش کی اور کچھ کالجز میں تنظیم سازی بھی کی لیکن اس طرف پوری توجہ نہ دے سکے۔ اسی دوران کنونشن ہو گیا اور ذمہ داریاں منتقل ہو گئیں۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم ذمہ دار نہ رہے تھے لیکن ہمارے ہاں یہ رواج جڑ پکڑ چکا ہے کہ جو کچھ بھی کرنا ہے عہدیداروں نے ہی کرنا ہے۔ اور جو عہدیدار نہیں ہیں ان کا کام صرف اور صرف تنقید کرنا ہے۔ ایک فعال تنظیم کے لیے تنقید اتنی ہی ضروری ہے جتنی انسان کے لیے آکسیجن۔ لیکن فقط تنقید کو کام سمجھ لینا بڑی غلطی ہے۔ تنظیم میں صدر اور جنرل سیکریٹری ہی نہیں ہوتے پوری کابینہ اور ضلعی تنظیمیں کارکردگی کی ذمہ دار ہوتی ہیں۔ جبکہ عملی طور پر

صورتحال یہ ہوتی ہے کہ پوری کابینہ میں زیادہ سے زیادہ تین لوگ فعال ہوتے ہیں اور باقیوں کو میٹنگ میں لانے کے لیے ترلے کرنے پڑتے ہیں۔ پھر بھی کتنی بار ہمیں کورم پورا نہ ہونے کی وجہ سے میٹنگز ملتوی کرنا پڑی ہیں۔ آپ آج کی میٹنگ میں ہی دیکھ لیں کہ کابینہ اور سینٹرل کمیٹی کے کتنے ممبران موجود ہیں۔ آپ جب مرکزی کنونشن کے موقع پر ساتھیوں کا چناؤ کرتے ہیں تو اس وقت یہ کیوں نہیں دیکھتے کہ یہ ساتھی اپنی ذمہ داریاں پوری کر بھی سکیں گے یا نہیں۔ لہٰذا تنظیم کی کارکردگی کی ذمہ داری ہم سب پر عائد ہوتی ہے۔ رہی بات پالیسی میٹرز کی تو اس سلسلے میں کسی حد تک سینٹرل کمیٹی کے لوگ زیادہ ذمہ دار ہوتے ہیں۔ لیکن یہ تو دیکھا جائے کہ اس دو سال کے عرصے میں سینٹرل کمیٹی اور کابینہ کے کتنے مشترکہ اجلاس ہوئے ہیں۔ بہرحال اپنی ذمہ داریوں سے پہلوتہی سے نقصان ہو رہا ہے اور اس نقصان سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم خود کو اس صورتحال کا ذمہ دار سمجھیں اور آئندہ ایسے دوستوں کو سامنے لائیں جو وقت دے سکیں۔

جہاں تک قومی ایشوز پر جدوجہد کا تعلق ہے' اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا' تو میں اس سلسلے میں تنظیم کی کارکردگی سے مطمئن ہوں۔ شاید کچھ دوستوں کو میری یہ بات عجیب لگے گی۔ لیکن ہمیں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ہم ایک طلبہ تنظیم ہیں کوئی عوامی پارٹی نہیں ہیں۔ ہمارے وسائل نہ ہونے کے برابر ہیں اور مسائل کہیں زیادہ۔ جن نا مساعد حالات میں دوست اپنی بساط سے بڑھ کر بوجھ اٹھائے چل رہے ہیں اس کا اندازہ سب کو نہیں ہے۔ ہماری بد قسمتی یہ ہے کہ عوامی سطح پر ابھی تک کوئی بھی جماعت قومی آزادی کی تحریک کو منظّم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی ہے۔ ان حالات میں این ایس ایف قومی شعور کو بیدار کرنے اور آزادی کی تحریک کو منظّم کرنے میں جو کردار ادا کر رہی ہے وہ اس کے دائرہ کار سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اپنی استعداد سے بڑھ کر جب بھی آپ کوئی کام کریں گے اس میں کمزوریاں رہیں گی۔ اور دراصل یہی کمزوریاں ہمارے اختلافات کا باعث بنتی رہتی ہیں۔ ہمیں درست تجزیہ کے لیے ان تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھنا پڑے گا ورنہ ہم اصل وجوہات کو جانے بغیر آپس میں الجھ کر تنظیم کے ساتھ ساتھ اپنے کاز کو نقصان پہنچانے کا باعث بن سکتے ہیں''۔

بہر حال رات ڈیڑھ بجے تک بحث ہوتی رہی اور بالآخر یہ طے ہوا کہ قومی ایشوز پر کم و بیش ایک سال پہلے تنظیم جس کارکردگی کی حامل تھی یا جس سطح پر وہ کام کر رہی تھی اسے بحال کیا جائے۔ اس سلسلے میں حکمت عملی طے کرنے اور پروگرام کو حتمی شکل دینے کے لیے اجلاس دوسرے دن تک کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔ دوسرے دن کے اجلاس میں مختلف امور زیر بحث لائے گئے۔ تمام کالجز کے یونٹس کی کارکردگی پر بات ہوئی اور یہ طے ہوا کہ جہاں جہاں یونٹس کمزور ہیں وہاں پر توجہ دی جائے، نئے سرے سے تنظیم سازی کا جائزہ لیا جائے اور تنظیم کو مضبوط کرنے کے ساتھ ساتھ وال چاکنگ، پمفلٹس وغیرہ کے ذریعے طلبہ اور عوام کو جاری استحصال سے آگاہ کیا جائے۔ تمام اضلاع کے ذمہ داران اور مرکزی کابینہ نے اس سلسلے میں اپنی اپنی ذمہ داریوں کا تعین کیا اور یہ تمام بنیادی کام مکمل کر کے دو ماہ بعد ہونے والے اجلاس میں کارکردگی رپورٹ پیش کیے جانے پر اتفاق ہوا۔ اس کے ساتھ ہی صدر تنظیم نے یہ اعلان بھی کر دیا کہ وہ وہ اگلے تین ماہ کے اندر کنونشن کروائے گا۔ یہ ایک اچانک فیصلہ تھا جس پر ممبران کابینہ کے علاوہ سبھی لوگوں نے اعتراض کیا لیکن صدرِ تنظیم نے اپنا فیصلہ برقرار رکھا۔ اجلاس کے بعد پبلسٹی بورڈ کے ممبران نے الگ بیٹھ کر ایک ہینڈ بل تیار کر کے مرکزی کابینہ کے حوالے کیا جو معمولی رد و بدل کے بعد فائنل کر دیا گیا۔ ہینڈ بل کی پرنٹنگ کیلیے درکار فنڈز چندہ جمع کرنے باوجود کم پڑ رہے تھے۔ لیکن یہ اتنا بڑا مسلہ نہ تھا وادی کا ایک آدمی اپنی پریس چلا رہا تھا جو اکثر و بیشتر انہیں ادھار پر کام کر دیتا تھا۔ اس دفعہ بھی اس نے ۳۵۰ میں سے ۱۸۰ روپے ادھار پر ہینڈ بل تیار کرنے کی حامی بھر لی۔

میٹنگ ختم ہوتے ہوتے صبح ہوگئی تھی۔ اس کے باقی ساتھی سو گئے تھے لیکن وہ باوجود کوشش کے نہ سو سکا۔ یہ دو دن اس قدر ہنگامہ خیز تھے کہ آزاد اپنے ماموں کو ائرپورٹ سے لینا بھی بھول گیا۔ پریس سے ہینڈ بل لے کر سارے اضلاع کیلیے بھیجنا بھی اسی کی ذمہ داری ٹھہری تھی جس کی وجہ سے اسے مزید ایک دن رکنا پڑ رہا تھا۔ ادھر چوہدری اسلم میرپور پہنچ چکے تھے۔ وہ اپنے گھر جانے سے پہلے سیدھے بہن کے گھر گئے۔ دونوں بہن بھائی سات سال بعد مل رہے تھے۔ اس دوران آزاد کے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ چوہدری اسلم اس وقت تک لیگل نہیں ہوئے تھے اس لیے بہنوئی کی لاش کے ساتھ نہ آ سکے تھے۔ یہ دونوں رشتہ دار ہونے کے ساتھ ساتھ بہت

اچھے دوست بھی تھے۔ چوہدری اسلم بڑے دلیر آدمی تھے لیکن بہن سے مل کر ضبط نہ کر سکے۔ کافی دیر دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے۔ آخر آزاد کی ماں اٹھی اور چائے بنانے لگی۔ ناشتہ اس نے پہلے سے تیار کر رکھا تھا۔ جب سب لوگ ناشتے کے لیے بیٹھ چکے تو اس نے پوچھا آزاد کدھر ہے؟

چوہدری اسلم نے حیرانگی سے بہن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

''ہمشیرہ آزاد تو ہمیں نہیں ملا''۔

''کیا کہہ رہے ہیں بھائی جی وہ تو ایک دن پہلے ہی کسی کام سے پنڈی چلا گیا تھا اور کہہ گیا تھا کہ میں ان کو ساتھ لے کر واپس آؤں گا''۔ بہن نے وضاحت کی۔

''نہیں ہمشیرہ ہم نے تو کافی دیر ائیر پورٹ پر انتظار بھی کیا کہ شاید کہیں لیٹ ہو گیا ہو بہر حال پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے شاید کہیں سو یا رہ گیا ہو گا''۔ چوہدری اسلم نے جواب دیا۔

''کبھی ایسی لا پرواہی تو کی نہیں اس نے''۔ آزاد کی ماں کو کسی قدر ندامت بھی ہو رہی تھی۔ بھائی کی تو کوئی بات نہ تھی لیکن بھابی کے سامنے اسے خفت سی محسوس ہو رہی تھی۔

''ارے بہن جی آپ بھی خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہیں۔ اسے کچھ کام پڑ گیا ہو گا ورنہ وہ اتنا تو لا پرواہ نہیں ہے''۔ بھابی بول پڑیں۔

جب وہ گئے تھے تو ان کے ایک ہی بیٹی تھی اب وہ چار بہن بھائی تھے۔ آزاد کی ماں شہناز سے مل کر بہت خوش ہوئی۔ بھائیوں کی اولاد سے پیار تو فطری سی بات ہے لیکن شہناز کو چونکہ اس نے آزاد کے لیے مانگا ہوا تھا اسلیے وہ اسے زیادہ اپنا سمجھتی تھی۔ اب تو وہ کالج میں پہنچ چکی تھی۔ اس کے بس میں ہوتا تو اسی دفعہ شادی کر لیتی لیکن آزاد ایل ایل بی کرنے سے پہلے شادی کو تیار نہ تھا۔

ابھی وہ لوگ ناشتہ کر کے فارغ ہوئے ہی تھے کہ گھنٹی بجی۔

''شاید آزاد آ گیا ہے، ہمشیرہ آپ بیٹھیے میں دیکھ لیتا ہوں''۔ چوہدری اسلم اٹھے لیکن بہن نے بٹھا دیا۔

''ارے بھائی آپ کدھر جا رہے ہیں، آزاد اتنی سویرے نہیں آسکتا میں خود دیکھ لیتی ہوں''۔
گیٹ پر آزاد کا دوست کھڑا تھا۔
''اسلام علیکم خالہ''
خالہ نے قدرے پریشانی سے اسے دیکھا مگر کچھ بول نہیں پائیں۔ وہ ان کی پریشانی کو بھانپ گیا اور فوراً بول پڑا۔
''خالہ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے آزاد ہمارے ساتھ ہی تھا بس وقت پر ائرپورٹ نہ پہنچ سکا ابھی اسے ایک دن مزید رکنا پڑے گا۔ یہ چٹھی اس نے آپ کیلیے دی ہے''۔
''چٹھی کو کیا کرنا ہے بیٹا خیریت کی اطلاع مل گئی کافی ہے۔ ہاں اس بات کا خیال رکھنا کہ میں تم لوگوں پر اعتبار کرتی ہوں اور گھبرانے والی بھی نہیں ہوں اگر کوئی ایسی ویسی بات ہے تو بتا دو''۔ آزاد کی والدہ نے چٹھی اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔
''نہیں خالہ آپ بالکل اطمینان رکھیں وہ کل صبح تک آجائے گا''۔ آزاد کے دوست نے جواب دیا اور اجازت لے کر چل دیا۔
'' آزاد تو نہیں آیا بھائی جی یہ چٹھی بھیجی ہے کل صبح آئے گا''۔ آزاد کی والدہ نے خط بھائی کو دیتے ہوئے کہا۔
''چلو یہ تو بہت اچھا ہوا اپنی اطلاع تو دے دی''۔
بچے اور ان کی ماں جلد ہی سو گئے لیکن چوہدری اسلم باوجود تھکاوٹ اور کوشش کے نہ سو سکا۔ ذہن میں ماضی کی فلم چلتی رہی۔ اس فلم کے ہر ایک کردار سے اس نے دل کھول کہ باتیں کیں۔ ماں نے اسے سینے سے لگا لیا چھوڑتی ہی نہ تھی۔
''میرے لعل گھر کا رستہ ہی بھول گئے تھے۔ کتنی مدت بعد لوٹے ہو یاد بھی ہے؟ میں نے تو ایک ایک دن گن گن گزارا ہے۔ تیری یاد اتنی آئی، خدا رسول بھول گئے میرے بچے! اور یاد دلائی بھی تو تیری ہی یاد نے۔ لوگ دعاؤں میں دنیا آخرت مانگتے تھے میں تجھے مانگتی رہی۔ ہم سے سب کچھ ہی تو چھن گیا ہے، گھر بار گئے، زمیں باڑی گئی، سب کو سہہ لیا لیکن اولاد کی جدائی مار گئی میرے پتر۔ یہ آگ بڑی ڈاہڈی آگ ہے پتر پتھر کو بھی لگے تو کوئلہ کر دے۔ یوسف کا قصہ

سنتے تھے اور روتے تھے لیکن خود یعقوب بنی تو بھید کھلا۔ میں راتوں کو اٹھ اٹھ کہ روتی تھی اور زمین آسمان بھی میرے ساتھ روتے تھے۔ اب کہیں نہ جانا بیٹا، روکھی سوکھی کھالیں گے پر دو چار گھڑی کے اس جیون میں پھر سے جدا نہ ہونا.........."۔

روتے روتے چوہدری اسلم کی ہچکی بندھ گئی۔ اسے اپنے ماتھے پہ ماں کے آخری بوسے کا لمس اب بھی محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے میلے آنچل کی خوشبو اس کی روح میں بسی ہوئی تھی۔

"جا میرے پتر رب سوہنے نے حوالے....."۔ ماں کے یہ آخری الفاظ یہ آخری دعا اس کا سرمایہ اور آخری سہارا تھے۔ اسے جب بھی پریشانیوں نے گھیرا وہ خدا سے دعا کرتا:

"اے میرے مالک میری ماں نے تو مجھے تیرے حوالے کیا تھا تو مجھے زمانے کے حوالے نہ کرنا"۔

خدا کے سامنے اس کا یہ حوالہ اتنا معتبر و مقبول تھا کہ اسے کبھی مایوسی نہیں ہوئی۔ گویا اسکی سفارش ابھی تک اس کے کام آرہی تھی۔ ماں بھی کیسی عجیب ہستی ہے۔ مر کر بھی زندہ رہتی ہے اور خدا بھی کتنا قدردان ہے۔ برسوں پہلے ماں کے منہ سے نکلے چند لفظوں کی وہ ہر بار لاج رکھ لیتا تھا۔ اسی وجہ سے اسے خدا سے محبت ہو گئی تھی۔

"ماں خدا کا دوسرا نام ہے شاید.....زمین پہ ماں آسمان پہ خدا بن کہ رہتا ہے۔
ماں کی طرح پیار بھی کرتا ہوگا۔ ماں کے بغیر پیدا کر دیتا تو کیسا ہوتا۔ سب کچھ ہوتا فقط ماں نہ ہوتی، دنیا کیسی ہوتی......۔

ویران اجاڑ بیابان جنگل، درختوں کی طرح انسان کھیتی سے پیدا ہوتے۔ ان کا آپس میں کیا تعلق ہوتا، کیسا رشتہ ہوتا۔ رشتوں کا کوئی تصور ہوتا؟ ایسی دنیا بھی کس کام کی جس میں ماں نہ ہوتی، رشتے نہ ہوتے، رشتوں کی پہچان نہ ہوتی.....خدا ہوتا خدا کی پہچان نہ ہوتی۔ شاید یہ مقصود نہ تھا، یا ممکن نہ تھا۔ ماں کے بغیر اولاد نہ ہوتی، تو کیا خدا کے بغیر دنیا ہوتی۔

ماں سے محبت فطرت کا تقاضہ ہے، خدا سے محبت کس چیز کا تقاضہ ہے.....تقاضہ ہے بھی کہ نہیں۔

وہ اپنی سوچ کو اپنے غم سے جوڑ کر سارے خیال ذہن سے جھٹک دیتا۔ لیکن یہ خیال اس کے ذہن کے دروازے پر دستک دیتے رہتے۔ وہ اٹھا اور غسل کر کہ باہر نکل گیا۔ بہن بھی

اسے دیکھ کر باہر نکل آئی اور پوچھا۔

''بھائی آپ سوئے نہیں''؟

''سویا ہی رہتا ہوں ہمشیرہ یہاں آ کر آنکھ کھلتی ہے''۔ اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور صحن کے کونے میں رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''دیکھو نا کتنا وقت گزر گیا ہے۔ گزری ہوئی زندگی ایک خواب لگتا ہے۔ مجھے تو نہیں پتہ چلا ہے ہمشیرہ کہ زندگی کدھر چلی گئی ہے۔

صبح سے شام ہوتے دیر لگتی ہے لیکن بچے کو بوڑھا ہوتے دیر نہیں لگتی۔

گھر بناتا کوئی اور رہتا کوئی اور ہے۔

کماتا کوئی اور کھاتا کوئی اور ہے۔

خوشیوں کے بیج بوتا کوئی اور فصل اٹھاتا کوئی اور ہے۔

کرتا کوئی اور بھرتا کوئی اور ہے۔

ڈرتا کوئی اور مرتا کوئی اور ہے۔

مرتا کوئی اور روتا کوئی اور ہے۔

کوئی مر کر باقی رہتا کوئی فناہ ہو جاتا ہے۔ کسی کے لیے زندگی، کسی کے لیے موت اہم۔ کسی کے لیے ملک کسی کے لیے مال اہم۔

کبھی کبھی سوچتا ہوں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کہ واپس آ جاؤں۔ اپنے لوگوں میں رہوں''۔

''دنیا کا تو یہی رواج ہے بھائی جی''۔

عزیز و اقارب، دوست احباب، محلے دار جس جس کو بھی خبر ملی ملنے آ رہا تھا۔ پردیس بھی کیا بری چیز ہے انسان انسان کو ترس جاتا ہے۔ عرصہ زیادہ گزر جائے تو کتنا کچھ بدل جاتا ہے۔ بچے جوان، جوان بوڑھے ہوئے، کوئی بیمار کوئی کمزور ہوا، کوئی بڑے شہر کوئی اگلے جہاں سدھار گیا۔

شہر پھیلے گاؤں سکڑ گئے، ہسپتال آباد کھیت اجڑ گئے، سڑکیں نکلیں رستے مٹ گئے۔

''اللہ کا احسان ہے اتنا کچھ بدلنے کے باوجود لوگ نہیں بدلے''۔ چوہدری اسلم نے کہا۔

چوہدری لال دین نے حیران ہوتے ہوئے اسے دیکھا اور پھر بولا

''جدوں مکاناں وچ لگنے آلے پتھر بدلی گے تے اناں وچ بسنے آلے لوک کس طرح نہ بدلسن۔ ہیک دن اناں وی بدلی جانا پتر بہوں دورے نی گل نئیں''۔ چوہدری لال دین نے حقے کا کش لگاتے ہوئے جواب دیا۔

''اس ویلے تک جینے رہساں چاچا''۔

''اس تھی بعد کے قیامت آئی جاسی پتر، کوئی نہ کوئی تے زندہ رہسی۔ دیکھ ناں آپوں تواہاڑی زندگی کتنی بدلی گئی۔ کل تک تو کھیتاں وچ کم کرناسیں لسی پیناں سیں، سرسوں ناں ساگ کھاناں، دھوتی لاناتے چھتے اپر سوناسیں۔ ہُن دیکھی ہن، او سارا کُج کدھر گیا۔ میں کی آپی انداں نی ٹلیاں تے گھنگروں نی آواز نہ اچھے تے نیندر نہیں سی اینی۔ ہُن چڑیاں بولنیاں تے اکھ کھلی جانی۔ جاتکاں آنی تے میں کی شہرے وچ قید کری شوڑیا۔

کھوئے اُپر جائی تے میں سویلے سویلے نہانا رہنا سیاں۔ توں آپ دس ناں غسل خانیاں کے لغے تے میں کی کے لغے۔ اڑنا پھرنا پنچھی پوڑی تے اِتاں پنجرے وچ بائی ہیندا۔ ایتھے لوک ڈالڈا تے بزاری انڈے کھانے۔ اے بزاری خوراکاں کھائی کھائی تے لوکیں ناں کے بنسی تو آپی سوچ ناں ذرا۔ مکان بدلی گے، خوراکاں بدلی گئیاں، زندگیاں بدلی گئیاں، لوک نہ بدلن اے کس طرح ہوئی سکنا''۔

''تے تُساں وی ڈالڈا کھانا پینا چاچا''۔ اسلم نے پوچھا۔

''میں اگ لانا دوئے ڈالڈے کی تے بزارے نیاں چیزیں کی، کُتھے نیا گلاں کرنا ایں۔ میں گراں وچ ہالے منجھاں رکھی نیاں۔ نوکر چاکر تھے دیکھ بھال کرنے۔ میں آپ وی ۱۵ / ۱۸ تیہاڑے مہینے وچ گراں گزاری اچھنا''۔

''فیر کے فرق پینا چاچاتُس تے زیادہ ٹیم گراں وچ ہی گزارنے ہو''۔

''پتر میں جہیڑے تیہاڑے شہر گزارنا او وی اس انتظار وچ کٹی جانے کہ کدوں مڑی گراں ٹرساں۔ لیکن مسلہ کہلہ مہاڑا تے نہیں ناں، میں کی تے لغنا اے شہر ما کھائے سارے گراں اجاڑی شوڑسن۔ جس طرح اج کل نے نوجوان شہراں لے ٹری پئے پچھے کے باقی

بچسی۔ گراں نی ہیک شام شہرے نی ساری زندگی تے اس نیاں رونقاں اپر پہاری ہے۔ پراے زمانے نی چال ہے پتر اس کی کوئی نہ روکی سکنا''۔

دروازے پر دستک ہوئی اور ساتھ ہی ماں کی آواز آئی۔

''آزاد پتر اٹھ ناشتہ کرلے تو چلیں بھائی جی دیکھتے ہوں گے''۔

آزاد نے سوچا ابھی تو وہ سویا تھا۔ گھڑی دیکھی تو دس بج چکے تھے۔ وہ بڑی مشکل سے اٹھا اور کچن میں جا کر ماں کے پاس بیٹھ گیا۔

''آج دیسی گھی کے پراٹھے بنائے ہیں۔ منہ ہاتھ دھولے میں ناشتہ لے کر آتی ہوں''۔

''دیسی گھی کہاں سے آیا ہے امی''؟

''تمہاری ماسی نے بھیجا ہے''۔

''کبھی بلاؤ نا امی ماسی کو کتنی مدت ہوئی دیکھا بھی نہیں''۔

''تم ہی جا کر مل لیتے بیٹا۔ گھر کے کام کاج میں کہاں نکلا جاتا ہے''۔ ماں نے جواب دیا۔

''کہو تو جا کر لے آؤں ماسی کو ماموں کو بھی مل لے گی''۔ آزاد نے پوچھا۔

''نہیں ابھی جانے کی ضرورت نہیں ہے'ماں نے کہا' بھائی جی کو ملنے تو آئے گی''۔

وہ اسے ناشتہ دے کر گھر کی صفائی میں مصروف ہو گئی۔

آج وہ بہت خوش تھا۔ خوشی سے اس کا انگ انگ ناچ رہا تھا۔ لیکن اس کی پوری کوشش تھی کہ اس داخلی کیفیت کا اظہار نہ ہو۔

لیکن آخر کیوں؟

میں خوشی کو ظاہر ہونے سے کیوں روک رہا ہوں؟

نہ سورج نکلے بنا رہتا ہے نہ خوشبو پھیلے بنا۔ پھر میں کتنی غیر فطری کوشش کر رہا ہوں۔

لیکن کیوں کر رہا ہوں؟

نہ تو مذہب اس سے منع کرتا ہے، نہ معاشرہ اس کو برا سمجھتا ہے۔ پھر کیا ہے جو مجھے روکے ہوئے ہے۔

وہ تحلیلِ نفسی کے عمل سے گزر رہا تھا۔

پھر وہ بیٹھے بیٹھے مسکرانے لگا جیسے اسے اپنے سوال کا صحیح جواب مل گیا ہو۔

ہُوں......شرم آتی ہے!

شاید اسی کو حیا کہتے ہیں۔

کتنا لطیف احساس ہے۔ کتنا نازک لفظ ہے مگر کتنا طاقتور ہے۔ آدمی کو پچھاڑ دیتا ہے۔ لیکن آدمی بھی تو بعض اوقات اسے پچھاڑ دیتا ہے۔ جانے اس وقت اس کی کیا کیفیت ہوتی ہو گی۔ یقیناً بڑی خوفناک کیفیت ہوگی جو اسے ننگا ہونے پر مجبور کر دیتی ہے۔

یہ مولوی لوگ کیا کہتے رہتے ہیں کہ حیا ایمان کا حصّہ ہے۔

گویا ایمان حیا سے بھی بڑی اور زیادہ کوئی طاقتور چیز ہے؟

بات کوئی خاص ہے لیکن آج تک سمجھ کیوں نہیں آئی؟

شاید یہ مولوی بچارے Deliver نہیں کر پا رہے۔

شاید ایمان بھی کوئی معاشرتی قدر ہے؟

ہر قدم پر ایک سوال راستہ روکے کھڑا ہے۔ آدمی جائے تو کدھر جائے۔ اور ان کا جواب لائے تو کہاں سے۔ راستہ کیسے صاف ہوگا۔

مولوی تو ناکام ہو گیا، نہیں سمجھا سکا۔

کیا خود بھی نہیں سمجھا؟

شاید خود سمجھ بھی گیا ہو لیکن ضروری تو نہیں کہ دوسرے کو سمجھانے پر قدرت رکھتا ہو۔

Transfer of knowledge بہت مشکل کام ہے۔

لیکن حیا کا علم سے تو کوئی کام نہیں ہے۔

وہ کیسے؟

ان پڑھ اور جاہل لوگ بھی باحیا ہوتے ہیں۔ بلکہ زیادہ باحیا ہوتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ حیا ایک داخلی کیفیت کا نام ہے؟

ہوسکتا ہے۔

تو ایمان بھی ایک کیفیت ہے کیا؟

یہ بھی ممکن ہے۔

تو کیا انسان اپنے اندر کی ساری کیفیات کو سمجھنے پر قادر ہے؟

ہر کیفیت کا کوئی نہ کوئی جواز تو ہوتا ہوگا۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب کوئی کیفیت پیدا ہوتی ہوگی تو اس کے جواز کی بھی سمجھ آ جاتی ہوگی۔

یعنی؟

یعنی حیا کا تعلق رشتوں سے ہے...... ماں کا رشتہ، بہن کا رشتہ...... سماج کا رشتہ۔ اور یہی رشتے حیا کا جواز ہیں۔

اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اصل معاملہ جواز اور عدمِ جواز کا ہے۔

سو فیصد درست۔

پھر بات تو یہ سامنے آئی کہ ساری کیفیات جواز کی کوکھ سے جنم لیتی ہیں۔

تو ایمان اگر ایک کیفیت کا نام ہے تو پھر ایمان کا جواز بھی ہوگا۔

لازم ہے۔

پھر وہ جواز کیا ہے؟

کوئی رشتہ ہے کیا؟

''ارے تو ابھی تک ناشتہ سامنے رکھے بیٹھا ہے''؟

کیا ہوا، بیمار ہو؟ ماں نے پوچھا۔

''نہیں امی ایسی کوئی بات نہیں ہے''۔

''تو پھر کیا ہے''؟

''میں ایک بات سوچ رہا تھا''۔

''مجھے بھی تو بتاؤ کیا سوچ رہے ہو''۔

''سوچ رہا تھا کہ حیا کیا ہوتی ہے''؟

''تو سمجھ آئی''؟

''ہاں اس کی تو کچھ کچھ سمجھ آ گئی لیکن ایمان کیا ہے اس کی سمجھ نہیں آئی''۔ آزاد نے جواب دیا۔

''اسی کو کہتے ہیں چراغ تلے اندھیرا''۔

''وطن وطن کی رٹ لگائی ہوئی ہے اور ابھی تک میاں محمد بخشؒ کو نہیں پڑھا''۔ آزاد حیرت سے ماں کو دیکھ رہا تھا۔

''چلو اب ناشتہ کر بھی لو۔ دنیا جہان کی کتابیں پڑھ پڑھ کر تمہارا دماغ خشک ہو گیا ہے''۔

جب وہ چوہدری اسلم کے ہاں پہنچے تو چاچا لال دین الوداع ہو رہا تھا۔ انہیں دیکھ کر وہ رک گیا، رحمت جان کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولا۔

''رحمت جان بڑی مدت بعد نظر آئی ہو کیسی ہو''؟

''ٹھیک ہوں چاچا' رحمت نے کہا' آپ کیسے ہیں''؟

''ہم نے کیسا ہونا ہے پتر۔ دن ذرا لمبے ہو گئے ہیں۔ جان نہیں چھوٹ رہی''۔

''اللہ آپ کو صحت دے چاچا''۔

''اب صحت کو کیا کریں گے جھلیے، اب تو ایمان کی دعا کر ایمان کی''۔

''آزاد آپ کو چھوڑ آئے گا' رحمت نے کہا' جا چاچا کو چھوڑ آ''۔

''نہ رحمت جان نہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی تو خاصا تگڑا ہوں''۔

''شہرداری ہے چاچا' رحمت نے کہا' کہیں کوئی گاڑی والا مار نہ دے''۔

''دن پورا تو چلتا ہی رہتا ہوں۔ بیٹھا جو نہیں جاتا۔ کبھی ایک کی خبر لی کبھی دوسرے کی۔ اپنے کو تو کوئی ملنے آتا نہیں......!

سنگی ساتھی تو سارے ہی ٹر گئے۔ اپنا آپ گھسیٹنا پڑتا ہے زمانے کے ساتھ۔

ٹھیک ہے اللہ نے حوالے''۔

چاچا لال دین کو جاتے دیکھ کر آزاد کو یوں لگا جیسے وہ خود جا رہا ہو۔

چوہدری اسلم انہیں دیکھ کر باہر آ گیا۔

''ارے آزاد تو اتنا بڑا ہو گیا ہے پانچ سالوں میں۔ اسلم نے معانقہ کرتے ہوئے اس

کی پیٹھ تھپتھپائی''۔

''پانچ سال بھی تو تھوڑے نہیں ہوتے ماموں' آزاد نے جواب دیا' دیکھیں نا آپ کے بال بالکل سفید ہو گئے ہیں''۔

چوہدری اسلم نے دروازے سے داخل ہوتے ہوئے قہقہہ لگایا ''بال تو مدت سے سفید ہو چکے تھے بس فرق یہ پڑا ہے کہ رنگ لگانا چھوڑ دیا ہے''۔

''ارے آپا اتنی دیر کر دی آتے آتے ہم تو صبح سے انتظار میں بیٹھے ہیں۔اسلم کی بیوی رضیہ بڑی خوش نظر آ رہی تھی''۔

''بس بھابی گھر کے کام سے فارغ ہوتے ہوتے دیر ہو گئی''۔

''آپ سنائیں کیسی ہیں کچھ آرام بھی کیا ہے کہ نہیں''۔رحمت جان نے بھابی سے پوچھا۔

''آرام ہی آرام ہے آپا' تنگی تو آپ لوگوں کو اٹھانا پڑی ہے ہماری وجہ سے' رضیہ نے کہا' بھئی آزاد نے تو کمال ہی کر دیا اتنا اچھا کام کروایا ہے گھر بالکل ہی نیا لگ رہا ہے''۔

''مامی مجھے کیا پتہ ہے کام کا' آزاد بولا' وہ تو میرا ایک دوست تھا اس نے کروایا ہے سب کچھ''۔

''بھائی مجھے تو سچ پوچھو خوشی بھی ہوئی ہے یہ کام دیکھ کر اور تکلیف بھی''۔اسلم نے کہا۔

''وہ کیوں بھائی جی''۔

''خوشی اس لیے ہوئی ہے کہ آزاد اب ذمہ دار ہو گیا ہے اور تکلیف اس لیے ہوئی کہ اسے تکلیف اٹھانا پڑی ہے''۔اسلم نے جواب دیا

''کام تو ہو ہی جاتے ہیں بھائی جی آزاد نہ ہوتا کوئی اور کروالیتا' رحمت جان نے کہا' اسے تو فائدہ ہی ہوا ہے کچھ کام کا تجربہ ہو گیا ہے''۔

اسی دوران تینوں بہن بھائی بھی آ گئے۔ظہیر اور کوثر سے ملنے کے بعد جب شہناز کی باری آئی تو آزاد گونگا ہو گیا۔اس کے منہ سے کوئی بات ہی نہ نکل رہی تھی۔اسے لگا جیسے وہ کبھی زندگی میں بولا ہی نہیں ہے۔سینکڑوں کے مجمعے کے سامنے جسے چپ کرانے کے لیے پرچیں روانہ

کرنا پڑتی تھیں وہ آج ایک عورت کے سامنے بے زبان ہو گیا تھا۔

وہ اپنی تمام تر طاقت جمع کر کہ صرف اتنا بول پایا۔

''کیا حال ہے''؟

''جی ٹھیک ہوں' شہناز نے جواب دیا' آپ بیٹھیے نا''۔

بیٹھنے کے بعد اس کے اوسان کسی قدر بحال ہوئے لیکن وہ اپنی کیفیت کو سمجھنے سے بالکل قاصر تھا۔

''آزاد تمہارے ریزلٹ کا کیا بنا'' اسلم نے پوچھا۔

''ماموں پاس ہو گیا تھا''۔

''آگے کیا پروگرام ہے''؟

''ایل ایل بی کرنے کا ارادہ ہے''۔

''کہاں سے''؟

''پنجاب یونیورسٹی میں اپلائی کر رکھا ہے امید ہے ایڈمیشن ہو جائے گا''۔

آزاد کو پہلی بار اپنے شرمیلا ہونے کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کے اندر کتنی جھجک چھپی بیٹھی تھی اسے پہلے کبھی اندازہ نہیں ہوا تھا۔ انسان اپنی ذات سے نا آشنا ہوتا ہے۔ محبت اسے اپنے آپ سے روشناس کراتی ہے، اسے دریافت کرتی ہے۔ محبت ایک چشمہ ہے جب پھوٹتا ہے تو انسان پیاسا سا ہو جاتا ہے اور جتنا بھی سیراب ہو جائے پیاسا سا ہی رہتا ہے۔ محبت ایک پھول ہے جب کھلتا ہے تو رُوح کو مہکا دیتا ہے۔ محبت وہ پرندہ ہے جو آسمان کی وسعتوں اور زمیں کی دُوریوں سے بے پرواہ اڑتا ہی چلا جاتا ہے۔ وہ ایک منزل تک پہنچنے کے لیے ہر عذاب سہتا ہے۔ لیکن جب منزل سراب بن جائے تو محبت جنون بن کر اپنی اصل صورت کو ظاہر کرنا شروع کر دیتی ہے۔ اس کے چہرے پر پڑے نقاب اترنا شروع ہو جاتے ہیں، اس کا یہ باطنی حُسن جب انسان پر ظاہر ہوتا ہے تو اس کے جنون میں ہزار گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔ پھر وہ زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو کر ایک ایسے سفر پر چل نکلتا ہے جس میں وہ از خود ایک منزل کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن آزاد اس لمبے سفر پر ابھی گھر سے نکلا ہی تھا۔ ابھی وہ گرد و نواح سے ہی آشنا ہوا تھا خود

شناسی کا طویل اور کٹھن سفر اس کے انتظار میں تھا۔ لیکن اسے اس کا اندازہ نہ تھا۔ مسافر جب اجنبی راستوں پر نکلتا ہے تو وہ سفر کا تخمینہ نہیں کر سکتا۔ اس کی واپسی کب ہوگی، کس حال میں ہوگی، ہوگی بھی یا نہیں۔ نہ تو اسے اِس کا علم ہوتا ہے نہ وہ جاننے کی کوشش ہی کرتا ہے۔ یہ سفر ایسا ہے جس کا جنون مسافر کو پلٹ کر دیکھنے بھی نہیں دیتا۔ راہ سے لوٹنے والے یا اپنی سمت بدل لینے والے دراصل محبت کے لیے اجنبی، محبت ان کے لیے اجنبی ہوتی ہے۔ سفر تو آشنا کے ساتھ ہوتا ہے۔

محبت اور مادیت وہ دو حریف ہیں جو ہر وقت ایک دوسرے کو پچھاڑنے کی کوشش میں رہتے ہیں۔ یہ ایک عجیب جنگ ہے جس میں ہار اور جیت کے مفہوم فریقین کے لیے مختلف ہوتے ہیں۔ محبت ہار کر بھی جیت جاتی ہے اور بسا اوقات جیت کر بھی ہار جاتی ہے۔ وصالِ یار کے بعد تشنگی کا بجھ جانا محبت کی موت ہے۔ جنون و تشنگی کی بقا میں ہی محبت کی جیت، اس کی بقا ہے۔ جنون ایک طاقت ہے جو ہر اُس اصول اور ضابطے، قاعدے کلیے، رشتے بندھن کو جسے مادیت نے پالا پوسا ہو، کی گردن مروڑ دیتا ہے۔ محبت اور مادیت کے اپنے اپنے راستے، تقاضے ہیں۔ سو جو جس سمت جاتا ہے اپنے محبوب کے پیچھے جاتا ہے۔ شکسپیئر نے کہا تھا کہ دنیا ایک تھیٹر ہے اور ہم سب اس کے کردار ہیں۔ سو جس کا جو کردار ہے وہ اُس نے ادا کرنا ہے۔ ہاں بسا اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ دیوار کی اینٹ نالی میں لگ جاتی ہے۔ اس طرح کے حادثے جنون کی کمر توڑ دیتے ہیں، پھر کتنی دیر اِسے خود سے ہی نبرد آزما رہنا پڑتا ہے۔ اپنی ذات سے یہ جنگ کبھی کبھی اُسے دلدل میں گھسیٹ لیتی ہے۔

دیر تک وہ لوگ بیٹھے باتیں کرتے اور گئے دنوں کو یاد کرتے رہے۔ چائے، کافی کے دور چلتے رہے اور کھانا بھی کھایا۔ شام ہوئی تو مہمانوں کا آنا جانا شروع ہوگیا۔ رحمت جان نے آزاد کو کہا کہ وہ شہناز اور بچوں کو کہیں گھما لائے پورا دن گھر پہ بیٹھے بیٹھے بور ہو گئے ہیں۔

آزاد نے بچوں کی طرف دیکھا تو سب ہی تیار تھے۔

اس دوران اُن کی چند ایک ملاقاتیں بھی ہوئیں۔ آج بھی وہ چھت پر کھڑے تھے۔

''وہاں پر زندگی کیسی ہے''۔ آزاد نے پوچھا۔

''اچھی ہے'شہناز نے جواب دیا'لیکن مصروف ہے بہت......اور یہاں''۔

''ڈھکی چھپی سی ہے، کہیں شرم و حیا کے پردوں میں......''

شہناز کی نظر اپنے ہالف سلیو بازوؤں پر پڑی۔

''......کہیں جھوٹ کی پرتوں میں، کہیں روائتوں کے سانچوں میں ڈھلی ہوئی، کہیں قید و بند میں پڑی ہوئی۔ اگر مقصد پر ہے تو مقابلہ کرتی ہے ورنہ بڑی مسکین ہے اُس مرغی کی صورت''۔

آزاد نے نیچے صحن میں پھرتی مُرغی کی طرف اشارہ کیا جس کی کمر کے آدھے سے زیادہ پر اُترے ہوئے تھے اور اس کی جلد صاف نظر آ رہی تھی۔ وہ پچھلے دس بارہ دن سے انڈوں پر بیٹھی ہوئی تھی۔ حوائج زندگی نے اُسے باہر نکالا تھا۔ اُس نے جلدی جلدی ڈبے سے پانی پیا اور بڑی تیزی سے صحن کے چکر لگانے لگی۔ کہیں کچھ ملتا تو چُگ لیتی۔

''کُڑ کُڑ کُڑ کُڑ......آج کچھ بھی نہیں ہے کھانے کو''؟ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔

اتنے میں آزاد کی امی نے لَپ بھر دانے صحن میں ڈالے۔ وہ ان پر پَل پڑی اور پل بھر میں ختم کر کے بھاگتی ہوئی واپس چلی گئی۔

''یہ بھی تو مقصد پہ ہے' شہناز نے کہا 'تخلیق کے عمل میں حصہ لینے سے بڑا مقصد کیا ہو سکتا ہے''۔

''تخلیق کی تربیت اور رہنمائی''۔ آزاد نے کہا۔

''سو فیصد درست''۔ شہناز نے اس کی تائید کی۔

''زندگی یہاں بھی سُست نہیں ہے''۔ آزاد نے کہا۔

''یہاں کی زندگی اگر ایسی ہے تو میں اسے بیان کرنے سے قاصر ہوں''۔ شہناز نے کہا۔

''تم شاعری بے شک نہ کرو''۔ آزاد نے اس کی رائے جاننے کی کوشش کی۔

''مجھے یہ زندگی اور موت کے بیچ کی کوئی کیفیت لگی ہے''۔ شہناز نے کہا۔

''شاید ایسا ہی ہے''۔ آزاد نے کہا۔

شہناز کے چہرے پہ خوف اور حیرت کے ملے جُلے تاثرات تھے۔

''کیسے جی لیتے ہو تم لوگ یہ زندگی''؟ اس نے پوچھا۔

''یہاں زندگی اپنی تلاش میں ہے اور ہم اس کا ساتھ دے رہے ہیں، فرار کا راستہ کوئی

راستہ تو نہیں ہے نا''۔ آزاد نے جواب دیا۔

شہناز کو لگا جیسے اِن لفظوں نے اسے کاٹ کھایا ہو۔

''اُدھر دیکھو''۔ آزاد نے ایک طرف اشارہ کیا۔

بازو کی گلی میں ایک لاغر سا گدھا اپنے سے دگنے بوجھ تلے دبا چلنے کی کوشش سی کر رہا تھا اور مالک اس پر ڈنڈے برسا رہا تھا۔

شہناز نے اسے آواز دی ''اے بھائی کیوں اس جانور پر ظلم کر رہے ہو''؟

آدمی اور گدھے کی صحت میں کوئی خاص فرق نہ تھا۔ اُس نے اوپر مڑ کر ایسے دیکھا جیسے دور نیچے کنویں میں گرا آخری سانسیں لے رہا ہو۔

''بی بی اے مکر کرنا ہے، کھانے نے ویلے رجنائیں تے کم نے ویلے اس کی موت پئی جانی''۔ گدھے کے مالک نے مریل سی آواز میں شکائت لگائی۔

''دونوں مظلوم ہیں'' شہناز نے آزاد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہی رواج ہے یہاں کا''۔ آزاد نے کہا۔

دو ہفتے بعد آزاد اور شہناز کی منگنی کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ لیکن آزاد کو اپنے ضلع میں تنظیم سازی کے سلسلے میں وقت دینا پڑ رہا تھا۔ بہت سے دوست ایسے تھے جو بوجوہ ناراض تھے وہ ان سے ملتا تو پوری پوری رات بیت جاتی۔

آج وہ چند ایسے لڑکوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا جنہوں نے تنظیم کے لیے بہت کام کیا تھا لیکن پچھلے ایک سال سے خاموش بیٹھے تھے۔

''دیکھو عارف آپس کے اختلافات سے تنظیم کا نقصان نہیں کرنا چاہیے''۔ کافی دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد آزاد نے اصل موضوع چھیڑا۔

عارف بالکل خاموش بیٹھا رہا۔ کمرے میں کل آٹھ لڑکے تھے، آزاد نے باری باری سب کی طرف دیکھا اور جواب نہ پا کر پھر بولا۔

''دیکھو اگر تم اس معاملے میں کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں ہو تو صاف بتا دو میں چلا جاتا ہوں''۔

''آزاد صاحب ہم سب دوست آپ کا بے حد احترام کرتے ہیں' عارف بولا' اور ہمیں آپ سے کوئی شکائت نہیں ہے۔ جن لوگوں نے تنظیم کے ساتھ زیادتی کی نہ تو وہ آج یہاں پر موجود ہیں نہ اس سے پہلے کبھی انہوں نے ہم سے بات کرنا گوارا کیا۔ آپ سے تو ہمارا معاملہ ہی نہیں ہے، بات کیا کریں''۔

''دیکھو عارف تنظیم کسی فرد یا چند افراد کی ملکیت نہیں ہے۔ اس میں ہم سب کی محنت شامل ہے۔ میں مانتا ہوں کہ کچھ غلط فیصلے ہوئے ہیں جن سے ہمیں نقصان بھی ہوا، لیکن اس پر خاموش ہو کر بیٹھ جانے سے تو اور بھی نقصان ہو رہا ہے''۔

''آزاد صاحب ہمارا متحرک ہونا شاید کچھ لوگوں کو اچھا نہیں لگتا' عارف بولا' وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری کوشش اور محنت کا مقصد عہدوں کا حصول ہے۔ جس جگہ اتنی سطحی سوچ رکھنے والے لوگ فیصلوں کا اختیار رکھتے ہوں وہاں رہ کر کام نہیں ہو سکتا۔ ہم نے پہلے دن ہی نشاندہی کر دی تھی اور بتا دیا تھا کہ فلاں فلاں لوگوں کی کمٹمنٹ پر ہمیں شک ہے لہٰذا ان پر اعتماد نہ کیا جائے۔ لیکن بجائے اس کے انہی پر اعتماد کیا گیا۔ نتیجہ آپ کے سامنے ہے، چھ ماہ کے بعد وہ دوسروں کو بھی لے کر کہیں اور چلا گیا۔ اب آپ بتائیں جہاں رائے کا احترام نہ کیا جائے، نہ دوسروں کی سنی جائے نہ ہی اپنی سمجھ بوجھ سے کام لیا جائے، من مانے اور انہونے فیصلے لیے جائیں وہاں کیسے رہا جائے اور کیوں رہا جائے''؟

''تمہاری بات سو فیصد درست ہے اور تمہیں یاد ہے کہ میں نے بھی اس فیصلے کی مخالفت کی تھی اور آج وقت نے ثابت کر دیا کہ ہمارا موقف صحیح تھا۔ لیکن اس کی وجہ سے ہم کام چھوڑ کر بیٹھ جائیں تو نقصان کس کا ہے''؟ آزاد نے جواب دیا۔

''بات ٹھیک ہے آزاد صاحب جب آدمی کام کرتا ہے تو غلطیاں بھی ہوتی ہیں۔ لیکن کوئی ان غلطیوں سے بچنے کی کوشش تو کرے۔ اور جب سب کچھ سامنے آ گیا تو ان میں اتنی بھی اخلاقی جرأت نہ پیدا ہو سکی کہ وہ اپنی غلطی کا اعتراف ہی کر لیتے۔ ایک بار ہی سہی ہم سے بات کی ہوتی۔ تو جب انہیں ہماری ضرورت نہیں ہے تو ہمیں کیا ضرورت ہے کہ ان کے کام میں ٹانگ اڑاتے پھریں۔ یہی ایک بات نہیں' اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا' اس تمام عرصے

میں کتنے سٹڈی سرکل ہوئے؟ کتنا لٹریچر تقسیم کیا گیا؟ دوستوں کی نظریاتی تربیت کا دوسرا کیا انتظام کیا گیا؟ محض رومانس کی بنیاد پر لوگوں کو چلائے رکھنا کہاں کا انصاف ہے؟ جب بھی مشکلات آتی ہیں، رومانس ٹوٹتے ہیں تو لوگ بکھر جاتے ہیں۔ ہماری تنظیم کے چال چلن انقلابی تنظیموں سے میل نہیں کھاتے آزاد صاحب۔ ایسے میں اپنا اور دوسروں کا وقت برباد کرنے سے بہتر ہے لوگ اپنے اپنے کاموں میں لگے رہیں۔ ہم ایک انقلاب کی بات کرتے ہیں لیکن خود اس بات کا ادراک نہیں رکھتے کہ تنظیم کسے کہتے ہیں، یہ کیسے کھڑی کی جاتی ہے، کیسے چلائی جاتی ہے''؟

آزاد غور سے اسے سنتا رہا پھر بولا:

''تمہاری باتوں سے میں سو فیصد متفق ہوں۔ بلکہ مجھے خوشی ہے کہ تم تمام امور پر گہری نظر رکھتے ہو۔ میں مانتا ہوں کہ تم لوگوں کا اختلاف جینوئن ہے اس کے باوجود تم سے ڈائیلاگ نہیں ہوئے۔ ہماری پچھلی میٹنگ میں یہ تمام موضوعات زیرِ بحث آئے ہیں۔ یہ میٹنگ دو دن تک جاری رہی جس میں کابینہ پر شدید تنقید ہوئی۔ تنظیم کی پالیسیز اور کارکردگی پر کڑی نقطہ چینی ہوئی۔ مجھے افسوس ہے کہ تم اس میٹنگ میں نہ تھے۔ یہ ایک تھکا دینے والا طویل مباحثہ تھا جس نے ہمارے ذہنوں کی چولیں ہلا دیں۔ بہرحال اس کے نتیجے میں یہ فیصلے ہوئے ہیں تم بھی دیکھ لو اگر تم لوگ ان سے متفق ہو تو پرسوں کی میٹنگ میں آ جاؤ اور اگر ان سے مطمئن نہیں ہو تب تم آ جاؤ نئے سرے سے تنظیم سازی کرنے کے لیے مجھے تم لوگوں کے تعاون کی ضرورت ہے''۔

اتنا کہہ کر وہ اُٹھ گیا۔ جب وہ گھر پہنچا تو رات کے دو بج رہے تھے۔ اس نے بہت آہستگی گیٹ کھولا تو دیکھا کہ اس کے کمرے کی بتی جل رہی ہے۔ کمرے میں چھ سات لڑکے بیٹھے تھے۔ آزاد کو دیکھ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

''ارے آج تو بڑا کام کیا ہے یار، یہ صغیر کو کہاں سے پکڑ لائے' اس نے بیٹھتے ہوئے کہا' بھول ہی گیا تھا ہمیں تو''۔

''بس ہاتھ آ گیا تو چھوڑا نہیں، آپ سنائیں آزاد صاحب کہاں سے آ رہے ہیں''؟

''عارف لوگوں کے پاس تھا، بڑے سخت جان لوگ ہیں یار بات ماننے کو تیار ہی نہیں ہوتے' اس نے جواب دیا' پوری رات مغز ماری کرنا پڑی ہے''۔

''پھر کیا نتیجہ نکلا''؟

''کمٹڈ دوست ہیں یار کام کریں گے، آج تک ان سے کسی نے بات ہی نہیں کی خواہ مخواہ سب ان سے شکوے کر رہے ہیں''۔ آزاد نے وضاحت کی۔

''تم سناؤ، تمہارا کام کیسا چل رہا ہے''؟

''آزاد صاحب کام تو ٹھیک ہی چل رہا تھا لیکن جب ہم چاکنگ کرتے ہوئے شہر تک پہنچے تو پولیس نے ریڈھ کر لیا اور ہمارے دو ساتھیوں کو پکڑ کر لے گئے''۔

آزاد کو جیسے کرنٹ لگ گیا۔

''کیا کہہ رہے ہو؟ کب ہوا یہ''؟

''کوئی آدھا گھنٹہ ہو گیا ہے''۔

''چلو اٹھو''۔

اتنا کہہ کر وہ کمرے سے نکل گیا۔ باقی لڑکے بھی اس کے پیچھے چل دیے۔

''دیکھو بشارت تم اور اصغر سید ھے عابد صاحب کو جا کر اطلاع کرو اور نسیم تم کسی کو ساتھ لے کر اے ایس آئی شریف پاس چلے جاؤ اور پوچھو وہ ہماری کیا مدد کر سکتا ہے۔ اور اختر تم عارف کو جا کر کہو اپنے دوستوں کو لے کر جتنی جلد ہو سکے تھانے آ جائے میں ادھر ہی ملوں گا''۔ آزاد سب کو ہدایات دے کر باقی دوستوں کے ہمراہ تھانے پہنچ گیا۔

جب وہ تھانے پہنچا تو اسے اندر جانے سے روک دیا گیا۔ غصے سے اس کا سر کھول رہا تھا لیکن اس نے باقی دوستوں کے آنے کا انتظار کرنا مناسب سمجھا۔ اسی اثنا میں تھانے کے اندرونی حصے سے چیخ و پکار سنائی دینے لگی۔ اب معاملہ آزاد کی برداشت سے باہر ہو گیا۔ گیٹ پر چار سپاہی کھڑے تھے وہ اندر جانے کی اجازت نہ ملنے پر ان سے الجھ پڑے۔ بات ہاتھا پائی تک جا پہنچی اور با قاعدہ لڑائی شروع ہو گئی۔ شور کی آواز پر چند اور سپاہی بھی جمع ہو گئے اور لڑائی بڑھ گئی حتیٰ کہ ساتھ کی بیرک میں سوئے ہوئے سپاہی بھی آ آ کر لڑائی میں شامل ہونا شروع ہو گئے۔ اندھیرے میں کون کس کو پیٹ رہا ہے کسی کو سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ لڑکے تو تین ہی تھے پولیس والے ایک دوسرے کی دُرگت بنا رہے تھے۔ اسی اثنا میں عارف دس گیارہ لڑکوں کے ساتھ اس

لڑائی میں کود پڑا۔ اتنے میں پوری بیرک کے سپاہی موقع پر پہنچ چکے تھے۔

عابد جو تنظیم کا صدر تھا وہ اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ ایس پی کے گھر کا دروازہ پیٹ رہا تھا۔ ایس پی کو اطلاع ملی تھی کہ تھانے پر حملہ ہو گیا ہے اس نے سمجھا اس کے گھر پر بھی حملہ ہو گیا ہے۔ اس نے وائرلیس پر تھانے میں اطلاع دی کہ اس کے گھر پر بھی حملہ ہو گیا ہے نفری بھیجی جائے۔ اندر سے کوئی جواب نہ پا کر عابد نے اونچی آواز میں ایس پی کو پکارا۔

''چوہدری منظور میں عابد ہوں تمہارے دروازے پر۔ میرے ساتھیوں کو پولیس پکڑ لے گئی ہے اور مار پیٹ کر رہی ہے۔ سُن لو اگر ایک لڑکے کا بال بھی بیکا ہو گیا، میں تمہارے گھر کو آگ لگا دوں گا۔ اپنے کتوں کو بولو انہیں چھوڑ دیں ورنہ ہم سے برا کوئی نہ ہوگا''۔

ایس پی عابد کو جانتا تھا اس نے تھانے میں رابطہ کیا تو جواب ملا۔

''سر کم از کم پچاس آدمیوں نے تھانے پر حملہ کیا ہے، ڈیوٹی پر موجود سپاہیوں کو مارا پیٹا ہے جن کی حالت نازک ہے، ہم نے بڑی مشکل سے ان لوگوں پر قابو پا کر لاک اپ کیا ہے''۔

''مجھے پوری تفصیل بتاؤ ہوا کیا ہے، تم نے کسی کو پکڑا ہے''؟ ایس پی چلایا۔

''سر جی رات ایک بجے دو لڑکوں کو آوارہ گردی کرتے ہوئے پکڑا ہے جن کے قبضے سے غیر قانونی اسلحہ برآمد ہوا ہے۔ تھوڑی دیر بعد ہی ان کے ساتھیوں نے تھانے پر حملہ کر دیا''۔

''ابھی کیا سچوایشن ہے''۔ ایس پی نے پوچھا۔

''سر حالات کنٹرول میں ہیں، ہم نے ان سب کو پکڑ کر بند کر دیا ہے''۔ ڈیوٹی افسر نے جواب دیا۔

''میرے لیے نفری بھیجو اور باقی لوگوں کو بھی کال کرو ارجنٹ''۔

''او کے سر''۔

''جاؤ ذرا دیکھو گیٹ پر کتنے لوگ ہیں، انہیں کہو میں آ رہا ہوں''۔ ایس پی نے ڈرائیور اور گارڈ کو ہدائت کی۔

''سر وہاں پر چار آدمی کھڑے ہیں، ہم نے انہیں مطمئن کر دیا ہے''۔ ڈرائیور نے

رپورٹ دی۔

''ٹھیک ہے تم گاڑی تیار کرو''۔

ایس پی صاحب گیٹ پر پہنچے تو پولیس کی نفری بھی پہنچ گئی۔

''عابد صاحب مجھے ابھی تک پوری صورتحال کا پتہ نہیں ہے۔ میری معلومات کے مطابق تھانے پر حملہ ہوا ہے اور کافی تعداد میں سپاہی زخمی ہیں۔آپ تھانے آجائیں وہیں پر بات کرلیں گے''۔ایس پی صاحب عابد سے بات کرکے روانہ ہو گئے۔

عابد اور اس کے دوست بھی تھانے پہنچ گئے۔

ایس پی کو ساری صورتحال سے آگاہ کیا گیا۔اس کے لیے پریشانی کی بات یہ تھی کہ کل بیس سپاہی زخمی تھے جن میں سے سات ہسپتال میں تھے۔

''تم نے کل کتنے آدمی پکڑے ہوئے ہیں''؟ ایس پی نے پوچھا۔

''سر کل سترہ آدمی ہیں''۔تھانیدار نے جواب دیا۔

''ان میں سے دو پہلے سے لاک اپ میں تھے''؟

''جی سر''۔

''گویا پندرہ لڑکوں نے تمہارے بیس آدمیوں کو زخمی کیا''؟

''سر معاملہ یہ ہوا کہ لڑائی شروع ہوئی تو بارک میں سوئے ہوئے سپاہی بھی آکر شامل ہو گئے اور اندھیرے میں اپنے ہی ساتھیوں کو پیٹنا شروع کر دیا''۔تھانیدار نے جواب دیا۔

''یہ بکواس بند کرو، اناج کی بوریاں ہو تم لوگ، شرم سے ڈوب کہ مر جاؤ'' ایس پی کے منہ سے جھاگ اڑ رہی تھی۔

''لڑکوں کی کیا پوزیشن ہے''؟ وہ ڈی ایس پی سے مخاطب ہوا۔

''سر میں نے ابھی ان کو نہیں دیکھا ہے''۔ڈی اسی پی نے جواب دیا۔

ایس پی نے اسے قہر آلود نگاہوں سے دیکھا۔

''سر تین لڑکے زیادہ زخمی ہیں''۔تھانیدار نے جواب دیا۔

''کہاں ہیں وہ''؟

''لاک اپ میں ہیں سر'' تھانیدار بولا۔

''لاشیں بھیجنا چاہتے ہو ان کی''؟ اسی پی دھاڑا۔

ڈی ایس پی فوراً آفس سے نکل گیا۔

ایس پی بھی تیزی سے لاک اپ کی طرف گیا۔ لاک اپ کے دروازے کے پاس ایک لڑکے نے آواز لگائی۔

''چوہدری منظور اگر ان لڑکوں کو کچھ ہو گیا تو ہم تمہاری نسل مٹادیں گے''۔

تین لڑکے بے ہوش پڑے تھے اور ان کے سر سے خون جاری تھا۔

اتنے میں ایک گاڑی احاطے میں داخل ہوئی۔ لڑکوں کو اس میں ڈال کر ہسپتال بھیج دیا گیا۔

''سر عابد نام کا آدمی آپ سے ملنے کی ضد کر رہا ہے''۔ ڈی ایس پی نے کہا۔

''اسے آفس میں بٹھاؤ''۔ ایس پی نے سگریٹ سُلگاتے ہوئے کہا۔

وہ تھانے کے احاطے سے باہر نکل گیا۔ اس کا دماغ غیر ضروری حد تک گرم تھا اور وہ اس معاملے کا فوری طور پر کوئی حل سوچنے سے قاصر تھا۔

وہ تھوڑی دیر ٹھنڈی ہوا میں گھومتا رہا اور دو سگریٹ پینے کے بعد قدرے نرمی سے ڈی ایس پی سے مخاطب ہوا۔

''الطاف تم فوری ہسپتال جاؤ، ڈاکٹر بھی ہماری طرح سو رہے ہوں گے اور جلد آ کر مجھے زخمیوں کے متعلق رپورٹ دو''۔

اس کے بعد وہ آفس میں گیا۔ عابد اپنے دوستوں کے ساتھ اس کا منتظر تھا۔ اس نے اپنی معلومات سے عابد کو آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

''صورتحال اچھی نہیں ہے، سات سپاہی اور تین لڑکے زیادہ زخمی ہیں اور ہسپتال شفٹ کر دیے گئے ہیں۔ ہمیں مل کر صورتحال کو کنٹرول کرنا اور اس کا حل سوچنا ہوگا۔ آپ اپنے ساتھیوں سے مل لیں۔ میرے لیے اس صورتحال سے نمٹنا فی الحال مشکل ہے''۔

عابد کو اپنے ساتھیوں سے ملنے کے بعد پتہ چلا کہ تین لڑکے زیادہ زخمی ہیں جن میں آزاد بھی شامل ہے۔ جو لڑکے لاک اپ میں تھے ان کو بھی بہت چوٹیں آئی تھیں اور انہیں فرسٹ

ایڈ کی ضرورت تھی۔ عابد نے اس سلسلے میں ایس پی سے بات کی تو اس نے کہا کہ ان کی فرسٹ ایڈ کا بندوبست یہیں پر کر دیا جائے گا۔

عابد تھانے سے نکل کر سیدھا ہسپتال پہنچا تو صبح ہو رہی تھی۔ دولڑ کے ہوش میں تھے جبکہ آزاد ابھی تک بے ہوش تھا۔ ان کے گھر والوں میں سے کسی کو بھی اس حادثے کی خبر نہیں تھی۔ آزاد کے متعلق اس نے ڈاکٹر سے پوچھا تو اس نے جواباً پوچھا۔

''آپ اس کے کیا لگتے ہیں''؟

''یہ میرا دوست ہے'' عابد نے جواب دیا۔

''سیریس ہیڈ انجری ہے فی الحال کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ہمارے پاس مطلوبہ سہولتیں اور سپیشلٹی دستیاب نہیں ہے انہیں پنڈی شفٹ کرنا پڑے گا۔ بہرحال آپ دعا کریں زندگی موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے''۔ ڈاکٹر اتنا کہہ کر دوسرے مریضوں کی طرف چل دیا اور عابد کا سر چکرانے لگا۔

باہر اس کے دوست اس کے منتظر تھے، انہیں مل کر وہ بولا:

''آزاد کی حالت اچھی نہیں ہے'' یہ کہہ کر وہ فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا اس کے ساتھی بھی بہت پریشان ہو گئے۔

تھوڑی دیر بعد وہ ہسپتال سے باہر آ گئے۔

''ان کے گھر والوں کو کون اطلاع کرے گا''؟ عابد نے سوال کیا۔

کسی کو ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

بہت دیر تک وہ خاموش کھڑے رہے۔ صبح ہو چکی تھی۔

''نذیر تم جا کر پولیس کے زخمیوں کو دیکھ آؤ ان کی کیا حالت ہے' عابد بولا' اور لطیف تم کالج جاؤ اور پروٹسٹ ارینج کرو''۔

تھوڑی دیر بعد نذیر نے واپس آ کر اطلاع دی کہ پولیس والے بھی کافی زخمی ہیں لیکن کسی کی بھی حالت زیادہ نازک نہیں ہے۔ یہ خبر عابد کے لیے تسلی بخش تھی۔

''نذیر تم فوری جاؤ اور آزاد کے ماموں کو اطلاع کرو اور اس کے بعد کورٹ میں جاؤ اور راجہ بشیر صاحب کو ساری صورتحال بتا کر کہو کہ ہم پولیس کے خلاف پرچہ کرنا چاہتے ہیں''۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد آزاد کے ماموں ہسپتال پہنچ گئے۔عابد نے انہیں واقعے کی تفصیلات بتائیں اور انہیں آزاد کے پاس لے گیا۔آزاد اس وقت تک انتہائی نگہداشت کی وارڈ میں شفٹ ہو چکا تھا۔وہ کافی دیر باہر کھڑے انتظار کرتے رہے۔ڈاکٹر جب باہر نکلے تو چوہدری اسلم نے انہیں روک کر اپنا تعارف کروایا۔اتفاق سے ایک ڈاکٹر اس کا دوست نکل آیا۔اس نے انہیں تسلّی دی اور کہا:

''ہم نے آزاد کے ڈاکومنٹس تیار کر لیے ہیں اور اسے سی ایم ایچ راولپنڈی شفٹ کر رہے ہیں۔آپ نے اگر ساتھ جانا ہے تو تیار ہو کر آ جائیں۔میں خود بھی آپ کے ساتھ جاؤں گا''۔

آزاد کی امی ،شہناز ،اس کی امی اور تمام بچے بھی ہسپتال پہنچ گئے۔نو بجے کے قریب ہسپتال کی ایمبولینس آزاد کو لے کر روانہ ہوگئی۔پورے خاندان میں صفِ ماتم بچھ گئی۔دو دن بعد اس کی منگنی تھی اور اب کسی کو خبر نہ تھی کہ اس کی کتنی سانسیں باقی ہیں۔

چوہدری اسلم بھی بہن کو لے کر روانہ ہو گیا۔خاوند کی وفات کے بعد آزاد ہی اس کی زندگی کا واحد سہارا تھا۔اس کے جسم سے جان ہی نکل گئی تھی۔وہ بالکل خاموش تھی۔''پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے ہمشیرہ، آزاد انشا اللہ ٹھیک ہو جائے گا''۔چوہدری اسلم نے بہن کو حوصلہ دینا چاہا مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔۱۲ بجے کے قریب وہ سی ایم ایچ پہنچ گئے۔ڈاکٹر عظیم نے آزاد کو عملے کے حوالے کیا ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر کو کیس کی تفصیل بتائی اور ایک بڑے نیوروسرجن جنرل احسان کے پاس چلا گیا جو اس کا دوست تھا۔

''بالکل بے فکر ہو جاؤ عظیم تم نے اسے ہمارے حوالے کیا ہے، اسے اللہ کے حوالے سمجھو۔میں سارے ہی مریضوں کو اپنا عزیز سمجھتا ہوں لیکن تمہارا عزیز ہونے کے ناطے میں تمہاری طرح اس کا خیال رکھوں گا''۔ڈاکٹر احسان نے اسے تسلی دی۔

شام تک اس کے ٹسٹ وغیرہ ہو گئے اور ڈاکٹر احسان نے رپورٹس دیکھنے کے بعد ڈاکٹر عظیم کو بلا لیا۔

''مائنر انٹرنل بلیڈنگ ہے، مجھے یقین ہے سرجری کی ضرورت نہیں پڑے گی۔اس کی

treatment شروع ہو چکی ہے اور ہمیں ۲۴ گھنٹے میں ریزلٹ مل جائے گا''۔ڈاکٹر احسان نے اسے تفصیل بتانے کے بعد کہا۔

''اب کی بار میر پور آیا تو مچھلی کے شکار پر کوئی کمپرومائز نہیں ہوگا''۔

''پرامِس''۔

ڈاکٹر عظیم نے اس کا شکریہ ادا کیا اور چوہدری اسلم اور اس کی بہن کو ساری صورتحال سے آگاہ کر کے انہیں تسلی دی اور واپس روانہ ہو گیا۔



'چوہدری صاحب وہ شاہ صاحب سے آپ نے بات کرنی تھی' مشتاق نے موقع پاتے ہی بات کر دی۔

''کیا بات کرنی تھی''؟ چوہدری نے پوچھا۔

''وہی جی اپنے بابو جی کے رشتے کی''۔ مشتاق سر جھکائے ایسے کھڑا تھا جیسے چوہدری سے بھیک مانگ رہا ہو۔

چوہدری صاحب تھوڑی دیر مشتاق کو گھورتے رہے پھر بولے ''بہت بے صبرا ہو رہا ہے''؟ مشتاق گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

''ایسا کرو راجہ کرم داد کو جا کر شام کے کھانے پر بلا آؤ''۔

''ٹھیک ہے صاحب''۔ مشتاق ہاتھ باندھے کھڑا تھا، جواب دے کر کمرے سے نکل گیا۔

راجہ کرم داد چوہدری صاحب کا دوست تھا۔ اپنی برادری میں خاصا اثر رسوخ رکھتا تھا۔ اسے بھی چوہدری سے ایک دو کام تھے اس لیے پیغام کو غنیمت سمجھا اور وقت پر پہنچ گیا۔ وہ کافی دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ کھانا کھانے کے بعد راجہ کرم داد نے اپنے کام کے متعلق بات کی۔ رخصت ہونے سے پہلے چوہدری اس سے مخاطب ہوا۔

''کرم داد یہ بتاؤ نذیر حسین شاہ کو جانتے ہو''؟ چوہدری نے کرم داد سے پوچھا۔

''نذیر حسین شاہ''؟ کرم داد نے ذہن پر زور دیا مگر ایسا کوئی نام اس کے ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔

''راجہ نصیر کا محلے دار ہے اور ہائی سکول میں ہیڈ کلرک ہے'' چوہدری نے اس کی مدد کی۔

''ارے ہاں یاد آیا چوہدری صاحب' کرم داد نے کہا' لیکن اس سے کیا کام پڑ گیا آپ کو''؟

''اپنا بابو عزیز ہے نا، میرے ساتھ ہوتا ہے جو......''

ہاں ہاں ٹھیک ہے' کرم داد بیچ میں بول پڑا۔

''اس کی بیوی فوت ہو گئی ہے اور نذیر شاہ کی لڑکی کا رشتہ چاہیے اس کے لیے 'چوہدری نے کہا' شریف آدمی ہے، پڑھا لکھا ہے، بڑا افسر ہے''۔

''ٹھیک ہے چوہدری صاحب' کرم داد کچھ سوچتے ہوئے بولا' لیکن بابو تو عمر میں کافی بڑا ہوگا لڑکی سے اور پھر......''

''کچھ اتنا بھی بڑا نہیں ہے یار دیکھنے میں تو بالکل جوان لگتا ہے''۔ چوہدری نے اس کی بات کاٹ لی۔

''ٹھیک ہے میں پتہ کر کہ ہی بتا سکتا ہوں' کرم داد نے کہا' لیکن ایک بات تو بتائیں چوہدری صاحب کہ یہ بابو آپ کو کیوں بیچ میں ڈال رہا ہے، نہ آپ کی نذیر شاہ سے کوئی رشتے داری، نہ ذات برادری، نہ تعلق واسطہ......؟''

''تمہاری بات بھی ٹھیک ہے کرم داد لیکن اس نے خود نہیں کہا، مجھے تو ڈرائیور مشتاق نے بتایا۔ ہم لوگ پنڈی جا رہے تھے راستے میں بات چل نکلی اور میں نے کہہ دیا کہ میں بات کرلوں گا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ماں باپ تو اس کے فوت ہو گئے ہیں، بہنوں، بھائیوں اور دیگر رشتہ داروں نے اسے بہت کہا کہ دوسری شادی کرلو لیکن وہ مان نہیں رہا تھا۔ اب شاید ان سے بات کرنے میں شرماتا ہوگا'' چوہدری نے وضاحت کی۔

''ٹھیک ہے چوہدری صاحب میں پتہ کر کہ بتاؤں گا لیکن ایک بات مجھے کھٹک رہی ہے کہ عمر کا فرق زیادہ ہے''۔ کرم داد نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

''نذیر شاہ سیانا آدمی ہے وہ یہ رشتہ نہیں ٹھکرائے گا'' چوہدری نے کہا'' تم بات چلا کر دیکھو''۔

''چوہدری صاحب آپ کو پتہ نہیں ہے، یہ سیّد لوگ اولاد کو بڑا لاڈ لار کھتے ہیں خواجوں کی طرح'' کرم داد نے کہا'' ہم جیسے نہیں ہیں۔ اگر لڑکی نے انکار کر دیا تو پھر مشکل ہو جائے گی۔ اس لیے میں آپ کا نام نہیں لوں گا''۔

''چلو وہ تمہاری مرضی ہے'' چوہدری کے ماتھے پر بَل پڑ گئے'' لیکن کوشش کرو یہ کام ہو جائے''۔

''ٹھیک ہے مجھے دو ایک دن دے دیں پھر میں خبر کرتا ہوں'' کرم داد نے اٹھتے ہوئے کہا'' چوہدری صاحب وہ اپنے سائیں کا ایک لڑکا ہے، دسویں مشکل سے کی ہے اس نے اب آگے کی ہمت تو نہیں ہے، فاقے لگ رہے ہیں بچاروں کو''۔

''بابو کے پاس بھیج دو دیکھ لیں گے'' چوہدری اسے الوداع کرنے اٹھ گیا۔

''ابّا چوہدری صاحب سے ملاقات ہوئی'' گھر میں داخل ہوتے ہی بڑے لڑکے نے پوچھا۔

''سائیں کریم کے لڑکے کی درخواست دی ہے ابّا''؟

''ہاں درخواست تو دے آیا ہوں''۔ کرم داد نے جواب دیا۔

''کیا کہہ رہے تھے چوہدری صاحب' لڑکے نے پھر سوال کیا' کام ہو جائے گا؟

''یہ تو میں نے نہیں پوچھا''۔

''سائیں کریم کے حالات کے بارے میں بتا دیتے ابّا'' لڑکے کے لہجے میں تشویش تھی۔

''وزیر بن کہ لوگوں کو بھول گیا ہے کیا''؟ کرم داد نے لڑکے کو گھورا۔

''آ گئے جی خیریت سے، کیا کام تھا چوہدری کو''؟ کرم داد کی بیوی نے پوچھا۔

''تیرے متعلقہ ہی کام ہے بتا دوں گا اتنی بے صبری کیوں ہو رہی ہو''۔

کرم داد نے جب بیوی کو کام کی تفصیل بتائی تو اس نے انگلی دانتوں میں لے لی اور حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

''اے بھلیے لوکے کیا ہو گیا تجھے''؟ کرم داد اس کی حالت پر حیران ہو گیا۔

''کیوں آپ کیوں انجان بنے ہوئے ہیں اس لڑکی کی کارستانیوں کی خبر نہیں ہے کیا''؟

''مجھے تو کوئی خبر نہیں''۔

''آپ کا کیا ہے آپ تو جیسے برادری میں رہتے ہی نہیں ہیں''۔

''برادری میں اگر نہیں رہتا تمہارے ساتھ تو رہتا ہوں کوئی چنگی مندی بتا دیا کرو'' میاں نے شکوہ کیا۔

''آپ کے پاس اتنا وقت کہاں''؟

''چلو اب بتا دو اب تو وقت ہے''۔

اس لڑکی کا تو چوہدری ریشم کے لڑکے کے ساتھ یارانہ ہے ایک نمبر کا بدمعاش ہے وہ''۔

''ہوں تو پھر''؟ کرم داد نے بریکنگ نیوز سننے کے بعد کہا۔

''پھر کیا ایسی لڑکی گھر بسانے کے لائق ہے''؟ بیوی نے جواب دیا۔

''تو کس لائق ہے پھر''؟

''ارے چمڑی اتار کہ کتوں کے آگے ڈالنے کے لائق ہے'' وہ سچ مچ غصے میں تھی۔

''بھئی اس میں غصے کی کیا بات ہے' کرم داد بولا 'اس کے ماں باپ سے پوچھو وہ تیار ہوں تو کتوں کی کیا کمی ہے''۔

''آپ کو تو ہر وقت مذاق کرنے کی بیماری ہو گئی ہے''۔

''اچھا بھئی ٹھیک ہے تم اس کو مذاق سمجھتی ہو تو سمجھتی رہو۔ اب ایسا کرو کہ یہ پیغام پہنچاؤ، ثواب کے کام میں دیر نہیں کرتے'' کرم داد نے بات ختم کرنے کی کوشش کی۔

''دیکھو جی میں تو اس معاملے میں نہ پڑوں گی، چوہدری ریشم کے لڑکے سے بے عزتی کرانے کا مجھے کوئی شوق نہیں ہے'۔ کرم داد کی بیوی نے ہاتھ کھڑے کر دیے۔ 'وہ پہلے سے ہی نذیر شاہ کو تلے بیٹھے ہیں''۔

''وہ کیوں تلے بیٹھے ہیں''؟ کرم داد نے پوچھا۔

''رشتے سے انکار جو ہو گیا ہے' بیوی نے جواب دیا 'لڑکا کہتا ہے میں دیکھوں گا کون وہاں بارات لے کر آنے کی جرأت کرتا ہے''۔

''تو انہوں نے رشتہ بھی مانگ لیا ہے''؟

''خالی مانگ ہی نہیں لیا نہ بھی کروالی ہے''۔ بیوی نے جواب دیا۔

''پھر تو اور بھی اچھی بات ہے' کرم داد بولا 'ہمارا چانس بڑھ گیا ہے، نذیر شاہ اس حالت میں لڑکی کو زیادہ دیر گھر میں نہیں بٹھائے گا''۔

''آپ خواب دیکھنا چھوڑ دو راجہ صاحب' بیوی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا' اور چوہدری کو بھی بتا دو اس معاملے سے دُور ہی رہے۔ اچھی کھاسی عزت دے رکھی ہے اللہ نے کیوں کل کے چھوکروں کے ہاتھوں ذلیل ہونے لگا ہے''۔

''اچھا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم بات نہیں کرو گی''؟ کرم داد نے بیوی سے پوچھا۔

''لیاقت کے ابا آپ مجھے ایک بات تو بتاؤ' اس کی بیوی تنگ آ کر بولی' اس بابو عزیز ماکھائے کا کوئی والی وارث ہی نہیں ہے جو چوہدری اور آپ اس کا رشتہ ڈھونڈتے پھر رہے ہو۔ جان نہ پہچان خالہ جی سلام''؟

''باتیں تو اس کی ساری صحیح ہیں۔ چوہدری نے بھی کس عجیب ،ان پڑھے کام میں پھنسا دیا ہے' کرم داد بیوی کے ہاتھوں زیر و پر بولڈ ہونے کے بعد سوچ رہا تھا' کام تو بہت ٹیڑھا ہے''۔

دوسرے دن اس نے ایک سکول ماسٹر کو پکڑ کر اس کام کے لیے راضی کر لیا۔ سکول ماسٹر نے دوسرے دن ہی آ کر دروازہ پیٹنا شروع کر دیا اور کھڑے کھڑے ہی خبر سنائی کہ شاہ جی نے چند روز میں مشورہ کر کہ جواب دینے کا کہا ہے۔

شاہ جی اپنی لڑکی اور شرافت دونوں کی وجہ سے خاصے پریشان تھے۔ ایک دو رشتے پہلے بھی آئے لیکن احوال کا علم ہونے پر لوٹ گئے۔ بابو کی عمر جتنی زیادہ تھی رشتہ اتنا ہی معقول تھا۔ وہ بابو عزیز کے خاندان، تعلیم اور عہدے کی طرف دیکھتا تو حد درجہ مطمئن ہو جاتا۔ مگر بابو کی عمر دیکھتا تو اس کے اطمینان کی چادر میں سو چھید ہو جاتے۔ پھر وہ ایوب کے بارے میں سوچتا۔ اچھا خاصا خوبصورت نوجوان ہے۔ بیوی نے اسے بتایا تھا کہ اس نے تمام غلط کام چھوڑ کر پڑھائی شروع کر رکھی ہے اور ہر قیمت پر رفعت سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ وہ ٹرکوں کے اڈے سے نکل کر ایک استاد یا افسر بننے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ رفعت کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ ایوب اور رفعت کے بارے میں سوچتے ہوئے اکثر اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ لیکن یہ کام اس کے لیے ناممکن تھا۔ ذات پات برادری اور قبیلے کے یہ تمغے نجانے کب سے وہ لوگ اپنے سینوں پہ سجائے ہوئے تھے جنہیں اتارنا اس کے بس میں نہ تھا۔ وہ تو اس کی بیٹی کی محبت تھی جو اسے گمراہ کر رہی تھی ورنہ اُس نے کبھی اِس ''گناہ'' کا تصور بھی نہ کیا تھا۔

اولاد کی محبت بھی کیسی ظالم چیز ہے صدیوں کی تعمیر کے درو دیوار ہلا دیتی ہے۔ کتنا کچھ توڑ پھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ کبھی گاڑی پر گزرتے سڑک کنارے مزدوروں کو روڑی کوٹتے دیکھا ہے؟ ساری زندگی قدرت آدمی کو روڑی کی طرح کُوٹتی رہتی ہے...... محبت کے ہتھوڑے سے...... بچپن سے بڑھاپے تک......!

''کیا بات ہے آج نیند نہیں آ رہی''؟ بیوی نے شاہ جی کی چارپائی کو روتے سُن کر پوچھا۔

''تم سو رہی ہو کیا''؟ شاہ جی نے ٹارچ کی روشنی میں وقت دیکھا، ۲ بج رہے تھے۔

''کیا کریں لڑکی تو شادی کا نام تک نہیں لینے دیتی' عارفہ نے کہا' آپ کو یاد ہے جب یہ پیدا ہوئی تھی کتنے خوش ہوئے تھے ہم لوگ، سبھی کو افسوس ہو رہا تھا لڑکا کیوں نہیں ہوا لیکن ہماری خوشی کی انتہا نہ تھی''۔

''ہاں یاد ہے''۔ دیر تک شاہ جی کے آنسو اُس کے کانوں میں اُتر اُتر کر سرگوشیاں کرتے رہے۔

''پتہ نہیں کیا لکھا ہے اس کی قسمت میں'' عارفہ نے سکوت توڑا۔

''تو پھر نہ کر دوں کیا؟'' اُس نے بیوی سے پوچھا۔

''میں کیا کہوں شاہ جی، لڑکی کی عمر جا رہی ہے، ہم نہ ہوئے تو اس کا کیا بنے گا''؟ عارفہ نے جواب دیا۔

''تو پھر زہر کا یہ پیالہ پی ہی لو'' وہ ایک گھونٹ پی کر بولا۔

''اِس کی کسی سہیلی کو سمجھانے کے لیے بولوں گی شاید مان جائے''۔

''کوشش کر کے دیکھ لو'' شاہ جی نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

سہیلی اسے منانے آئی اور واپسی پر ایوب کو سارے حالات سے آگاہ کر دیا۔

یہ محض اتفاق تھا یا ایوب کی جاسوسی نظام کا کمال، وہ دینہ کے ایک ہوٹل پر چائے پی رہا تھا کہ چوہدری کی گاڑی آ کر رُکی۔ اس نے چائے ختم کی اور ٹرک لے کر روانہ ہو گیا۔ وہ کافی دیر تک آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ جب اُس نے سائیڈ مرر سے گاڑی کو آتے دیکھا تو ٹرک کی رفتار تیز کر دی لیکن ٹرک اور جیپ کا فاصلہ بتدریج کم ہو رہا تھا۔ جب اُس نے دیکھا کہ جیپ بالکل

نزدیک پہنچ چکی ہے تو اُس نے فوراً بریک پکڑ لی۔اس کے ساتھ بیٹھا ڈرائیور ڈیش بورڈ سے جا ٹکرایا، اس کی بچت ہوگئی لیکن کنڈکٹر کا سر کھُل گیا۔گاڑی ابھی مکمل طور پر رُکی نہیں تھی اس نے گاڑی کو سائیڈ پر لگایا اور کنڈکٹر کی طرف چل پڑا۔جیسے اسے خبر ہی نہ ہو کہ پیچھے کیا بنا ہے۔

جیپ پورے زور کے ساتھ ٹرک سے ٹکرائی، ڈرائیور مشتاق سٹیئرنگ اور سیٹ کے درمیان پھنسا ہوا کراہ رہا تھا۔چوہدری صاحب کو ہوٹل پر کچھ اور لوگ مل گئے اور انہوں نے روک لیا کہ بعد میں اکٹھے چلیں گے۔ ورنہ ان کا سر گاڑی کے شیشے سے جا ٹکراتا اور بابو عزیز کی جگہ وہ بے ہوش پڑے ہوتے۔آتی جاتی گاڑیاں رُک گئیں، زخمیوں کو نکال کر ہسپتال پہنچایا گیا۔تھوڑی ہی دیر میں حادثے کی خبر پورے شہر میں پھیل گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے ہسپتال لوگوں سے بھر گیا۔چوہدری صاحب کو نہ پا کر ہر کوئی قیاس آرائیاں کر رہا تھا۔کوئی کہہ رہا تھا چوہدری صاحب سیریس ہیں اور انتہائی نگہداشت کی وارڈ میں ہیں، کسی کا خیال تھا کہ انہیں پنڈی منتقل کر دیا گیا ہے۔سو جتنے منہ اتنی باتیں۔

ایوب کو اڈّے کے لوگوں اور عزیز و اقارب نے گھیر رکھا تھا۔ہر کوئی سوال پہ سوال کیے جا رہا تھا اور حادثے کی تفصیلات جاننا چاہتا تھا۔ایوب بیس مرتبہ اپنا بیان دہرا چکنے کے بعد اب تنگ آ گیا تھا اور وہاں سے جانا ہی چاہتا تھا کہ پولیس آ گئی۔ایوب ان کے ساتھ جائے حادثہ کو روانہ ہو گیا۔اس کے دوست احباب بھی اس کے پیچھے چل دیے۔پولیس نے حادثہ کی تفصیلات لیں، نقشے بنائے اور چوہدری صاحب کی گاڑی کو کھینچتے ہوئے واپس چل دیے۔

چوہدری صاحب کو میرپور پہنچ کر حادثے کی اطلاع ملی۔بابو عزیز ابھی تک ہوش میں نہیں آیا تھا البتہ مشتاق بات چیت کرنے کے قابل تھا۔لیکن چوہدری کو دیکھ کر وہ بھی رونے لگا۔

''پاگل اس میں رونے کی کیا بات ہے ایکسیڈنٹ تو ہوتے رہتے ہیں' چوہدری نے اسے تسلی دی 'لیکن یہ سب کچھ ہوا کیسے''؟

''چوہدری صاحب میرے آگے آگے ایک ٹرک جا رہا تھا' مشتاق نے آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا' وہ کافی سپیڈ میں تھا جونہی میں اس کے قریب پہنچا اس نے بریک لگا دی میں نے بریک لگائی لیکن فاصلہ کم تھا، گاڑی ٹرک سے جا لگی''۔

''یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے چوہدری صاحب'ایک آدمی اونچی آواز میں بولا' کہ اس نے اچانک بریک لگائی کیوں''؟

''اس ڈرائیور کا کچھ پتہ بھی چلا، کون تھا کدھر گیا''؟ چوہدری صاحب نے پوچھا۔

چوہدری ریشم کا لڑکا ایوب ہے، ادھر ہی تھا ہسپتال میں، پولیس موقعے پر بھی لے گئی تھی''۔ایک آدمی نے جواب دیا۔

''اختر ٹریفک والوں سے پتہ کر کہ رپورٹ منگواؤ''۔چوہدری صاحب پاس کھڑے تھانیدار سے مخاطب ہوئے۔

تھانیدار''ٹھیک ہے سر'' کہہ کر ایک سپاہی کو لے کر باہر نکل گیا۔

اتنے میں خبر آئی کہ بابو عزیز ہوش میں آ گیا ہے۔چوہدری صاحب اسے دیکھنے چلے گئے۔ڈاکٹروں نے زیادہ بات چیت سے منع کر دیا تھا۔بابو کو تسلی دے کر چوہدری صاحب روانہ ہو گئے۔گھر پہنچے تو ضلعی انتظامیہ کے افسران بھی پہنچ گئے۔ٹریفک پولیس کی رپورٹ بھی آ گئی جس میں ڈرائیور مشتاق،ایوب،ایوب کے ڈرائیور اور کنڈکٹر کے بیانات تھے۔مشتاق کا بیان وہی تھا جو اس نے چوہدری صاحب کو دیا۔البتہ باقی تینوں بیانات میں یہ کہا گیا کہ ٹرک کے سامنے ایک بکری آ گئی جسے بچانے کے لیے بریک لگانا پڑی اور نتیجۃً جیپ ٹرک سے آ ٹکرائی۔

''چوہدری صاحب ہمیں شک ہے کہ یہ واقعہ حادثۃً پیش نہیں آیا'ایس پی بولا'اس کے پیچھے کوئی سازش کارفرما ہے، ہم اپنے طور پر تحقیق کریں گے۔بہتر یہ ہے کہ آپ کی طرف سے ایف آئی آر درج ہو جائے۔آپ تو اتفاقاً رک گئے ورنہ لگتا ہے کہ نشانہ آپ ہی تھے''۔

''لیکن ریشم کے لڑکے سے میری کیا دشمنی ہے ایس پی صاحب' چوہدری نے کہا' وہ لوگ تو میرے سپورٹر ہیں''۔

''آپ کی بات درست ہے چوہدری صاحب مگر ایس پی صاحب کے خدشے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔کل کلاں کوئی اور حادثہ بھی ہو سکتا ہے۔اگر یہ واقعتاً حادثہ ہی ہے پھر بھی مکمل چھان بین ہونی چاہیئے''۔ڈی سی۔نے معاملہ کی وضاحت کی۔

''ٹھیک ہے مجھے کوئی اعتراض نہیں' چوہدری صاحب بولے' مگر تفتیش کے لیے ایف

آئی آر ضروری ہے''؟

''چوہدری صاحب حادثے اور ارادۂ قتل کے کیس اور تفتیش میں بہت فرق ہے'' ایس پی نے جواب دیا۔

''لیکن بظاہر تو حادثہ ہی ہے اسے ارادۂ قتل پر کیسے معمور کیا جا سکتا ہے''؟ چوہدری صاحب نے سوال کیا۔

''قتل ارادۃً بھی ہوتا ہے اور حادثۃً بھی لیکن ہوتا قتل ہی ہے''۔ ایس پی نے جواب دیا۔

''مگر ہوا تو نہیں ہے''۔

''اسی لیے ارادۂ قتل کی بات ہو رہی ہے اقدامِ قتل کی نہیں''۔ ایس پی نے وضاحت کی۔

چوہدری صاحب حادثے کی وجہ سے پہلے ہی پریشان تھے اب اور بھی الجھ گئے۔

''ٹھیک آپ اپنا کام جاری رکھیے اور ایف آئی آر کے لیے مجھے تھوڑا سا وقت دیں میں کل تک فیصلہ کر لوں گا''۔ چوہدری نے کہا۔

ضلعی افسران اور ان کا سٹاف چائے پینے کے بعد چلے گئے اور چوہدری صاحب اپنے خاص حلقہ احباب کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

شام تک بات گھر گھر پہنچ چکی تھی۔ کرم داد کی بیوی خبر سننے کے بعد سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

''دیکھ لیا انجام راجہ صاحب' اس نے بولنا شروع کیا' عورتوں کی بات پر دھیان دینا تو آپ لوگ توہین سمجھتے ہیں۔ ریشم کے لڑکے کتنے خطرناک ہیں اس کا اندازہ تو ہو گیا ہے نا۔ مجھے بھیج رہے تھے شاہ جی کا رشتہ مانگنے، بیچ بازار میں اگر آپ کو پکڑ کر ذلیل کرتا تو پھر میری بات کی قدر آتی''۔

کرم داد کچھ دیر خاموش بیٹھا حقہ گڑگڑاتا رہا اور پھر اٹھ کر باہر نکل گیا۔ وہ سیدھا چوہدری کے گھر پہنچا تو وہاں پر ابھی تک کافی لوگ موجود تھے۔ وہ خاموشی سے ایک کونے میں بیٹھ کر لوگوں کے جانے کا انتظار کرنے لگا۔ اسی اثنا میں چوہدری کچھ لوگوں کو الوداع کرنے باہر نکلا تو واپسی پر کرم داد نے اسے روک لیا اور ایوب اور شاہ جی کی لڑکی کے تعلق کے بارے میں بتایا۔

''کرم داد یہ تو انتہا درجے کا خطرناک آدمی ہے' چوہدری کی پریشانی قابل دید تھی' ابھی

تو ہم نے پیغام ہی بھیجا تھا اور اتنے سے قصور پر وہ میری جان لینا چاہتا تھا''؟

''چوہدری صاحب میری بیوی کہہ رہی تھی لیکن میں نے یقین نہ کیا''۔ کرم داد نے کہا۔

وہ کچھ دیر کھڑے باتیں کرتے رہے، پھر کرم داد کل آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔

دوسرے دن سویرے ہی سویرے چوہدری نے آدمی بھیج کر کرم داد کو بلا لیا۔

''میں نے سوچا ناشتہ بھی اکھٹے کر لیں گے اور گپ شپ بھی ہو جائے گی' چوہدری نے کہا' ابھی تک مجھے یقین نہیں آ رہا کہ اتنی بات پر کوئی آدمی کسی کی جان لے سکتا ہے۔ ہمارے درمیان اتنے خطرناک لوگ رہتے ہیں، میں نے کبھی اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ خیر تم بتاؤ اب کیا کرنا چاہیے''۔

''یہ لڑکا ذرا جذباتی ہے اور چوہدری صاحب آپ کو پتہ ہے جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ پھر اگر لڑکی بھی دل و دماغ پر سوار ہو جائے تو آدمی اندھا ہو جاتا ہے' کرم داد نے کہا' اس کا بڑا بھائی بالکل مختلف ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے''۔

''لیکن میں اس سارے واقعے کو ہضم نہیں کر پا رہا کرم داد، تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ میں نے رات کس مشکل میں گزاری ہے'' چوہدری نے جواب دیا۔

''مجھے اندازہ ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس سے ہمیں فائدہ کتنا ہو گا اور نقصان کتنا''؟

''دیکھو کرم داد اگر آج اس واقعے پر میں خاموش رہا تو کل میرے گھر پر بھی حملہ ہو جائے گا'' چوہدری نے کہا۔

کرم داد خاموش چائے پیتا رہا۔ ناشتے کے بعد وہ اٹھ کر آ گیا۔ چوہدری کافی دیر سوچتا رہا اور پھر ایوب کے خلاف کارروائی نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسی پی کو چوہدری کے فیصلے پر مایوسی ہوئی۔ مگر دوسری ہی رات پولیس نے اسے شراب اور چرس سمگل کرنے کے الزام میں پکڑ لیا۔ اچانک گرفتاری پر وہ سخت بوکھلایا اسے غالباً اندازہ نہیں تھا کہ چوہدری اس پر ہاتھ ڈال سکتا ہے۔ پولیس نے اس واقعہ کے چشم دید گواہ بھی تیار کر لیے اور پہلی پیشی پر ایوب کا پندرہ دن کا ریمانڈ لے لیا۔ یہ ایک قابلِ ضمانت کیس تھا لیکن چوہدری کے اثر و رسوخ کے باعث جب دو مہینے تک اس کی ضمانت نہ ہوئی تو اسے پہلی بار خیال آیا کہ شاید اسے یہ کام نہیں کرنا چاہیے تھا۔ لیکن

اس کے ساتھ ساتھ اس کا غصہ بھی بڑھتا جا رہا تھا۔

ایک دن جیل سپرنٹنڈنٹ نے اسے اپنے کمرے میں بلایا، اسے چائے پلائی اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔

''کام کی بات کرو جیلر صاحب''۔ ایوب نے کہا۔

''بھئی تھانیدار کریم بخش تمہاری ضمانت کرانے کے لیے تیار ہے' سپرنٹنڈنٹ نے کہا' لیکن وہ کہتا ہے کہ اس نے ہمارا خرچہ پانی بند کر رکھا ہے''۔

''میں نے تو کبھی زندگی میں پولیس کو خرچہ پانی نہیں دیا''۔ ایوب نے جواب دیا۔

''تم نے تو نہیں دیا لیکن ملنے والی جگہیں ہی تم نے اجاڑ دی ہیں''۔ سپرنٹنڈنٹ نے وضاحت کی۔

''اشارے نہیں دو جیلر صاحب' ایوب نے کہا' میں ذرا موٹے دماغ کا آدمی ہوں''۔

''تم موٹے دماغ کے آدمی ہوتے تو یہاں ہرگز نہ ہوتے''۔ سپرنٹنڈنٹ نے کہا۔

''تو تمہاری جگہ یہ ہوتا کیا''؟

''چلو کام کی بات کرو''۔ سپرنٹنڈنٹ نے کہا۔

''میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں''۔

''بھئی تمہارے اڈّے کے پاس کوئی بیٹھک ہے جو تم نے بند کر رکھی ہے''۔ بالآخر سپرنٹنڈنٹ نے صاف بات کہہ دی۔

''تم اپنی تھوک چاٹ سکتے ہو جیلر صاحب''؟

سپرنٹنڈنٹ کو کمرہ گھومتا ہوا نظر آیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی بات کرتا ایوب اٹھ کر آ گیا۔



آزاداوراس کے ساتھیوں پر پولیس تشدد کی اطلاع جب کالج میں پہنچی تو طلبہ نے کلاسز کا بائیکاٹ کرلیا اور ایک جلوس کی شکل میں نعرے لگاتے ہوئے شہر کی طرف روانہ ہو گئے۔ جلوس کے شرکا حکومت کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ جلوس نے پورے شہر کا چکر لگایا اور پھر شہید چوک میں جلسے کی شکل اختیار کرلی۔ ایک نوجوان انتہائی جذباتی تقریر کررہا تھا۔

''ہم اقتدار کے پجاریوں، بھکاریوں اور وظیفہ خوروں کے اوچھے ہتھکنڈوں سے ہر گز ڈرنے والے نہیں ہیں۔ وطن کے اس نیم آزاد خطے کو آزاد کشمیر اور آزادی کا بیس کیمپ کہنے والے یہاں سے آزادی کی خاطر اٹھنے والی ہر آواز دبانا چاہتے ہیں۔ لیکن آزادی کی آواز کو ریاستی دہشت گردی اور جبر سے خاموش نہیں کیا جاسکتا۔ یہ حکمران ہمارے لیڈر نہیں اس دھرتی کے دلال ہیں۔ انہوں بھٹو کو شملہ معاہدہ کے لیے گرین سگنل دیا۔ منافقین کے اس کردار نے ہر دور میں قوم کو دھوکا دیا ہے۔ یہ مذہب کا، سیاست کا اور رواداری کا لباس اوڑھ کر اپنی نوکری کو بچانے کی فکر اور کوشش میں ہر در پر سجدہ کرنے والے ہماری سیاست کے وہ مشرک ہیں جنہیں انجام تک پہنچائے بغیر وطن کی آزادی ممکن نہیں۔ یہ وطن فروش طبقہ اپنے مفادات کی خاطر کشمیر کا سودا کیے بیٹھا ہے۔ اور انہوں نے اپنے آقاؤں سے یہ عہد کررکھا ہے کہ وہ آزادی کی خاطر اٹھنے والی ہر آواز کو کچل دیں گے۔ ہم انہیں یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ ہم اس مٹی کی آواز ہیں......، ہم اس غلام اور مظلوم قوم کی آواز ہیں......، ہم اس دھرتی کے غصب کیے گئے حقوق کی آواز ہیں......، ہم آزادی کی آواز ہیں......، ہم انقلاب کی آواز ہیں۔ یہ آواز کسی فردواحد کی، کسی گروہ کی، کسی جماعت کی، کسی قبیلے کی نہیں ہے۔ یہ وقت کی آواز ہے، یہ آج کے سماج کی آواز ہے، یہ بدلتے زمانے کی آواز ہے، یہ وطن کے جوانوں کی، بوڑھوں کی، عورتوں، مردوں کی، بچے بچے کی آواز ہے......

بچہ بچہ کٹ مرے گا	کشمیر صوبہ نہیں بنے گا
ہے حق ہمارا	آزادی
ہم چھین کہ لیں گے	آزادی
اِس پار بھی لیں گے	آزادی
اُس پار بھی لیں گے	آزادی

سُن لو......!

تمیں اس آواز کو دبانے کے لیے خون کی ندیاں بہانا پڑیں گی۔ ہم اور تم تاریخ کے دو کردار ہیں۔ تم بھی زندہ رہو گے، تاریخ کے کٹہرے میں اپنی تمام تر منافقت، جھوٹ اور فریب کے ساتھ...... وطن فروشی کا کلنک اپنے ماتھے پہ سجائے، اقتدار اور ہوس کے طوق گلے میں لٹکائے......تم بھی حاضر ہو گے اور ہم بھی ہوں گے۔ وقت تمہارے خلاف فیصلہ دے چکا ہے۔ تم اگر سو سال بھی جی لو اور اقتدار کے اس سنگھاسن کے ساتھ چمٹے رہو، ذلت اور رسوائی سے نہ بچ پاؤ گے۔ وہ وقت دور نہیں جب اس دیش کا بچہ بچہ وطن فروشوں کے نام سے نفرت کرے گا۔ تم جتنا ہمیں دباؤ گے اتنا ہم ابھریں گے، تم جتنا ظُلم روا رکھ سکتے ہو رکھو ہمیں کمزور نہ پاؤ گے۔ ہم تمہیں بتا دینا چاہتے ہیں کہ اقتدار کے نشے میں بدمست ہاتھیو، ہوش کے ناخن لو تم اور اپنی اس روش سے باز آجاؤ۔ ہم پرامن سیاسی جدوجہد پر یقین رکھتے ہیں لیکن یاد رکھو ہم لاٹھی کا جواب لاٹھی سے اور گولی کا جواب گولی سے دینا جانتے ہیں......"

پولیس نے شرکا جلسہ کو منتشر کرنے کے لیے آنسو گیس کا استعمال شروع کر دیا جس کی وجہ سے پرامن احتجاج کرنے والے طلبہ نے پولیس پر پتھراؤ شروع کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے شہر نے میدانِ جنگ کی شکل اختیار کر لی۔ پولیس اور مظاہرین کے درمیان پتھراؤ، آنسو گیس اور ہوائی فائرنگ کا سلسلہ دو گھنٹے سے زائد عرصہ تک چلتا رہا۔ بالآخر پولیس کو پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ اس واقعہ کے بعد شہری بھی مشتعل ہو گئے اور دوسرے دن سے مسلسل احتجاج شروع ہو گیا۔ جو کئی روز تک جاری رہا۔ تین دن کے بعد یہ احتجاج پورے آزاد کشمیر میں پھیل گیا۔ راولاکوٹ، کوٹلی اور مظفر آباد میں بھی پرتشدد مظاہرے شروع ہو گئے اور دن بدن ان میں شدت آتی گئی۔ حتیٰ کہ ایک

ہفتہ گزر گیا اور جب حالات کنٹرول سے باہر ہو گئے اور عوام کی جانب سے دباؤ بڑھ گیا تو حکومت طلبہ کے ساتھ مذاکرات پر تیار ہوئی اور فریقین کے درمیان ایک سمجھوتہ طے پا گیا۔ جس کے نتیجے میں تمام گرفتار طلبہ کو غیر مشروط رہا کر دیا گیا اور حکومت نے طلبہ پر قائم کیے گئے مقدمات واپس لیے۔

کنونشن کے تمام تر معاملات آزاد اور اس کے دوست دیکھ رہے تھے۔ اس کے زخمی ہو جانے کے بعد تنظیم کا اجلاس ہوا جس میں ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جسے کنونشن کرانے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ گرفتاریوں، ہڑتالوں اور جلسوں نے تمام سوئے ہوئے کارکنوں کو جگا دیا اور وہ سب ایک نئے جوش وخروش سے کنونشن کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔

مولوی نصیر آزاد کا کلاس فیلو تھا، آٹھویں پاس کرنے کے بعد باپ نے اسے لاہور کے ایک مدرسے میں داخل کروالیا تھا جہاں وہ درسِ نظامی کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد چند ماہ پہلے واپس آیا تھا۔ وہ آزاد کا محلے دار بھی تھا اس لیے اُس کے ساتھ ملتا جلتا رہا اور اُن کا بچپن کا تعلق بھی وقت کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتا رہا۔ جب بھی وہ چھٹیوں میں گھر آتا اکثر وقت آزاد کے ساتھ گزارتا۔ بڑے ہونے کے باوجود جب وہ آپس میں ملتے تو بچپن کی شرارتوں کو خوب دہراتے۔ آزاد کی امی جب بھی انہیں گھر پر اکیلا چھوڑ کر کہیں جاتی، وہ ضرور بہ ضرور کوئی نہ کوئی کام کر دکھاتے۔ محلے کے گھروں کو باہر سے کنڈی لگا دینا ان کے نزدیک ہرگز شرارت کے زُمرے میں نہ آتا تھا۔

نصیر کو مدرسے میں اپنی باری پر جھاڑو لگانے، حمام صاف کرنے، آٹا گوندھنے، سے لے کر سالن بنانے تک سارے کام کرنا پڑتے تھے۔ اس لیے کبھی انڈے، کبھی حلوہ، کبھی پراٹھے غرضیکہ انہیں جس چیز کا دل کرتا پکا کر کھا لیتے۔ ایک دن آزاد کی امی اپنی بہن کو ملنے گاؤں گئی تو انہوں نے پڑوس والوں کا مرغا ذبح کر ڈالا۔ چند اور دوستوں کو بھی مدعو کیا اور اور خوب مزے اڑائے۔ شام ہوتے ہی جب گھر والوں نے مرغے کی تلاش شروع کی تو دونوں نے ان کا بھرپور ساتھ دیا۔

پچھلے ایک ہفتے سے مولوی نصیر آزاد کے پاس سے دور نہیں گیا تھا۔ یہ رات کا پچھلا پہر تھا اور نصیر لکڑی کے بنچ پر اونگھ رہا تھا کہ اسے آزاد کی آواز سنائی دی۔ آنکھ کھلنے پر اس نے دیکھا کہ آزاد اٹھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ فوری طور پر اٹھا اور اس نے آزاد کو لٹا دیا۔ وہ مکمل طور پر ہوش میں نہیں تھا، پھٹی پھٹی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا لیکن کوئی بات چیت نہ کی۔ نصیر بنچ گھسیٹ کر اس کے بالکل نزدیک بیٹھ گیا اور اس کی حرکات کا جائزہ لینے لگا۔ اس بات پر اسے حد درجہ اطمینان ہوا کہ اس کے سارے اعضا حرکت کر رہے تھے۔ اس نے آزاد کو پہلو بدلنے میں مدد کی اور ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے دو ننھے منے آنسوؤں نے باہر جھانک کر اللہ کا شکر ادا کیا۔ اس نے آزاد کو آواز دی مگر اسے جواب نہ ملا۔ البتہ آزاد نے اسے مڑ کر دیکھا ضرور تھا۔ صبح کی نماز کے بعد جب آزاد کی امی اور ماموں آئے تو انہیں دیکھ کر وہ کوشش کے باوجود اپنے آنسو نہ روک سکا۔

''آزاد ہوش میں آ گیا ہے''۔ اس نے بڑی مشکل سے بات کی۔

''یا اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے''۔ اس کی ماں بھی رونے لگی۔

تین دن مکمل بے حس و حرکت رہنے کے بعد آزاد اب ہوش میں آ رہا تھا۔ شام تک وہ بات چیت کرنے کے قابل ہو گیا تھا لیکن ڈاکٹر نے اسے زیادہ بولنے سے منع کر دیا تھا۔ وہ ایک ہفتہ ہسپتال میں رہا اس دوران اس کے دوستوں کا تانتا بندھا رہا۔ ہفتے بعد وہ گھر آ گیا اور اس کے آتے ہی گھر کی رونقیں بحال ہو گئیں۔ اس کی امی نے سب سے پہلے دو بکرے لے کر کھڑی شریف بھیجے، میٹھے چاول بنا کر پاس پڑوس میں بانٹے اور مسجد کے مولوی صاحب کے لیے دیسی مرغا ذبح کروایا۔ چار چھ دن کثرت سے مہمانوں کا آنا جانا رہا۔

آزاد کی بیٹھک میں اس کے دوستوں کی محفلیں پھر سے جمنے لگیں۔ آزاد کو البتہ آرام کی ضرورت تھی اس لیے اس کا بستر دوسرے کمرے میں لگایا گیا تھا۔ جو کوئی آتا تھوڑی دیر اس سے مل کر بیٹھک میں چلا جاتا۔ جو چین انہیں یہاں ملتا تھا کہیں اور نہ تھا۔ آزاد کی یہ بیٹھک ان کا دفتر تھا جو ۲۴ گھنٹے کھلا رہتا تھا۔ کسی پر اگر اپنے گھر کا دروازہ رات گئے بند ہو جاتا تو وہ بھی یہیں آ کر پڑا رہتا۔ اور کیوں نہ پڑا رہتا، آزاد کی امی جو تھی ان کے کھانے پینے کا بندوبست کرنے کے لیے۔ کسی

کو زیادہ دن گزر جاتے تو اسے باقاعدہ جیب خرچ بھی ملتا۔ یہی وجہ تھی کہ بنا بتائے گھر سے غائب ہو جانے والوں کی رپورٹ درج کرانے سے پہلے گھر والے بیٹھک میں ضرور جھانک لیتے اور اکثر اوقات انہیں رپورٹ کرنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ آزاد کی امی کو ان سے فقط ایک ہی شکائت تھی کہ وہ سگریٹ بہت پیتے تھے۔ وہ کبھی کبھار انہیں کچھ ضروری چیز لانے کے لیے بازار بھی بھیج دیتی اور باقی پیسے واپس نہ لیتی۔ ان تمام لڑکوں سے اسے اُنس ہو گیا تھا۔ ان کے رات رات جاگتے رہنے سے وہ تنگ بھی ہو جاتی مگر کبھی نہ آتے تو بے چین ہو جاتی۔ وہ سب کو جانتی تھی کوئی نیا لڑکا بھرتی ہوتا تو اس کی جان اس وقت تک نہ چھوٹتی جب تک سات پیڑھیوں تک شجرہ سنا نہ لیتا۔ اسے یہ بھی پتہ ہوتا تھا کون کس جماعت میں پڑھتا ہے اور تنظیم میں کیا ذمہ داری لیے ہوئے ہے۔

سیاست میں زیادہ دلچسپی لینے اور پڑھائی میں توجہ نہ دینے پر وہ ان کی سرزنش بھی کرتی اور ناراض ہو جاتی۔ لیکن دل ہی دل میں وہ ان سے خوش تھی۔ وہ چھپ چھپ کر ان کی باتیں سنتی رہتی۔ جوں جوں وہ ان کی باتیں سنتی گئی حیران ہوتی گئی۔

''یہ تو بڑی شوخ عمر ہے اس میں لڑکوں کو کھیل کود، دوستیوں، ناراضگیوں، شکوے، شکائتوں کی دنیا سے باہر جھانکنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ یہ تو دوسرے ستارے کی مخلوق لگتے ہیں کبھی اس طرف ان کا دھیان نہیں جاتا۔ لڑکی پر بات کرتے ہیں تو معاشرے میں اس کی حیثیت، کردار، احساسِ کمتری، گھٹن اور زیادتیوں پر گھنٹوں بحث کرتے ہیں۔ عورت کے بارے میں مختلف نظریات کو زیرِ بحث لاتے ہیں، جس میں ہر کوئی اپنی سمجھ کے مطابق حصہ لیتا ہے۔ وطن کی آزادی، اس کی خوشحالی کی بات کرتے ہیں۔ غریب لوگوں کے حقوق کی بات کرتے ہیں''۔

یہ باتیں سوچ سوچ کر وہ حیران بھی ہوتی تھی اور خوش بھی۔ بیٹھک میں بے شمار کتابیں بکھری پڑی رہتی تھیں۔ کبھی کبھار وہ ایک آدھ کتاب اٹھا کر دیکھ بھی لیتی لیکن پڑھنے کی فرصت نہ ملتی۔ اس کا بہت دل کرتا تھا کہ وہ ان کی مجلس میں بیٹھ کر ان کی گفتگو سنے، اس نے دو ایک بار ایسا کیا بھی لیکن محسوس کیا کہ وہ کھل کر بات نہیں کر پا رہے۔ اس لیے وہ زیادہ دیر ان کے درمیان

حائل نہ رہتی ۔البتہ وہ کام کاج سے وقت نکال کر بیٹھک کی ایک چھوٹی کھڑکی جو ساتھ والے کمرے میں کھلتی تھی کے ساتھ کان لگا کر بیٹھ جاتی اوران کی باتیں سنتی ۔لیکن اسے زیادہ فرصت نہ ملتی ۔کبھی کبھار ایک عجیب خیال اس کے ذہن میں انگڑائی لیتا۔

''اگر میں بھی ایک لڑکا ہوتی اوران کے درمیان ہوتی تو کیسا ہوتا''۔لیکن دوسرے ہی لمحے وہ اپنے اوپر ہنس کر اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیتی ۔بعض اوقات اسے کچھ باتوں کی بالکل سمجھ نہ آتی اور وہ خود سے الجھ جاتی ۔

''کتنی نالائق ہوں بچوں کی باتیں بھی نہیں سمجھ سکتی''۔

مولوی نصیر اس بیٹھک کا ایک مرکزی اور دلچسپ کردار تھا۔آزاد تو اسے اپنے سر پہ بٹھاتا تھا لیکن باقی لڑکوں سے اس کی نہیں بنتی تھی سوائے دو ایک کے۔لڑکے اسے تنگ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے ،اس کا خوب مذاق اڑاتے ۔ایک سوکھا سڑا سا مسکین صورت آدمی ،اسے دیکھ کر ہر کوئی قسم کھا سکتا تھا کہ یہ مولوی نہیں ہے۔ بولتا بھی بہت کم تھا لیکن جب بولتا تھا تو کفن پھاڑ کہ بولتا تھا۔

''آزاد تمہاری تو سمجھ نہیں آتی یار، یہ مولوی کی فوٹو کاپی ہر وقت تمہارے ساتھ چپکی رہتی ہے اور تم اس سے جان چھڑانے کو راضی بھی نہیں ہوتے۔ پتہ نہیں پولیس کا مخبر ہے یا کسی ایجنسی کے لیے کام کرتا ہے۔یا تو اس کی چھٹی کر دو یا پھر ہماری ،اکٹھے نہیں چل سکتے''۔

زرین نے اسے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

آزاد نے چائے کا گھونٹ بھرا اور سائڈ ٹیبل سے ایک کتاب اٹھا کر اسکی طرف بڑھاتے ہوئے کہا

''یہ کتاب دیکھی ہے تم نے''؟

زرین کتاب کی بجائے اس کے چہرے کو دیکھتا رہ گیا۔

''یار تم بات کو سیریس کیوں نہیں لیتے''؟ زرین نے کہا۔

''نان سیریس بات کو کیسے سیریس لے لوں یار ،تمہارے پاس اپنے الزام کا اگر کوئی ثبوت ،کوئی دلیل ہے تو لاؤ مجھے اعتراض نہیں ہوگا۔لیکن ایک بے سر و پا الزام کو میں کس بنیاد پر سچ مان لوں''؟ آزاد کسی قدر خفا ہوا۔

"ٹھیک ہے میں مانتا ہوں کہ ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے لیکن یہ بات خارج از امکان تو نہیں ہے"۔ زرین نے جواب دیا۔

"تو تمہارا مطلب یہ ہے کہ صرف اس خدشے کی بنیاد پر میں اسے گھر سے نکال دوں"؟ آزاد نے کہا۔

"گھر سے نکلنے کو اسے کون کہہ رہا ہے بھئی ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہماری موجودگی میں وہ یہاں نہ آیا کرے بس"۔ زرین نے وضاحت کی۔

"مجھے ایک بات تو بتاؤ یار کہ تم کون سے پولٹ بیورو کے ممبر ہو کہ تمہارے پیچھے سی آئی اے لگی ہوئی ہے جو اس مولوی کے ذریعے تمہارے انڈر گراؤنڈ ٹھکانے تک پہنچنا چاہتی ہے؟ اور فرض کرو یہ پولیس کا مخبر ہی ہے تو ہم کون سا یہاں جوا کھیل رہے ہیں یا حکومت کا تختہ الٹنے کی پلاننگ کر رہے ہیں جس کا بلیو پرنٹ یہ چرا لے جائے گا۔ ہماری مثال تو اس گراس ہوپر کی ہے جو دن بھر گھاس میں ٹانگ پھنسائے بیٹھا رہا اور جب شام کو نجات ملی اور گھر پہنچنے پر ماں نے پوچھا کہ کدھر تھے تو کہا کہ ماں زمین آسمان تول رہا تھا"۔

زرین ناراض ہو کر اٹھ گیا مگر آزاد نے اسے پکڑ کر بٹھا لیا اور بولا۔

"دیکھو بھئی وہ میرا بچپن کا دوست ہے اور میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں اور اس بات کی ضمانت دیتا ہوں کہ نہ تو وہ کسی کا مخبر ہے نہ اس کی طرف سے تمہیں کبھی کسی قسم کا نقصان ہو گا۔ میں یہ ضمانت اپنے خون سے لکھ کر دینے کے لیے تیار ہوں۔ اب بتاؤ کہ تم میں سے کون میری ضمانت دینے کو تیار ہے"؟ آزاد نے کہا۔

سب ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

"اتنا اعتماد تو کرنا ہی پڑتا ہے آزاد"۔ افتخار نے کہا۔

"تو بس ٹھیک ہے، مجھے اس پر مکمل اعتماد ہے تم مطمئن رہو۔ ویسے ابھی وہ تمہارے درمیان اجنبی ہے اس لیے تمہیں اچھا نہیں لگتا۔ اور کوئی بات نہیں ہے"۔ آزاد نے معاملہ کو سمیٹ لیا۔

"مولوی کبھی کبھار تم یہ ٹوپی اتار بھی لیا کرو بھئی سر کو ہوا لگنے دو، ہوا اور روشنی کا راستہ

روک رکھا ہے تم لوگوں نے۔گل سڑ جاؤ گے پھلوں کی طرح''۔زرین نے نصیر کو کہا۔

نصیر نے آزاد کی طرف دیکھا،ٹوپی اتار کر گھٹنے پر رکھی اور کہا

''زرین صاحب ہمارے ایک استاد کہا کرتے تھے کہ خالی گھڑا زیادہ آواز دیتا ہے۔ میں نے تجربے کے طور پر خالی گھڑے کو بجا کر دیکھا اور مطمئن ہو گیا۔لیکن اب پتہ چلا ہے کہ اُسے بجانے کی ضرورت نہیں ہوتی''۔

وہ سب ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔زرین اسے قہر آلود نظروں سے گھور رہا تھا۔آزاد نے زیرِلب مسکرا کر سگریٹ سُلگایا اور پیکٹ زرین کی طرف اچھال دیا۔

''چائے کا موڈ ہے آزاد''؟نصیر نے پوچھا۔

''پی لیں گے یار چائے کا موڈ تو کبھی آف ہوتا ہی نہیں ہے''۔آزاد نے جواب دیا۔

نصیر چائے بنانے گیا تو سارے لڑکے زرین پر کھل کر ہنسے۔

''یہ تو شیطان کا دماغ رکھتا ہے بھئی''۔زرین بولا۔

''تمھیں کس حکیم نے اسے چھیڑنے کا مشورہ دیا تھا''؟آصف نے کہا۔

''تم سب ہی اسے چھیڑتے رہتے تھے یار'زرین نے جواب دیا'ہاں ہوں کر لیتا تھا، جواب تو کبھی اس سے بن ہی نہیں پایا''۔

''بھئی منہ دیکھ کہ تھپڑ مارا جاتا ہے نا' آصف نے جلتی پر تیل ڈالا'جتنا خوبصورت منہ ہو گا تھپڑا اتنا ہی نازک ہو گا''۔

پورا کمرہ قہقہوں سے گونج اٹھا۔

ایک ماہ بعد آزاد کافی بہتر ہو گیا تھا۔اس لیے گھر والوں نے منگنی کا پروگرام پھر سے تشکیل دے دیا۔آزاد کے والد اگر زندہ ہوتے تو یہ تقریب اتنی سادگی سے نہ ہوتی۔دونوں خاندان اور ان کے قریبی رشتہ دار اور پڑوسی جمع ہوئے،لڑکی کو انگوٹھی پہنائی گئی،بچوں نے کچھ پٹاخے وغیرہ چھوڑے،تحفے تحائف کا تبادلہ ہوا اور نکاح کے بعد کھانے پر تقریب ختم ہو گئی۔چوہدری اسلم کا خیال تھا کہ آزاد اپنی مزید پڑھائی وہیں جا کر کرے مگر آزاد اس کے لیے راضی نہ ہوا۔چوہدری اسلم اس کی بیوی اور حتیٰ کہ شہناز بھی ذہنی طور پر اس کے لیے تیار نہ تھی لیکن

وہ آزاد کو زیادہ مجبور نہ کر سکے۔ بلکہ اس نے ماموں کو کہا کہ وہ شہناز کو بھی گریجوایشن کے بعد ادھر بھیج دیں، اگر وہ مزید پڑھنا چاہے تو پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ لے لے۔

''آزاد ساری دنیا سے لوگ پڑھنے کے لیے وہاں جاتے ہیں جبکہ تم یہ موقع ضائع کر رہے ہو۔ شہناز کے بارے میں تو میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا اس کی مرضی ہے جہاں پڑھے۔ لیکن میں تو یہی چاہتا ہوں کہ تم لوگ اپنا مستقبل وہیں پر بناؤ''۔ چوہدری اسلم نے اسے کہا۔

''آپ کی بات ٹھیک ہے ماموں لیکن میرے وہاں نہ جانے کی دو وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ میں اماں کو اکیلے چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ میرے نزدیک اپنا مستقبل ہی سب کچھ نہیں ہوتا، ملک اور قوم کے مستقبل کے لیے بھی کچھ نہ کچھ کرتے رہنا چاہیے''۔ آزاد نے جواب دیا۔

''جہاں تک تمہاری امی کی بات ہے تو اسے اور بچوں کو بھی تم بلا سکتے ہو'' چوہدری اسلم نے کہا' رہی بات ملک وقوم کے مستقبل کی تو یہ مت سوچو کہ مادیت کے اس دور میں تم یہاں رہ کر کچھ کر پاؤ گے۔ اسٹوڈنٹ لائف اور پریکٹیکل لائف میں بہت فرق ہے۔ بعض اوقات اپنا آپ چلانا مشکل ہو جاتا ہے۔ بہتر ہوتا کہ تم وہاں چلے چلتے، قانون کی تعلیم حاصل کرتے اور چار پیسے جمع کرنے کے بعد واپس آ جاتے۔ تمہارے پاس اچھی تعلیم بھی ہوتی اور وکالت کا تجربہ بھی جو تمہیں یہاں پر کام آتا''۔

''ایل ایل بی کرنے کے بعد بھی تو اس پر سوچا جا سکتا ہے''۔ آزاد نے جواب دیا

''بالکل سوچا جا سکتا ہے''۔ اسلم نے کہا۔

چوہدری اسلم دراصل بڑی وضع دار طبیعت کا مالک انسان تھا۔ وہ اپنی رائے کو ٹھونسنا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس نے بہن سے کہا کہ وہ ایک مرتبہ آزاد سے بات کر کہ دیکھ لے اس میں اسی کی بہتری ہے۔ اور اگر نہیں مانتا تو کوئی حرج نہیں۔ اگر یہاں ایڈجسٹ نہ ہو سکا تو ادھر جانے میں کوئی رکاوٹ تو نہیں ہے کبھی بھی جا سکتا ہے۔ البتہ اسے شہناز کی فکر لگی تھی کہ خدا خبر وہ یہاں سیٹل ہونے کے لیے تیار ہو گی یا نہیں۔ شہناز ابھی تک اس صورتحال کے لیے تیار نہیں تھی اور نہ ہی فی الفور کوئی فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں تھی۔ آزاد کی امی نے بھی اس سے بات کی لیکن وہ تیار نہ ہوا۔

سینکڑوں میل تک وادیوں، سبزہ زاروں سے ملتا ملاتا، آبشاروں میں گنگناتا، چٹانوں سے سر ٹکراتا جہلم، نیلم اور پونچھ ندیوں کا پانی، سفر کا مارا، تھکا ہارا جھیل کی آغوش میں پہنچتے ہی جیسے سو گیا تھا۔ شام اپنے عروج پہ تھی۔ جلتے سورج کی مانند پڑتی کرنیں منگلا جھیل کو آج کے آخری بوسے دے رہی تھیں۔ ہوا کے دوش پہ جھیل محوِ رقصاں تھی اور اس کا سنہری چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔ کبھی کبھی کوئی مچھلی اُچھل کر سطحِ آب پہ آتی تو اُس کے خیالوں میں ہلچل پیدا ہو جاتی۔ یا پھر کسی شکاری کے کانٹے میں پھنسی، تڑپتی مچھلی کو دیکھ کر اُس کی خوشی غم کی چادر اوڑھ لیتی، اس کا سکون غارت ہو جاتا اور پھر وہ رات بھر ماتم کناں رہتی۔ پرندے غول در غول گھروں کو اڑے جا رہے تھے۔ ایک تنہا بگلہ ایک ٹانگ پہ کھڑا شاید سو گیا تھا۔ دُور کنارے پہ دو مرغابیاں اپنی تیسری ساتھی کے شکار ہو جانے پر رو رہی تھیں۔ آسمان کی پیشانی شفق رنگ ہو رہی تھی اور وہ جھک جھک کر منگلا جھیل میں اپنا عکس دیکھ رہا تھا۔ وہ پورا دن شام کے انتظار میں رہتا اور شام پڑتے ہی اپنے سارے کام کاج چھوڑ کر بیٹھ جاتا۔ پھر رات ہونے تک ایک پل کو بھی جھیل سے نظریں نہ ہٹاتا۔ کبھی کبھار اس کی نظر اونچے اڑتے ہوئے پرندوں پر پڑتی تو اُسے ان کی اس لامتناعی آزادی پر بہت خوشی ہوتی۔

شاید یہ اسی رُوح پرور منظر کا اثر تھا کہ وہ بہت دیر تک باوجود چاہنے کہ کوئی بات نہ کر سکے۔

''کیا سوچ رہے ہو''؟ شہناز نے بالآخر خاموشی کو توڑا۔

''سوچتا ہوں کبھی ہم بھی آزاد ہوں گے، ان پرندوں کی طرح''! آزاد نے جواب دیا۔

''آزادی بہت بڑی نعمت ہے۔ آزاد قوموں کے درمیان رہ کر اپنی محرومیوں کا بہت بری طرح احساس ہوتا ہے۔ اپنے وطن، اپنی پہچان اور شناخت سے محروم لوگوں کے دکھ کوئی نہیں جان سکتا۔ دنیا ہمارے لیے یتیم خانہ ہے، جتنے زیادہ مہذب معاشرے میں چلے جاؤ اپنی یتیمی کا احساس اسی قدر بڑھ جاتا ہے''۔ شہناز نے کہا۔

وہ پھر خاموش ہو گئے۔

''شاید تمہارے لیے انگلینڈ سے واپس آنا اور یہاں سیٹل ہونا خاصا مشکل ہو لیکن اماں بہت اکیلی ہے شہناز...... اور میں اسے مزید تنہا نہیں کرنا چاہتا''۔ آزاد نے کہا

''اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو میں بھی وہی کرتی جو تم کرر ہے ہو'۔شہناز کی آنکھیں افق پہ اڑتے پرندوں کا پیچھا کر رہی تھیں ۔'ہماری ترجیحات مختلف ہوسکتی ہیں ،سوچ میں فرق ہوسکتا ہے لیکن ہمارا خمیر تو ایک ہی ہے۔انسان اپنی مٹی سے جتنا بھی دور ہو وہ اس سے دور نہیں ہوسکتا، الگ نہیں ہوسکتا۔دیار کے درخت جتنے اونچے ہوتے ہیں ان کی جڑیں اتنی گہری ہوتی ہیں''۔

آزاد کے دل کے سارے دروازے شہناز کے لیے چوپٹ کھل گئے۔اُسے اب اُس سے کوئی خوف نہ رہا۔خدشات کے کانٹوں کی جگہ تسکین کی کلیاں کِھل اٹھی تھیں ۔اس کی آنکھیں بے اختیار آسمان کی طرف اٹھ گئیں ۔قدرت اتنی مہربان ہوسکتی ہے،اسے یقین نہیں آرہا تھا۔

آزاد کو اپنے داخلے کے سلسلہ میں لاہور جانا تھا۔امی سے بات کی تو انہوں نے کہا:

''شہناز کو بھی ساتھ کیوں نہیں لے جاتے ،کہیں بھی نہیں گئی ہے وہ''۔

''مگر اماں ابھی تو ہماری شادی بھی نہیں ہوئی''۔آزاد نے جواب دیا۔

''شادی کوئی شرط تو نہیں ہے'امی نے کہا' نکاح ہونا تھا سو ہو گیا''۔

''مگر پھر بھی اماں......''

''اس میں شرمانے والی کیا بات ہے'امی نے کہا' میاں بیوی ہو جدھر مرضی جاؤ۔تم تیاری کرو میں بھائی جی سے بات کرلوں گی''۔

دو دن بعد وہ دونوں لاہور روانہ ہو گئے۔وہ سب سے پہلے کالج میں گیا، میرٹ لسٹ لگ چکی تھی اور اس کا نام لسٹ میں شامل تھا۔وہ چار دن لاہور میں رکے۔اس دوران وہ اپنے دوستوں کو ملنے یونیورسٹی بھی گیا۔

نیو کیمپس میں اکنامکس ڈیپارٹمنٹ کے لان میں بیٹھے ہوئے لڑکوں میں سے ایک بولا۔

''نثار دیکھو بھئی وہ سامنے سے کون جارہا ہے''؟

''لڑکی کی بات کرر ہے ہو''؟ نثار نے پوچھا۔

''دُر پھِٹے منہ،کبھی لڑکی سے ہٹ کہ بھی کچھ سوچ لیا کرو''۔جاوید نے کہا

''عجیب نامعقول آدمی ہو یار، سامنے دیکھنے کے لیے بولا ہے اور سامنے لڑکی ہی تو ہے''۔نثار نے جواب دیا۔

''لڑکا تمہیں نظر ہی نہیں آ رہا''۔
''ٹھیک ہے بھئی لڑکے کو بھی دیکھ لیتے ہیں، کیا ہے اس کو''؟ نثار نے پوچھا
''غور سے دیکھو یار مجھے تو یہ آزاد لگتا ہے''۔ جاوید نے کہا۔
''کون سا آزاد''؟ نثار نے پوچھا
''اپنا میر پور والا آزاد''۔
''ہیں' نثار نے حیرت سے جاوید کو دیکھا۔
''بھئی مجھے نہیں اس کو دیکھو' جاوید چڑ کر بولا' اور اپنا چشمہ ذرا دکھاؤ''۔
''کیوں''؟
''صاف کر کہ دوں تجھے، کس اندھے سے پالا پڑ گیا ہے''۔ جاوید بولا
''لیکن لڑکی کہاں سے آ گئی اس کے ساتھ''؟ نثار نے اپنا چشمہ اتار کہ شرٹ سے صاف کیا اور پھر غور سے دیکھنے لگا۔
دونوں ان کو دیکھتے رہے بالآخر نثار نے اعلان کیا'' بھئی یہ تو وہی لگتا ہے''۔
''لگتا نہیں ہے، وہی ہے، سو فیصد وہی''۔ جاوید نے پورے یقین سے کہا۔
''لیکن یہ کر کیا رہا ہے یہاں پر''؟
''لڑکی کے ساتھ گھوم رہا ہے' جاوید نے جل کر کہا' سیر سپاٹے کر رہا ہے''۔
اتنے میں وہ آگے نکل گئے۔ جاوید اٹھ کر ان کے پیچھے چلنا شروع ہو گیا۔
''کدھر جا رہے ہو''؟ نثار نے پوچھا۔
''تمہارا کیا مطلب ہے چھوڑ دیں اس کو ایسے ہی''؟
نثار بھی اس کے پیچھے ہو لیا۔
''جب بھی ادھر آتا تھا ہمیں یہی کہتا تھا تمہیں ملنے آیا ہوں، اور کون ہے میرا یہاں پہ۔ اب سمجھ آئی۔ دیکھو اس کے لچھن''۔ نثار نے کہا
''سارے لوگ ہماری طرح الو نہیں ہوتے''۔ جاوید نے کہا
''مگر ایک بات ہے''۔ نثار بولا

''وہ کیا''۔

''یہ لڑکی یونیورسٹی کی نہیں لگتی''۔نثار نے کہا۔

''وہ کیسے''؟

''پہلی بات تو یہ ہے کہ دیکھی نہیں ہے کبھی اور دوسری وجہ یہ ہے کہ نہ تو اس کے ہاتھ میں نوٹ بک ہے نہ اس کی چال یونیورسٹی کی لڑکیوں جیسی ہے''۔نثار نے وجہ تسمیہ بیان کی۔

''پوری یونیورسٹی کی لڑکیوں کو دیکھ رکھا ہے کیا''؟ جاوید نے پوچھا

''لڑکیوں کو دیکھا نہیں جاتا بیوقوف' نثار بولا' وہ نظر آجاتی ہیں''۔

وہ ان کے پیچھے چلتے چلتے کینٹین کی طرف مڑ گئے۔آزاد اور شہناز کینٹین میں داخل ہوئے تو وہ دور بنچ پر بیٹھ گئے۔

''کلاس میں نہیں جائیں گے آج''؟ نثار نے پوچھا

''یہ کلاس ختم ہو تو کہیں اور کا سوچیں گے نا' جاوید نے جواب دیا' ایسی کلاسیں بار بار تھوڑی ہی لگتی ہیں''۔

''کیوں نہیں لگ سکتیں' نثار بولا' تم اشارہ تو کرو''۔

''شکل دیکھ لیا کرو غور سے' جاوید نے اسے کہا' بغیر منہ دھوئے کیمپس چلے آتے ہو اور لڑکیاں تمہیں دیکھ کر ہنستی رہتی ہیں''۔

''تم تو دلیپ کمار ہو نا، تمہارے اوپر تو لڑکیاں مرتی ہیں، دن بھر آہیں بھرتی رہتی ہیں''۔نثار نے اسے جواب دیا۔

''اچھا یار چھوڑو یہ بتاؤ تمہاری منگنی ہوگئی ہے''۔جاوید نے موضوع بدلا۔

''کبھی تو کوئی اچھی بات کر لیا کرو''۔

''کیوں بھئی یہ بھی کوئی بری بات ہے' جاوید حیران ہو کر بولا' اتنی چھوٹی چھوٹی بات پوچھی ہے اور تم ناراض ہو رہے ہو''۔

''ہمارے ہاں منگنی کے چونچلے نہیں ہوتے بس شادی ہوتی ہے''۔نثار نے جواب دیا

''رشتہ ہو گیا ہے''۔

''ہوا تو نہیں پر اماں تُلی بیٹھی ہے'' نثار نے برا سا منہ بنا کر کہا۔
''لگتا ہے تم خوش نہیں ہو''۔ جاوید نے خیال ظاہر کیا۔
''کیسے خوش ہوں بھئی لڑکی کی واحد qualification یہ ہے کہ وہ اماں کی بھانجی ہے''۔ نثار نے کہا۔
''پڑھ رہی ہے''؟ جاوید نے پوچھا۔
''پڑھائی سے فارغ ہو گئی ہے''۔
''کہاں تک پڑھی ہے''؟
''میٹرک تک''۔ نثار نے جواب دیا۔
جاوید کا منہ حیرت سے کھل گیا۔
''ایسا کیوں ہوتا ہے یار ہمارے معاشرے میں''؟ اس نے پوچھا
''ماں باپ سے پوچھونا''۔
''ماں باپ کہاں پوچھنے دیتے ہیں یار تم ہی بتا دو''۔ جاوید نے کہا
''جب تمہارے ساتھ ہوگا نا تو پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑے گی' نثار نے کہا' ذرا صبر کرو''۔
''وہ تو ٹھیک ہے یار لیکن یہ ہمارے معاشرے کا ایک ایشو تو ہے نا' جاوید نے کہا' اس پر بات کرنے میں کیا حرج ہے''؟
''وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ کوئی موقع ہے دل کو دُکھانے کا''؟ نثار نے جواب دیا۔
''ٹائم بھی تو پاس کرنا ہے نا بھئی''۔
''تو کوئی اور بات کر لو' نثار بولا' دو چار لڑکیوں کو زیر بحث لے آؤ، کوئی بیت بازی کر لو ضروری ہے کہ میرے دل و دماغ کو تختہ مشق بناؤ''؟
''نہیں یار اس کم بخت کو دیکھنے کے بعد دل اداس ہو گیا ہے، کسی شوخ موضوع کی طرف نہیں جا رہا''۔ جاوید نے کہا۔
''اچھا، بچوں کی سی ضد کرتے ہو تو سنو۔

یہ اس لیے ہوتا ہے کہ ہمارا معاشرہ ایک قبائلی معاشرہ ہے۔ تم اسے خانگی معاشرہ بھی کہہ سکتے ہو جس میں لوگ گھر سے لے کر محلے اور پھر برادری کی سطح تک مل جل کر رہتے ہیں۔ ایک سے زاید خاندان اس وقت تک ایک گھر میں رہتے ہیں جب تک اس میں سب کے رہنے کی جگہ دستیاب ہو۔ جب یہ جگہ کم پڑ جاتی ہے تو پھر سب مل کر ایک اور گھر تعمیر کرتے ہیں اور زاید خاندان کو نئے گھر میں منتقل کر دیتے ہیں۔ یہاں پر خاندان کی تعریف کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ خاندان سے مراد میاں بیوی اور ان کی اولاد ہے۔ لیکن ہمارے ہاں خاندان کا تصور قدرے مختلف ہے۔ یہاں پچھلی سات بلکہ اس سے بھی زاید پشتوں کو ایک خاندان تصور کیا جاتا ہے۔ اور اسی بنیاد پر ایک خاندان برادری میں پہچانا جاتا ہے۔ جس خاندان کے پاس جتنی زیادہ افرادی قوت ہوگی وہ برادری میں اتنا ہی بااثر ہوگا۔ اب اگر میاں بیوی والے چھوٹے خاندان کو تم یہاں پر تلاش کرو گے تو وہ تمہیں اس بڑے خاندان کی چھوٹی اکائی کی صورت میں ملے گا۔ اور ضروری نہیں کہ یہ تمام چھوٹی اکائیاں تمہیں الگ الگ گھر میں ملیں۔ تمہیں ہر وقت ایک سے زاید چھوٹی اکائیاں ایک ہی چھت کے نیچے ملیں گی......''۔

جاوید بڑی توجہ سے اس کی بات سن رہا تھا۔

''اسی کو Joint family system کہا جاتا ہے اور اس سسٹم کو باقی رکھنے کے لیے arranged marriage کو زیادہ سود مند سمجھا جاتا ہے۔ والدین کی کوشش ہوتی ہے کہ ایسی لڑکی بیاہ کر لائی جائے جو دیکھی بھالی ہو اور جس کے بارے میں وہ پر اعتماد ہوں کہ مشترکہ خاندان میں چل سکے گی۔ انجان لوگوں پر اعتماد کرنا مشکل ہوتا ہے۔ تمام تر خانگی کاروبار چونکہ عورت کے ذمے ہوتا ہے اس لیے ڈھلتی عمر کے ساتھ اسے ایک مددگار کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے میں اپنی بھانجی بھتیجی وغیرہ کو زیادہ اہمیت اس لیے دی جاتی ہے کہ وہ اپنی خالہ، پھوپھی وغیرہ کا زیادہ خیال رکھے گی۔ حالانکہ بعض اوقات یہ توقعات پوری بھی نہیں ہوتیں جس کی وجہ سے پرانے رشتوں میں بھی دراڑ پڑ جاتی ہے۔

اب اس کا دوسرا پہلو بھی سن لو' نثار نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا' جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا ہے کہ ہمارا معاشرہ ایک قبائلی معاشرہ ہے۔ تو قبائل کی اپنی کچھ روایات ہیں جو

صدیوں سے سائے کی طرح ان کے ساتھ ساتھ چلتی آرہی ہیں۔ان میں سے ایک روائت یہ ہے کہ قبائل دوسرے قبائل سے رشتہ داری کرنے سے گریز کرتے ہیں۔اس کی کئی ایک وجوہات ہیں جن میں نسلی امتیاز کو برقرار رکھنا اور سال ہا سال کی آپس کی دشمنیوں کے باعث آپس میں اعتماد کا نہ ہونا زیادہ اہم ہیں۔مزید یہ کہ قبائل یہ سمجھتے ہیں کہ انکی عزت عورت کے ہاتھ میں ہے اس لیے انفرادی پسند و ناپسند کی نہ صرف یہ کہ حوصلہ شکنی کی جاتی ہے بلکہ عورت کو اس کا حق دینا بے حیائی اور بے غیرتی سمجھا جاتا ہے''۔

جونہی نثار نے بات مکمل کی جاوید اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے تالیاں پیٹنا شروع کر دیں۔

''کیا بات ہے بھئی پاگل ہو گئے ہو''؟ نثار بولا

''کیا خوبصورت لیکچر دیا ہے یار تمہیں تو سوشیالوجی کا پروفیسر بننا چاہیے تھا کدھر اکنامکس میں آگئے ہو''۔جاوید نے دل سے اس کی تعریف کی۔

''لیکچر والی کیا بات ہے بھئی یہ سب کچھ تو ہمارے سامنے ہو رہا ہے''۔نثار نے کہا

''بہت ساری چیزیں ہمارے سامنے ہو رہی ہیں لیکن ہمیں ان کا شعور نہیں ہوتا''۔جاوید نے کہا۔

''مثلاً''۔نثار نے وضاحت چاہی۔

''مثلاً ریاستی وسائل کو لوٹا جا رہا ہے، منگلا ڈیم اور جنگلات کی رائلٹی ہمیں نہیں دی جا رہی، پاکستان میں کشمیر کی پراپرٹی کی آمدن ہمیں نہیں دی جا رہی یعنی بڑے پیمانے پر ہمارا معاشی استحصال ہو رہا ہے اور ہمیں اس کا شعور نہیں۔ہم ایک غلام قوم ہیں جبکہ ہم خود کو آزاد تصور کیے ہوئے ہیں۔ہماری قیادت کشمیر کی آزادی سے مخلص نہیں اس کا بھی ہمیں شعور نہیں''۔جاوید نے جواب دیا۔

''دیکھو جاوید یہ باتیں نصاب میں تو ملنے کی نہیں یہ سیاستدانوں کا کام ہے کہ وہ عوام کو اس بات کا شعور دیں اور اپنے حقوق کے لیے آواز اٹھائیں''۔نثار بولا''لیکن وہ تو وزارت امور کشمیر کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ہم نے اس کے خلاف آواز اٹھائی ہے لیکن ایک طلبہ تنظیم کتنا کچھ کر سکتی ہے''۔

''یہ نہ کہو کہ ایک طلبہ تنظیم کچھ نہیں کر سکتی۔ طلبہ کسی بھی ملک یا قوم میں آنے والی تبدیلی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں'۔ جاوید بولا'البتہ اہمیت اس سلسلہ میں اس بات کی ہوتی ہے کہ آپ کی نظریاتی اساس کتنی مضبوط اور زمینی حقائق سے جڑی ہوئی ہے، آپ اپنے مقصد سے کس قدر مخلص ہیں، کتنے منظم ہیں اور آپ کی حکمت عملی کیا ہے۔ اگر تو آپ طلبہ کے اندر تحریکی شعور کو پیدا کرنے اور انہیں منظم کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو سمجھ لیں کہ آپ نے بنیادی کام کر لیا ہے۔ طلبہ جب کسی تحریک کو شروع کرتے ہیں تو وہ طلبہ تک محدود نہیں رہتی بلکہ ایک وقت آتا ہے کہ وہ عوامی تحریک میں بدل جاتی ہے۔ اور جب عوامی تحریکیں اٹھتی ہیں تو وہ بے نتیجہ نہیں رہتیں''۔

''تمہاری بات تو ٹھیک ہے لیکن عوام کی قیادت جن ہاتھوں میں ہے وہ ایسی کسی تحریک کا حصہ بن کر اپنے مفادات قربان نہیں کریں گے''۔ نثار نے کہا۔

''یہ بات بلکل درست ہے لیکن ایسی تحریکیں اپنی قیادت خود پیدا کر لیتی ہیں''۔ جاوید نے جواب دیا۔

''تمہارا کیا خیال ہے کہ آزاد کشمیر میں ایسی کسی تحریک کے اٹھنے کے کیا prospects ہیں''؟ نثار نے سوال کیا۔

''اس کا اندازہ کرنے کے لیے تمہیں زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں ہے' جاوید نے بولنا شروع کیا۔'۱۹۵۵ میں آزاد کشمیر میں وزارت امور کشمیر کی مداخلت پر بڑا احتجاج ہوا جو کہ سول نافرمانی، آپ راجی اور پھر مسلح بغاوت پر منتج ہوا۔ سکیورٹی فورسز نے عوام پر بے انتہا ظلم کیا، گھر گھر تلاشی لی چھوٹا موٹا اسلحہ حتیٰ کہ چھری چاقو تک بھی چھین لیا گیا۔ بہر حال آزاد کشمیر میں مداخلت کے خلاف یہ ایک بڑی مزاحمت تھی اور دراصل اسی کی ناکامی کے بعد ہماری قیادت ڈھیلی پڑ گئی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آزاد کشمیر میں ایک جینوئین تحریک کے لیے زمین ہموار ہے۔ اصل مسئلہ تحریک اور اس کی قیادت کا ہے۔ عوام جیسے خود کو اپنے مسائل سے الگ نہیں کر سکتے ایسے ہی وہ اپنی ذات کو اپنے ملک اور قوم سے جدا نہیں رکھ سکتے۔ مضبوط بنیادوں پر ایک طویل اور انتھک جدو جہد کی ضرورت ہے۔ نتائج ہر صورت سامنے آئیں گے انہیں کوئی طاقت نہیں

روک سکتی''۔

''ارے بھئی وہ ہمارا خاندان کدھر چلا گیا''؟ نثار کو اچانک یاد آیا۔

''کون سا خاندان''؟

''جس کے انتظار میں یہاں بیٹھے ہوئے ہیں''۔نثار نے کہا۔

''چلو کینٹین میں چل کر دیکھ لیتے ہیں یار کب تک یہاں بیٹھے رہیں گے''۔جاوید نے کہا۔

''جہاں اتنا انتظار کیا ہے تھوڑا اور سہی''۔نثار نے کہا۔

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ وہ دونوں کینٹین سے نکل آئے۔آزاد نے دور سے ہی انہیں دیکھ لیا اور سیدھا ان کی طرف آ گیا۔دونوں ان کے استقبال کے لیے کھڑے ہو گئے۔

''آیئے چوہدری صاحب آج کدھر کی سیریں ہو رہی ہیں''؟ جاوید بول پڑا۔

''تم لوگوں کو ہی ملنے آیا ہوں یار اور میرا کون ہے یہاں''۔آزاد نے ان سے ملتے ہوئے کہا۔

''اور کوئی نہیں ہے''؟ جاوید نے سوال کیا۔

ان دونوں نے لڑکی کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔

''یہ شہناز ہے، میری وائف......''

''وائف......''!! دونوں کے منہ سے بیک وقت نعرہ بلند ہوا۔وہ حیرت سے کبھی ان کو کبھی ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

''یعنی تم نے شادی کی ہے''؟ نثار نے پوچھا۔

''ہاں شادی ہی کی ہے''۔

''سچ مچ کی شادی''! جاوید نے سوال کیا

''ہاں یار سچ مچ کی شادی' اس نے ہنستے ہوئے کہا 'تمہیں یقین نہیں آ رہا کیا''؟

''تو گویا آپ دونوں میاں بیوی ہیں''؟ جاوید نے سچوایشن کو مزید دلچسپ بنا دیا۔

''بھئی اس میں حیران ہونے والی کون سی بات ہے' آزاد بولا' کوئی انہونا کام تو نہیں کیا''۔

''نہیں بھئی صاحب آپ نے تو ہر گز کوئی انہونا کام نہیں کیا ہے' نثار نے جواب دیا'

دراصل ہم ہی کچھ انہونے سے ہو گئے ہیں''۔

''بھائی صاحب آپ نے تو بہت نیک اور ثواب کا کام کیا ہے۔لیکن چونکہ یہ نیک کام اتنا چھپ چھپا کر کیا گیا ہے کہ اس پر گناہ کا گمان ہونے لگا ہے''۔ جاوید کی اس بات پر اتنا زور کا قہقہہ لگا کہ آس پاس کے لڑکے لڑکیاں رک کر انہیں دیکھنے لگے۔

''چلو جی آپ لوگوں نے بہت ہی اچھا کیا ہے' نثار نے دونوں کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا' مبارک ہو، بہت، بہت مبارک ہو''۔

''ہاں جی مبارک ہو، بڑے اچھے فیصلے کیے ہیں'' جاوید بولا۔

''فیصلے سے کیا مطلب''؟ نثار نے پوچھا۔

''بھئی ایک تو شادی کی' جاوید بولا' بہت اچھا فیصلہ، پھر بن بتائے کی اور بھی اچھا فیصلہ، اور پھر ہنی مون کے لیے یونیورسٹی کا رخ کیا اس سے بھی اچھا فیصلہ''۔

''اچھا بھئی اب تو جان بخشی کر دو اور مجھے بھی کچھ کہنے دو''۔آزاد نے کہا۔

''تو گویا تمہارے پاس کہنے کو کچھ باقی ہے ابھی''؟ جاوید نے پوچھا۔

''میں تو بولا ہی نہیں ہوں ابھی''۔آزاد نے کہا۔

''اچھا تو تم ابھی تک بولنے کی امید رکھتے ہو''؟ جاوید نے کہا۔

''کیا مطلب''؟

جاوید نے ذرا محتاط ہوتے ہوئے کہا'' بھئی میرا مطلب ہے کہ جب آدمی کو ترجمان مل جائے تو پھر خود سے بولنے کی ضرورت نہیں رہتی''۔

پھر قہقہہ لگا اور دیر تک سبھی ہنستے رہے۔

''بھابھی آپ پریشان نہیں ہونا' نثار بولا' ہم اس کی ساری خوبیاں بیان کر دیں گے تاکہ اسے خود اپنا تعارف کرانے کی ضرورت نہ پڑے''۔

''اچھا بھئی صاحب تو آپ کیا کہنا چاہ رہے تھے''؟ جاوید نے پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں کہنا ہے یار''۔آزاد نے کہا۔

''بولو بولو یہ کیمپس ہے تمہارا کچن نہیں ہے''۔ جاوید نے کہا۔

شہناز برابر مسکرا رہی تھی اور ان کی بے تکلفی سے محظوظ بھی ہو رہی تھی۔

''ان کو کہاں لے چلیں بھئی''؟ نثار نے پوچھا۔

''تھانے''۔ جاوید نے جھٹ سے کہا۔

پھر قہقہے لگے اور ہنستے ہنستے ان کا برا حال ہو گیا۔

''بھئی ایسی دُرگت تو میری کبھی نہیں بنی''۔ آزاد نے ہنستے ہوئے کہا۔

''فکر نہیں کرو' جاوید بولا' ہنی مون کی اننگز ختم ہونے دو عادی ہو جاؤ گے''۔

''چلو بھئی اب یہاں کھڑا رہنا اچھا نہیں دیکھو کتنی گرمی ہے' نثار بولا' بھابی کا میک اپ دُھلنا شروع ہو گیا ہے''۔

وہ پھر ہنسنے لگے۔ نثار آگے آگے چلنا شروع ہو گیا۔

''بھئی اصل میں شادی کا کوئی فنکشن تو ہوا نہیں۔ نکاح کی چھوٹی سی تقریب تھی جس میں اپنے میر پور والے بھی سارے دوست شریک نہیں تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ میرا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا جس کی وجہ سے ایک مہینہ گھر پہ ہی پڑا رہا، تم لوگوں کی طرف دھیان نہیں گیا''۔ آزاد نے وضاحت کی۔

''ایکسیڈنٹ؟ وہ کیسے ہوا اور کہاں کہاں چوٹ آئی''؟ نثار نے پوچھا۔

''میں تو سوچ رہا تھا کہ تمہیں خبر ہو گی''۔

''ہمیں تو بالکل پتہ نہیں ہے''۔ نثار نے کہا۔

آزاد نے انہیں واقعے کی تفصیل سنائی۔

''اچھا تو اب سمجھا''۔ جاوید بولا

''کیا سمجھے''؟ آزاد نے پوچھا

''یہی کہ ایک نہیں دو ایکسیڈنٹ کیے ہیں ایک سے ڈر کہ دوسرا'' جاوید بولا۔

پھر قہقہے لگے۔

''ہم تو سمجھے تھے شادی کی ہے تو نے''! جاوید پھر بولا۔

''یار یہ بات تو تم نے بالکل سچ کہی ہے' نثار بولا' ایکسیڈنٹ بھی اتنا ہی اچانک ہوتا ہے''۔

''میں نے جھوٹ بولا کب ہے' جاوید نے کہا' دیکھو آزاد میں اسے کتنی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ بھئی خدا کا خوف کرو اب تم پرائمری سکول میں نہیں یونیورسٹی میں ہو۔ منہ دھولیا کرو۔ لیکن جیسے پتھر پر پانی اثر نہیں کرتا، اس پر میری بات اثر نہیں کرتی۔ لڑکیاں اس کی شکل دیکھ دیکھ کر ہنستی رہتی ہیں اور موصوف خوش ہو رہے ہوتے ہیں کہ وہ مجھے لفٹ کرا رہی ہیں''۔

اس مرتبہ شہناز کا قہقہہ سب سے بلند تھا۔ نثار اتنا زندہ دل آدمی تھا کہ جب کوئی اس کا مذاق اڑاتا تو وہ اپنے اوپر ہنسنے والوں کا بھرپور ساتھ دیتا۔ اور اس کی یہ زندہ دلی دوسروں کو اور بھی بھاتی۔ جاوید تو نثار سے بھی دو ہاتھ آگے تھا۔ اپنے آپ کو بھی معاف نہیں کرتا تھا۔ یقیناً اپنے اوپر ہنسنے والے لوگ کمیاب ہی نہیں نایاب ہوتے ہیں۔ یہ آخری درجے کی جرأت ہوتی ہے اور جس شخصیت یا معاشرے میں ہوتی ہے اسے چار چاند لگا دیتی ہے۔ آج کل ہمارے ہاں یہ حالت ہے کہ مسخرے سے مسخرا آدمی بھی اتنی سنجیدہ صورت ہوتا ہے کہ جیسے جنازے میں شریک ہو۔ لوگ مرنے سے پہلے مر رہے ہوتے ہیں۔ ایسے مرنے سے غم تھوڑے ہی مرتے ہیں۔ غموں کو ہنس کر سہہ جانے والے لوگ اندر سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتے ہیں لیکن فضا کو مغموم نہیں ہونے دیتے۔ یہ ایک طرح کی خدمت بھی ہے اور احسان بھی۔ خصوصاً ایسے ماحول میں جہاں لوگ ہنسنا بھول چکے ہوں۔ ایسے دور تو گزرتے ہیں بستیوں پر جب اخلاق و اقدار کو کچھ ایسے معنی پہنا دیے جاتے ہیں کہ وہ اپنی رعنائی کھو دیتے ہیں۔ اور نتیجتاً خشک لکڑی کی طرح ٹوٹ جاتے ہیں۔ پھر ہم ڈھونڈتے پھرتے ہیں، انہیں یاد کر کر کے روتے ہیں۔ آزاد جاوید کو اچھی طرح جانتا تھا اس لیے اسے کہا

''کچھ اپنے بارے میں بھی تو بتاؤ نا''۔

''کیا بتاؤں یار دو دن پہلے کی بات ہے رات بھر 'داس کیپٹل' سے الجھا رہا حتیٰ کہ صبح ہو گئی۔' آزاد نے بات شروع کی' کلاس میں پہنچا تو سب سے پہلے لڑکیوں نے ہوٹنگ شروع کی پھر لڑکے بھی شامل ہو گئے۔ حتیٰ کہ پروفیسر صاحب بھی ہنسنے لگے۔ پوری کلاس میں اکیلا میں ہی خاموش تھا۔ حیران تھا لوگ کیوں ہنس رہے ہیں۔ کافی دیر کے بعد پتہ چلا کہ وہ مجھ پر ہی ہنس رہے ہیں لیکن یہ نہیں سمجھ آ رہی تھی کہ وجہ کیا ہے''۔

''تو وجہ کیا تھی''؟ آزاد نے پوچھا۔

''وجہ کیا تھی یار نئی شرٹ ہاتھ میں آئی تو سوچا کیوں نہ اس کے ساتھ ٹائی پہن لی جائے۔ کافی دیر ناٹ ہی درست کرنے میں لگ گئی اس لیے جلدی میں پینٹ تبدیل کرنا بھول گیا اور جینز میں ہی چلا گیا''۔

وہ کافی دیر پیپل کے درخت کے نیچے بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ پھر وہاں سے اٹھ کر ان کے ہوٹل پر گئے۔

جاوید نے کہا

''یار کیا ہی اچھا ہو اگر تم بھابھی کا بھی یونیورسٹی میں داخلہ کروادو''۔

آزاد نے شہناز کی طرف دیکھا اور کہا

''تجویز تو اچھی ہے''۔

''بھابی یہ میں آپ کے بھلے کی بات کرر ہا ہوں''۔ جاوید نے کہا۔

''معاف بھی کر دو بھئی''۔ آزاد نے کہا۔

''کیوں پریشان ہو گئے ہو یار' جاوید بولا 'میں ماضی کی نہیں مستقبل کی بات کرر ہا ہوں''۔

دو دن انہوں نے خوب انجوائے کیا۔ وہ آزاد کے ایڈمیشن پر بہت خوش تھے۔ دونوں کے لیے انہوں نے بڑے قیمتی گفٹ لیے اور انہیں رخصت کیا۔



بالآخر دو ماہ پندرہ دن بعد ایوب کی ضمانت ہوگئی اور وہ گھر چلا گیا۔ دو دن وہ گھر پر ہی پڑا رہا تیسرے دن کھڑی شریف چلا گیا اور رات گئے واپس آیا۔ صبح وہ ماں کے پاس بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ ماں کے چہرے پر اس کی نظر پڑی تو وہ حیران رہ گیا۔ اسے لگا یہ ماں کا چہرہ نہیں کشکول ہے جو بیٹے کے آگے پھیلا ہوا ہے۔ اس نے گرم گرم چائے کا بچا ہوا کپ منہ میں انڈیل دیا۔ گرم چائے نے اس کا اندر جلا دیا۔ دوسرے دن اس نے ڈرائیور کو بلا کر حال احوال لیے اور پھر اس کے ساتھ کام پر چلا گیا۔

عفت کا نتیجہ آ گیا تھا اور وہ پاس ہوگئی تھی لیکن ایم اے میں داخلہ ناممکن تھا جس کے لیے اسے لاہور یا راولپنڈی جانا پڑتا۔ ایم اے کرنا اور لیکچرر بننا اس کا وہ خواب تھا جسے اس نے ایک بچے کی طرح پالا تھا۔ ایسا بچہ جسے پیدا کرنے کے بعد وہ بانجھ ہوگئی تھی۔ اور اب یہ بچہ اس کی آنکھوں کے سامنے، اس کے سینے سے چمٹا اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ریت بھر دی گئی تھی۔ اس کا دل وقت کی گزرگاہ پر چمبیلی کے پھول کی طرح مسلا جا رہا تھا اور اس کی خواہشوں کا دامن کانٹے دار جھاڑیوں میں الجھ کر تار تار ہو چکا تھا۔ اس کی آرزوئیں دن دیہاڑے قتل ہوگئیں اور اس کا ہر خیال خون آلود ہو چکا تھا۔ اسے اپنی ماں کے عورت ہونے پر بڑا رنج تھا۔ وہ اکثر سوچا کرتی قدرت اگر مرد کو ماں کا دل دے دیتی تو کائنات کا رنگ کیسا ہوتا۔ اس نے مرد کو اس اعزاز سے محروم رکھ کر عورت کو محترم تو کر دیا مگر اسے احترام ملا نہیں۔ بلکہ اس کی مامتا نے اسے ایک عادی مظلوم بنا دیا۔ یہ مامتا اس کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ یہ نہ ہوتی تو شاید عورت دنیا میں بغاوت کا دوسرا نام ہوتا۔ خونریز دنوں اور ڈکیت راتوں نے اس کے من کو ویرانے میں بدل دیا تھا۔ جہاں وقت کی سفاک چڑیلیں ہر دم چیختی رہتی ہیں۔ جس جس روح تک یہ منحوس آوازیں پہنچتیں وہ سہم کر رہ جاتی اور خود اپنے خون سے ہاتھ دھونے کے لیے تیار رہتی۔ ایسی خونی خزاں میں پھول اور پھل کہاں سے آئیں۔ بہار کے انتظار میں صدیوں کا صبر آنکھوں میں خون بن کر جم

گیا۔اب امید کی کوئی کرن اگر ہے بھی کہیں تو آنکھیں کہاں سے لائیں!

ایوب کے رہا ہونے کی خبر اسے مل گئی تھی اور وہ خوفزدہ تھی کہ وہ پھر سے کوئی الٹی سیدھی حرکت نہ کر دے۔لیکن وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ایوب سے ملاقات تو دور اس تک پیغام پہنچانے کا بھی کوئی ذریعہ نہ تھا۔اس کا باپ اس سے ناراض تھا اور ماں بھی نالاں تھی۔ بھائی تو اسے مارنے پر تلا ہوا تھا۔وہ ایک سہمی ہوئی ہرنی کی طرح پورا پورا دن کمرے میں پڑی رہتی۔کھانا پینا اور سونا برائے نام رہ گیا تھا جس کی وجہ سے دبلی ہوتی جا رہی تھی۔آنکھوں کے گرد حلقے بڑھتے جا رہے تھے۔جس طرح خشکی کے موسم میں جھیل کا پانی کم ہو کر نیچے اترتا ہے تو اپنے پیچھے نشان چھوڑ جاتا ہے۔اس کا چہرہ لاش کی طرح سفید ہو چکا تھا۔اور اس تصویر نما چہرے پر اس کی ساری خواہشیں، سارے دکھ اور حسرتیں باجماعت صفوں میں بیٹھی، سر گھٹنوں میں دیے خدا کے سامنے رو رہی تھیں۔

ایک دن اس کی ایک سہیلی اس سے ملنے آئی تو ماں نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔اسے بڑی مشکل سے آگے داخلے کی اجازت ملی تھی اور وہ مختلف کالجوں میں درخواستیں روانہ کر رہی تھی۔ ماں کی موجودگی کے باعث ان کے درمیان زیادہ بات چیت نہ ہو سکی اور وہ جیسے آئی تھی ویسے ہی واپس چلی گئی۔البتہ دروازے سے نکلتے ہوئے ایک لفافہ پیچھے پھینک گئی۔اس نے لفافہ کھول کر دیکھا ایوب کا مختصر سا خط تھا، لکھا تھا۔

ڈئیر عفت!

میں نے زندگی میں کسی کو خط نہیں لکھا۔اس لیے سمجھ نہیں آ رہی کیا لکھوں اور کیا نہ لکھوں۔

مبارک ہو سنا ہے پاس ہو گئی ہو۔لیکن تمہیں داخلے کی اجازت نہیں ملے گی۔مجھے پتہ ہے اور افسوس بھی ہے کہ اس کی وجہ میں بنا ہوں۔ہمارے معاشرے میں انسان مرضی کی زندگی نہیں جی سکتا۔نہ اپنی مرضی پہ نہ خدا کی مرضی پہ، اسلام پہ رہ سکتا ہے نہ کفر پہ۔لوگ اسے کہیں کا نہیں چھوڑتے۔اس لیے میں آج سے اپنی مرضی منشا کو تمہارے سپرد کرتا ہوں۔تم جو فیصلہ کرو گی مجھے قبول ہو گا، بس اپنا خیال رکھنا۔

تمہارے جواب کا انتظار رہے گا۔

فقط

ایوب

۵ ستمبر ۱۹۷۸ء

عفت نے خط پڑھا، سوئے ہوئے احساس جاگ اٹھے اور وہ بہت دیر روتی رہی۔ آج پورا دن اس نے کچھ چکھا تک نہیں حتیٰ کہ رات بھی یونہی گزر گئی۔ ایوب کو اس نے بڑی مشکل سے ایک دلدل سے نکال کر معاشرے کا بہترین فرد بنانے کی کوشش کی تھی اور ابھی تک وہ اس میں کامیاب تھی۔ لیکن آج اسی معاشرے نے ان دونوں کے خلاف فیصلہ دے دیا تھا۔ اس کے چکنے چپڑے چہرے پر رونق ہے لیکن اس کا دل کالا سیاہ ہو چکا ہے۔ یہ اندر سے گل سڑ چکا ہے اور اس سے سڑاند اٹھ رہی ہے۔ یہ آج کی بات نہیں اس کا چلن شروع سے خراب ہے۔ مگر اس کے خلاف کبھی کوئی قانون حرکت میں نہیں آیا۔ یہ ہمیشہ نیکی کی ٹانگیں کھینچتا رہتا ہے۔ اس کے کپڑے پھاڑ کر ننگا کر دینے میں اسے کوئی عار محسوس نہیں ہوتی۔ لوگوں سے اسے پٹوا کر اور ذلیل و رسوا کروانے کے بعد اس کے دل کو ٹھنڈ پڑتی ہے۔ پھر اپنی کامیابی کے خوب چرچے کرتا ہے۔ چائے خانوں میں، بیٹھکوں میں، سکولوں میں، دفتروں میں، کچہریوں میں، شادیوں میں، جنازوں پر، محلے کی دکانوں پر، جہاں دیکھو پیلے گندے دانت نکالے بدبودار سانسیں چھوڑتا ہوا اِتراتا رہتا ہے۔

طبقاتی بنیاد پر انسانوں کی تقسیم اور ظلم سے اس کا جی نہیں بھرا تو اس نے نسلی بنیاد پر بھی لوگوں کو ایک دوسرے کے لیے اچھوت بنا دیا۔ اپنے اسلامی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ بالکل جھوٹ بولتا ہے۔ اس نے اسلام قبول کیا ہی نہیں ہے۔ آدمی دو قدم آگے چلتا ہے تو یہ اسے تین قدم پیچھے دھکیل دیتا ہے۔ انسان پتھر کے دور سے لیکر آج تک فطرت سے مستفید ہونے کے سفر میں مسلسل اس سے لڑتا رہا ہے۔ اگر یہ اسے منہ توڑ جواب نہ دیتا تو آج تک غار کے دھانے پر کھڑا رہتا۔ مذہبی لوگوں سے اس کی جنگ، کیمونسٹوں سے اس کی جنگ، ہر نئی سوچ، ہر نئی بات سے اس کی جنگ، چاہتا کیا ہے آخر یہ؟ کوئی پوچھنے والا ہی نہیں ہے اس کو۔ روز بروز منہ زور ہوتا جا

رہا ہے۔ بد بخت کا ایسا قبضہ ہے ذہنوں پر کہ آج کہی ہوئی بات سو پچاس سال بعد جا کر لوگوں کے دل و دماغ پر اثر کرتی ہے۔ تب تک وہ بات ہی پرانی ہو جاتی ہے۔ وہ مطالبہ مطالبہ ہی نہیں رہتا۔ دور بہت دور پیچھے گھسٹتے رہنا اس کی عادت ہے۔ ۱۴۰۰ سال پہلے اسے جو کچھ کہا گیا یہ آج تک اُس کو ہضم نہیں کر پایا۔ ہمارے ہاں تو اس نے ہینڈ بریک لگا رکھی ہے ہلنے ہی نہیں دیتا۔

وہ کئی دن تک سوچتی رہی لیکن اس سے کوئی جواب بن نہیں پا رہا تھا۔ ایک دن وہ کاغذ قلم لے کر بیٹھ گئی اور دو پہر تک بیٹھی رہی، کچھ بھی نہ لکھ پائی۔ بالآخر اس نے لکھنا شروع کیا۔

ڈیئر ایوب،

اسلام علیکم

ہم جس دنیا میں رہ رہے ہیں وہاں فیصلے انسان کے اپنے ہاتھ میں نہیں کسی اور کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ وہ کوئی اور ہاتھ ہمارے خلاف فیصلہ دے چکا ہے۔ یہ اتنا بے رحم ہے کہ اپنی رُسوائی کا رِسک تو اسے گوارہ ہے لیکن کسی باعزت راستے کو اختیار کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتا ہے۔ اسے رُسوا کر کہ ہم نے خوشیوں کا تاج محل بنا بھی لیا تو کون سا اسے اپنی بربریت کا احساس ہو جائے گا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ قدرت سے مایوس ہو چکی ہوں۔ کسی نامعلوم سی امید کی کرن ہے جو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ جب بجھ گئی تو خبر کر دوں گی۔

واسلام

عفت

۱۴ ستمبر ۱۹۷۸ء

ایوب کو خط پڑھنے کے بعد اندازہ ہو گیا کہ اسے زندگی سے سمجھوتا کرنا پڑے گا۔ لیکن فطرتاً وہ ایک انتقامی آدمی تھا سمجھوتا کر کہ بھی سمجھوتے پر پورا اترنا اس کے لیے مشکل تھا۔ اپنی اس مشکل سے وہ آگاہ تھا۔ وہ دوسرا راستہ چن لیتا مگر گلی کے نکڑ پر اس کی ماں بیٹھی تھی۔ سو وہ دانت پیس کر رہ گیا۔ زندگی میں پہلی بار اسے احساس ہوا کہ ماں بھی انسان کو کمزور کر دیتی ہے۔ وہ بُجھ کر رہ گیا اور اس دن سے وہ اپنی پہلی زندگی کی طرف لوٹنا شروع ہو گیا۔ اس دن سے اس نے پھر سے شراب پینا شروع کر دی اور زیادہ تر خاموش رہنے لگا۔ البتہ اپنے کام کی نگرانی کرتا اور اکثر

گاڑی کے ساتھ چلا جاتا۔ والدہ اور بھائی خوش تھے کہ جیل جانے کے بعد وہ کافی سدھر گیا ہے۔ اسی دوران اسے آزاد کے زخمی ہونے کی اطلاع ملی۔ وہ پنڈی بھی اسے دیکھنے گیا اور جب وہ واپس آیا تو کبھی کبھار اس کے ہاں چکر لگا لیتا۔ آزاد بھی اسے جیل میں ملنے جاتا رہتا تھا اور کسی حد تک صورتحال سے باخبر بھی تھا۔

کنونشن کی تیاریاں عروج پر تھیں آزاد بھی ان میں شرکت کرتا رہا۔ زیادہ تر میٹنگز تو اس کی بیٹھک میں ہی ہوتی تھیں۔ لڑکے بہت پر جوش تھے، شہر کی ساری دیواروں پر چاکنگ ہو چکی تھی اور جگہ جگہ سرخ جھنڈے لگے ہوئے تھے۔ ممبر شپ برابر جاری تھی اور تمام کالجوں میں یونٹ مکمل ہو چکے تھے۔ شام پانچ بجے کا وقت تھا آزاد کی بیٹھک میں ۱۰/۱۵ لڑکے بیٹھے ہوئے تھے نصیر بھی ادھر آنکلا۔

''یہ کیا چیز ہے بھئی''؟ نواز نے زرین سے پوچھا۔

''پہلی بار دیکھ رہے ہو''؟

''ہاں اسی لیے تو پوچھ رہا ہوں''۔ نواز نے کہا۔

''آزاد کا دوست ہے، مولوی نصیر''۔ زرین نے جواب دیا۔

''کہاں سے ملا اس کو''؟ نواز نے طنزاً پوچھا۔

''اسی محلے میں رہتا ہے' زرین نے کہا' آزاد کہتا ہے اس کا دوست ہے''۔

''لگتا ہے فرشتوں سے بھاگ آیا ہے' نواز نے کہا' دیکھو کیسا سہا ہوا ہے''۔

''اس سے پنگا نہ لینا' زرین نے اسے نصیحتاً کہا' بہت کوڑھی بات کرتا ہے''۔

آزاد کے آنے پر نواز نے اس سے کہا

''آزاد صاحب ان صاحب کا تعارف تو کرایئے''۔

''یہ میرے بچپن کے دوست ہیں مولوی نصیر صاحب، ہمارے ہی محلے میں رہتے ہیں''۔ آزاد نے جواب دیا۔

نواز نے نصیر کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''مولوی صاحب ایک بات تو بتایئے، آدمؑ کا باپ کون تھا''؟

''بھئی صاحب مجھے تو اپنے باپ کے بارے میں پتا ہے، آدم کے باپ کی مجھے کیا خبر۔ مجھے تو آپ کے باپ کے بارے میں بھی کچھ معلوم نہیں''۔ نصیر نے جواب دیا۔

نواز جواب سن کر ہکّا بکّا ہو گیا۔

''بات کو نہ ہی بڑھاؤ تو اچھا ہے''۔ زرین نے اسے آہستہ سے ٹوکا۔

''چلو ایک آسان بات بتا دیں مولوی صاحب' نواز نے کہا' اگر میں آپ کی طرح ہو جاؤں تو کتنی حوریں ملیں گی''؟

نصیر کو بہت غصہ آیا اس نے ٹوپی اتار کر گھٹنے پر رکھی، آزاد کی طرف دیکھا اور سر میں خارش کرتے ہوئے بولا۔

''آپ کیوں ہمارے جیسے ہونے لگے بابو جی۔ ہم تو غریب مسکین لوگ ہیں، مٹی کے پُتلے ہیں۔ ہمارا جدّ امجد ایک دربدر انسان تھا۔ ہم خاک میں رُلنے والے، آپ شاخوں پہ پلنے والے۔ کیوں اپنا مقام گھٹا رہے ہیں آپ''۔

نصیر جواب دیتے ہی رخصت ہو گیا۔ بیٹھک قہقہوں سے گونج اٹھی۔ نواز کی حیرت دیدنی تھی اور اسے بالکل چُپ لگی ہوئی تھی۔

ہنسی کا زور جب ذرا تھم گیا تو زرین بولا۔

''اب منہ بسور کہ بیٹھنے کا کیا فائدہ۔ میں نے تمہیں کتنا سمجھایا کہ اِسے نہ چھیڑو مگر تم باز نہ آئے''۔

''نواز، یار تمہاری پریشانی کی مجھے کوئی وجہ تو نظر نہیں آ رہی۔ اُس نے کوئی غلط بات تو نہیں کی ہے''۔ نسیم نے کہا۔

کنونشن کے لیے کالج ہال کی اجازت مل گئی تھی اور شام سے ہی لوگ وہاں پر جمع ہونا شروع ہو چکے تھے۔ رات گیارہ بجے تربیتی نشست کا آغاز ہوا جس سے مرکزی کابینہ کے اور سینٹرل کمیٹی کے لوگوں نے بھی تقریریں کیں۔ لیکن آزاد کی تقریر تنظیم کو درپیش حالات کے اعتبار سے بہت منفرد اور اچھی تقریر تھی۔

''دوستو ہم نہ تو کسی کے تنخواہ دار ہیں نہ کسی نے ہمیں زبردستی اس کام پر لگایا ہے۔ ہم

غلام ہیں، ہماری قوم، ہماری دھرتی غلامی کے اس بوجھ کو اٹھائے اٹھائے تھک کر بکھر چکی ہے۔ غلامی کے اس احساس نے ہمارے سینوں میں سوچھید کیے تب ہم اس کے خلاف جدوجہد کے لیے تیار ہوئے۔ ہم، ہماری سوچ، ہماری فکر، ہمارا ضمیر اس کے خلاف سراپا احتجاج ہیں۔ ہمارے ذہنوں میں بدترین غلامی کے اس احساس کی سُلگتی چنگاریاں ہمیں کسی طور چین سے بیٹھنے نہیں دیں گی۔ ہم مر تو سکتے ہیں لیکن اس جدوجہد سے کنارا کش نہیں ہو سکتے۔ وقتی رنجشوں کی وجہ سے خاموش ہو کر بیٹھ جانا اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کے برابر ہے۔ چھوٹے چھوٹے اختلافات بڑی ٹوٹ پھوٹ کا باعث بن سکتے ہیں۔ ہم نے ہر کسی سے ٹکر لے رکھی ہے۔ ہم اپنے سماج کی اندھی تقلید اور غلامانہ رویوں کے باغی ہیں۔ ماں باپ سے ہمارا اختلاف، برادری رشتہ داروں سے ہمارا اختلاف، سیاستدانوں کے گھناؤنے کردار سے ہمارا اختلاف، ریاستی اداروں کے استحصال سے ہمارا اختلاف......اب اگر آپس میں بھی الجھ پڑے تو سفر نہیں کر پائیں گے۔

ہمارے اوپر بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ہم آج کی آواز، کل کا شعور، تحریک کا ایندھن ہیں......بجھ گئے تو راستہ گم ہو جائے گا۔ ہوا تیز ہے اور ہم ٹمٹما رہے ہیں۔ سیاہ اندھیری رات کے بطن سے اٹھنے والی آندھیوں میں ہم نے مشعلیں جلائی، راستے سجھانے، قافلے چلانے ہیں......۔ ہم رُک گئے تو زمانے کی سانس رُک جائے گی، انقلاب کی یہ بارات لُٹ جائے گی......! ہم غُربت، بیماری، جہالت اور استحصال کی گندگی سے اپنے سماج اور اس میں پروان چڑھنے والے ذہنوں کو پاک کرنا چاہتے ہیں۔ اور یہ تب تک ممکن نہیں جب تک ہم اس کٹھن اور عظیم جدوجہد کے تمام تر تقاضوں کو اچھی طرح سمجھ نہ لیں۔ اگر ہم ایسا نہ کر سکے تو خود اپنے دشمن بن جائیں گے۔ ہم اپنی محنت کو اپنے ہاتھوں ڈبو دیں گے اور کوئی ہمیں بچانے والا نہ ہوگا۔ سماج کو اپنے شکنجے میں جکڑنے والی ہر لحظہ متحرک و مستعد باطل قوتیں ذہنی فرسودگی کی فصلیں اُگانے میں کامیاب ہو جائیں گی۔ تب ہم اپنا خون جلا کر بھی اس کا مداوا نہ کر پائیں گے۔ روشنیاں دم توڑ دیں گی اور رات کی بڑھتی ہوئی تاریکیاں اس قوم کو گمراہ کر دیں گی......"۔

اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور حلق میں کانٹے چھب رہے تھے۔ اُس نے ایک گلاس پانی پیا اور پھر مخاطب ہوا۔

''دوستو! ہم وہ لُٹے پِٹے لوگ ہیں جن کے دامن میں کچھ بھی نہیں سوائے زمانے کی تلخیوں کے......! اور جن کے ذہنوں میں کچھ بھی نہیں سوائے شعورِ وقت کی سُلگتی چنگاریوں اور اُبلتے شُعلوں کے......'' اُس کی آواز بلند ہو کر گُونجنے لگی۔

''اُٹھو! رنجشوں کے کمبل اتار پھینکو......جس آگ میں خود جل رہے ہو، ہر ایک ذہن میں وہی آگ لگا دو، باطل کے کپڑے پھاڑ ڈالو اس کے خلاف نفرت کے الاؤ بھڑ کا دو۔

اچانک ہال نعروں سے گُونج اٹھا:

سُرخ ہے سُرخ ہے		ایشیا سُرخ ہے
خونِ کشمیر سے		ایشیا سُرخ ہے
خونِ مزدور سے		ایشیا سُرخ ہے
کشمیر بنے گا		خودمختار
کشمیر رہا ہے		خودمختار
کشمیر رہے گا		خودمختار
خودمختاری		جان سے پیاری
الحاق سے یاری		ہے غداری

لیکن لیکن یاد رکھو......
تمہارا ہتھیار محبت ہے،
اپنے مشن سے محبت،
اپنے آدرشوں سے محبت،
اپنے دوستوں سے محبت،
اپنے لوگوں سے محبت،
ان کے ٹوٹتے خوابوں سے محبت......
اس محبت میں دیوانہ وار نکل پڑو،
آندھیوں کی طرح چل پڑو،

تمہارا راستہ حق کا راستہ،
تمہارا راستہ عزم کا راستہ،
تمہارا راستہ روشنی کا راستہ،
تمہارا راستہ آزادی کا راستہ،
تمہارا راستہ انقلاب کا راستہ ہے۔

اس راستے پہ چلنے والے رُکتے نہیں، مڑتے نہیں، جھکتے نہیں، ڈرتے نہیں، بکتے نہیں۔
بڑھے چلو...... بڑھتے ہی چلو......:

نعرے:

فتح کی سمت متحد	بڑھے چلو بڑھے چلو
فتح تمہاری منتظر	بڑھے چلو بڑھے چلو
کبھی تو ہوگی روشنی	بڑھے چلو بڑھے چلو
کبھی تو مٹیں گے فاصلے	بڑھے چلو بڑھے چلو
بچہ بچہ کٹ مرے گا	کشمیر صوبہ نہیں بنے گا
ہم چھین کے لیں گے	آزادی
اِس پار بھی لیں گے	آزادی
اُس پار بھی لیں گے	آزادی

ہفتے کی رات دیر تک تاش کھلینا، بیت بازی کے مقابلے کرنا، انقلابی شاعروں کی غزلیں، نظمیں پڑھنا، مگے بھر بھر چائے پینا، ایش ٹرے بھر بھر سگریٹ پینا، نئ پڑھی جانے والی کتابوں پر تبصرے کرنا، روس، فرانس کے انقلابات، تقسیم ہند اور بعد کی سیاست پر بحث ومباحثے کرنا۔ ہندوستان اور پاکستان میں ترقی پسند تحریک کے مستقبل پر تبادلہ خیال وتنقید اور خصوصاً کشمیر کے ماضی، حال اور مستقبل کا رونا رونا تقریباً ان کا معمول بن چکا تھا۔ پاکستان میں جاگیرداری کے دن بدن پھلتے پھولتے اور اس کی گود میں سرمایہ دارانہ نظام کو پرورش پاتے دیکھ کر ان کا خون جلتا تھا۔ طبقات میں بٹے معاشرے اور اس تقسیم کو مزید تقویت دینے والے طبقاتی نظامِ تعلیم

پر وہ گھنٹوں بحثیں کرتے رہتے۔ اگر کسی چیز پر بات نہ ہوتی تو وہ ان کی اپنی پڑھائی سے متعلقہ معاملات تھے۔ کبھی بھول کر بھی وہ اس طرف کا رخ نہ کرتے۔ لیکن پھر بھی امتحانات میں اچھے خاصے نمبروں میں پاس ہو جاتے۔ وہ کتابوں پر بیٹھ کر انڈے دینے کے قائل نہیں تھے۔ نہ وہ رٹہ لگاتے نہ انہیں سینے سے چپکائے پھرتے۔ امتحانات سے کچھ عرصہ پہلے گروپ سٹڈی شروع کرتے اور جو کچھ پڑھتے آپس میں ڈسکس کر لیتے۔ پھر جو ان کی سمجھ میں آتا پیپرز میں لکھ آتے۔

نسیم ان کا ایک پڑھاکو دوست تھا۔ اس کی پوری رات ہسپتال میں مریضوں کے ساتھ کٹ جاتی، مگر صبح جب ہاسٹل کی چارپائی پر اس کی آنکھ کھلتی تو اسے سخت مایوسی کا سامنا ہوتا۔ یہ اس کا ایف ایس سی میں چوتھا سال تھا۔ ہر سال اسے نمبر کم پڑ جاتے اور وہ میڈیکل کالج میں داخلے سے محروم رہ جاتا۔ لیکن تھا بہت مستقل مزاج، تہیہ کیے ہوئے تھا کہ ڈاکٹر ضرور بننا ہے۔ آج اس نے برآمدے سے گزرتے ہوئے ان کے کمرے میں جھانکا۔ انہی پرانے چہروں کو حسبِ سابق اپنے شغل میں مصروف دیکھ کر وہ لوٹ رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے آواز دی۔

''ڈاکٹر صاحب......ارے آجاؤ بھئی......مل ہی جاؤ، اتنی بے رخی اچھی نہیں''۔

ظاہراً وہ ان سے کچھا کچھا سا رہتا تھا لیکن دل سے وہ ان کے زیادہ قریب تھا بہ نسبت دوسرے لوگوں کے۔ وہ بھی دراصل اپنی ٹینشن سے بھاگ کر ادھر آنکلا تھا لہٰذا اس نے بیٹھنے میں قباحت نہ سمجھی۔

''سناؤ ڈاکٹر کیا حال ہے''؟ یونس نے پوچھا۔

نسیم تھوڑی دیر اسے ایسے گھورتا رہا جیسے اس نے کوئی انہونی بات پوچھ لی ہو۔ اس نے پاس پڑی سگریٹ کی ڈبیا سے ایک سگریٹ نکالا اور ماچس کے لیے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ یونس اس کا سگریٹ سلگا کر واپس چارپائی پر بیٹھ گیا۔

''ارے بھئی اس بھولے بادشاہ کو نہ یہ عادت ڈالو۔ پہلے ہی ایف ایس سی اس کی جان نہیں چھوڑ رہی اِس بیگم سے بھی نکاح کر لیا تو زندگی بھر تمہیں بددعائیں دیتا رہے گا''۔ چھ پتی کھیلنے والوں میں سے ایک بولا۔

وہ تکیے سے ٹیک لگائے دھوئیں کے مرغولے اڑا اڑا کر انہیں ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔

''دیکھوتو کیا حالت ہوگئی ہے بچارے کی۔ پچکے ہوئے گالوں پر اُبھری ہوئی نوکدار ناک اور اُس پر دھری ہوئی عینک، کندھوں کی ہڈیاں اوپر کو اٹھی ہوئی اور کُب نکلا ہوا'۔امجد نے پتے بانٹتے ہوئے کہا۔'میری مانو تو اپنے حال پر رحم کرو اور اِس دوشیزہ کا پیچھا چھوڑ دو۔میڈیکل میں پہنچتے پہنچتے تم مکمل مریض بن جاؤ گے اور فارغ ہونے سے پہلے مر جاؤ گے۔کیوں اپنی زندگی کو مختصر کرنے پر تُلے ہوئے ہو۔دنیا میں غلطی سے آہی گئے ہو تو مزید غلطیاں تو نہ کرو۔دنیا میں ڈاکٹر کی بجائے انسان بن کر بھی رہا جا سکتا ہے۔کوشش کر کہ دیکھ لو''؟

قہقہوں سے پورا کمرہ گونج اٹھا۔

''ابے کالے کوّے کے تایا' نسیم تکیے سے اٹھ کر بیٹھ گیا' انسان سے تمہاری کیا رشتہ داری۔خاموشی سے اپنا کام کیا کرو۔وہ دن بھول گئے جب راہ میں پڑے ٹوٹے چُن چُن کر پیتے تھے۔اور وہ دن بھی یاد ہے جب سگریٹ پینے والے آدمی کے پیچھے ایک میل تک چلتے رہے تھے اور بالآخر اس نے ٹوٹا پانی میں پھینک دیا تھا''!

ایک دفعہ پھر قہقہے بلند ہوئے اور امجد پر خوب فقرے کسے گئے۔

''چچ چچ چچ......دیکھو یار بچارے نے کیسا برا وقت دیکھا ہے اس تھوڑی سی زندگی میں''۔

''ہائے خائے اسی لیے تو بچارا اجل کہ کوئلہ ہو گیا ہے''۔

''بالکل مورتی ہی بن گیا ہے بھئی''۔

''کیسے نہ بنتا یار چند ایک سُوٹوں کی خواہش ایک میل چلنے کے بعد بھی پوری نہ ہو تو آدمی کی کیا حالت ہوتی ہوگی۔ذرا تصور میں تو لاؤ اس کی ذہنی کیفیت''۔

''کوئی غیرت مند آدمی ہوتا تو خودکشی کر لیتا''۔

''نہ نہ نہ......اس طرف سے بے فکر رہو۔سپورٹس مین سپرٹ بہت ہے اس میں۔دیکھو تو پچھلے ایک گھنٹے سے مسلسل پی کر رہا ہے''۔

اتنے میں یونس چائے لے کر آ گیا۔

''واہ یار کسی بہت ہی نیک گھڑی میں پیدا ہوئے ہو، دل خوش کر دیا ہے تم نے''۔امجد نے چائے دیکھ کر کہا۔

''اور جس گھڑی یہ پیدا ہوا تھا نا تو سورج کو گرہن لگا ہوا تھا''۔ نسیم نے پھر اسے چھیڑا۔ قہقہے......

''ذرا غور سے دیکھو یار اس کو سر سے پاؤں تک پوری کی پوری قیامت کی نشانی ہے''۔ امجد نے جواب دیا۔

پھر قہقہے لگنا شروع ہو گئے۔

''اچھا بھئی اب مذاق چھوڑو۔ سنا ہے تم لوگ کل پھر کوئی ہڑتال وڑتال کے چکر میں ہو''؟ نسیم نے ان سے پوچھا۔

''جناب کو اعتراض ہے کوئی''؟ اختر نے سوال کیا۔

''بات اعتراض کی نہیں ہے، میں تو یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اب کی ہڑتال کا موضوع کیا ہے''؟ نسیم نے پوچھا۔

''بھئی کل کی ہڑتال کا موضوع طلبہ کے مسائل ہیں''۔ یونس نے جواب دیا۔

''ارے یہ تو بہت اچھی بات ہے''۔ اس نے کہا۔

''شکر ہے تمہیں بھی ہمارا کوئی کام اچھا لگا ہے''۔ اختر نے کہا۔

صبح کے نو بج رہے تھے، کالج کے گیٹ پر ایک عجیب منظر تھا۔ ایک طرف کالج کے پرنسپل کھڑے تھے جو لڑکوں کو کلاس میں جانے کی ہدایات دے رہے تھے۔ دوسری طرف فائنل ائیر کا ایک سٹوڈنٹ لڑکوں کو مظاہرے میں شامل ہونے کو کہہ رہا تھا۔ لڑکا عجیب آزمائش میں پھنس گیا۔ اس کا ایک بازو پرنسپل کے ہاتھ میں اور دوسرا اشتیاق کے ہاتھ میں تھا۔ پرنسپل اسے کلاس کی طرف جبکہ اشتیاق اسے مخالف سمت میں کھینچ رہا تھا۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ لڑکے پر چھوڑ دیا، وہ خود فیصلہ کرے۔ وہ آزاد ہوتے ہی گیٹ سے باہر نکل گیا۔ پرنسپل کو شدید غصہ آیا اور انہوں نے اشتیاق کو ڈانٹنا شروع کر دیا۔

''نہ تو تم لوگ خود پڑھتے ہو نہ دوسروں کو پڑھنے دیتے ہو۔ لوگوں کے مستقبل سے کھیلنا تمہارا شغل بن چکا ہے۔ روز روز کی ان ہڑتالوں نے کالج کے ماحول کی ستیاناس کر کے رکھ دی ہے۔ ماں باپ بچوں کو پڑھائی کے لیے بھیجتے ہیں اور تم انہیں ورغلا کر پڑھائی سے ہٹا دیتے

ہو۔ بہت ہو چکا، اب میری قوتِ برداشت جواب دے چکی ہے۔تم کان کھول کر سن لو اگر آج کے بعد یہ ڈرامے بازی ہوئی تو میں کالج گیٹ پر پولیس لگوا دوں گا اور تم سب بدمعاشوں کا کالج میں داخلہ بند کر دوں گا'۔ پرنسپل صاحب غصے میں کانپ رہے تھے۔'تم لوگوں کے اندر احساسِ ذمہ داری ہے ہی نہیں۔ کس مشقت اور تکلیف سے تمہارے والدین محنت مزدوری کر کہ تمہیں پڑھا رہے ہیں اور تم ہو کہ ان کے ساتھ سراسر دھوکہ کر رہے ہو؟ یہی تمہاری سیاست نے تمہیں سکھایا ہے؟ یہی تمہارا انصاف ہے؟ ماں باپ کو دھوکہ دے کر، ان کا دل دُکھا کر تم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ دنیا میں ذلت اور رُسوائی تمہارا مقدر بنے گی اور آخرت میں بھی اس کی سزا ملے گی۔ جو آدمی اپنے ماں باپ کا وفادار نہیں، ملک وقوم کا وفادار کیسے ہو سکتا ہے۔ میں نے تم لوگوں کو اپنے بچوں کی طرح سمجھا ہے اور تم آج میرے گلے پڑ رہے ہو۔ میرے ساتھ مقابلہ بازی کر رہے ہو؟ میں تم لوگوں کے بھلے کی بات کر رہا ہوں اور تم کالج کا ماحول اور تعلیمی نتائج خراب کر کہ مجھے بے عزت کروانے پر تُلے ہوئے ہو۔ یہی ایک استاد کا حق ہے۔تم لوگ اندازہ نہیں کر سکتے کہ مجھے تمہاری ان حرکتوں پر کتنا صدمہ ہو رہا ہے۔تم اپنے ساتھ کئی اوروں کا اور اس ادارے کا مستقبل برباد کر رہے ہو۔ لیکن تمہیں کسی بات کا، نقصان کا، فائدے کا، عزت کا، بے عزتی کا احساس تک نہیں۔ استاد کی تمہارے ہاں کوئی قدر رہی نہیں......"۔

اشتیاق اور اس کے دوست چپ چاپ کھڑے سنتے رہے۔ پرنسپل صاحب جب خاموش ہو کر چل دیے تو اشتیاق نے انہیں کہا۔"سر آپ نے اپنی بات کر لی۔ ہماری بھی تو سنیں"۔لیکن پرنسپل صاحب غصے میں چلے گئے۔

یہ میر پور شہر کی تاریخ کا ایک انوکھا احتجاج تھا۔۲۰۰ کے قریب لڑکے ننگے پاؤں مارچ کرتے ہوئے میونسپل کارپوریشن کے ہال کی طرف جا رہے تھے۔آج اس ہال میں آزاد کشمیر کی اسمبلی کا اجلاس ہو رہا تھا۔ جون کی جُھلسا دینے والی گرمی میں وہ نتائج سے بے پرواہ بھٹّی کی طرح سلگتی سڑک پر چلے جا رہے تھے۔ابھی کوئی ڈیڑھ میل ہی چلیں ہوں گے جامعہ مسجد کے سامنے پولیس نے انہیں روک لیا۔تھوڑی دیر تک فریقین کے مابین مذاکرات ہوتے رہے۔ انتظامیہ چاہتی تھی کہ وہ آگے نہ جائیں جبکہ طلبہ آگے جانے پر بضد تھے۔

''تم لوگ طالب علم نہیں بدمعاش ہو اور ہم تمہاری بدمعاشی نکال کر چھوڑیں گے''۔
ایک افسر نے انہیں کہا۔

''ہم اگر بدمعاش ہیں تو تم حکمرانوں کے پالتو جانور ہو جو۔ وہ جدھر تمہیں ہانک دیتے ہیں تم ڈنڈے لے کر نکل پڑتے ہو۔ نہ تمہارا دماغ اپنا ہے، نہ زبان اپنی، نہ مرضی اپنی۔ تم حکمرانوں کے ہاتھوں کا چابک ہو جنہیں وہ اپنی مرضی سے استعمال کرتے ہیں۔ تم اس بدبخت قبیلے کے لوگ ہو جو ہر دور میں ظالموں کا ہتھیار بنتے رہے ہیں۔ تم ہم سے کیا بات کرو گے اور ہم تمہیں کیا سمجھائیں گے۔ تم جاہلِ ناطق ہو، تم حکم ہی سن سکتے ہو، دلیل اور منطق قوم اور ملک تمہارے لیے بے معنی الفاظ ہیں۔ تمہاری نظر پیٹ سے اوپر جاتی ہی نہیں۔ تم پیٹ سے سوچتے، اسی سے دیکھتے، اسی کی سنتے ہو۔ تم اس سے آگے نہ دیکھ سکتے ہو نہ سن سکتے ہو، نہ سوچ سکتے ہو نہ سمجھ سکتے ہو نہ بول سکتے ہو۔ تمہارے گلوں میں اگر جوتوں کے ہار بھی ڈال دیے جائیں، تمہاری غیرت زندہ نہیں ہو سکتی۔ نہ تم اسے بے عزتی کا باعث سمجھو گے۔ تمہیں اپنے کندھوں پہ پھول، اپنے آقاؤں کی خوشنودی چاہیے۔ اس کے لیے تم نے اپنی عزت، اپنا ضمیر اپنا ایمان، سب کچھ بیچ رکھا ہے......''۔

یہ ان کی تنظیم کا ایک سینئر کارکن تھا۔ ابھی اس کی بات جاری تھی کہ پولیس نے اسے پیٹنا شروع کر دیا۔ پولیس اور طلبہ آپس میں گتھم گتھا ہو گئے۔ پولیس لاٹھیاں برسا رہی تھی اور لڑکے پتھر اور مکے۔ کئی ایک لڑکوں کے سر کھل گئے۔ نسیم پہلی دفعہ کسی احتجاج میں شریک ہوا تھا۔ اُسے ایک ہی لاٹھی سر پہ لگی اور ڈھیر ہو گیا۔ 'سر مُنڈاتے ہی اولے پڑے'۔ دو ساتھیوں نے مل کر اسے اٹھایا اور تقریباً گھسیٹتے ہوئے مسجد میں لے گئے۔ پانی پلایا، سر کی مالش وغیرہ کی اور لٹا دیا۔ مگر انہیں باہر آنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ پولیس طلبہ کو بری طرح پیٹ رہی تھی اور لڑکے ان پر پتھراؤ کر رہے تھے۔ کئی ایک پولیس والے بھی زخمی ہو گئے لیکن لڑکوں کی حالت زیادہ خراب تھی۔

اسی اثنا میں ایک سیاہ رنگ کی کار آ کر رکی۔ گاڑی کے سن رُوف سے ایک شخص نے سر باہر نکالا اور کالج کی طرف مڑ کر فائرنگ شروع کر دی۔ اس پر طلبہ بہت مشتعل ہوئے اور انہوں

نے گاڑی کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ یہ سیاہ رنگ کی مرسڈیز گاڑی تھی جو یقیناً حکومت کی ملکیت تھی۔ اور فائر کرنے والا مسلم کانفرنس کا رہنما اور اعلیٰ حکومتی شخصیت کا قریبی عزیز تھا۔ پولیس اور مظاہرین کے مابین یہ لڑائی دیر تک چلتی رہی۔ راہ گیر اور شہری دور کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ حتیٰ کہ مظاہرین کی زیادہ تر قیادت گرفتار ہو گئی۔ جو بچے ان کی حالت غیر ہو گئی تھی۔ کئی ایک لڑکوں کے سر کھل چکے تھے اور ننگے پاؤں ہونے کی وجہ سے پاؤں بری طرح جل گئے تھے۔ ان کے لیے ایک قدم چلنا بھی دشوار تھا۔ پولیس کی بے تحاشہ نفری نے پورے علاقے کو گھیرے میں لے رکھا تھا اور وہ مسلسل ایک ایک لڑکے کو پکڑ پکڑ کر پیٹ رہے تھے۔

کچھ طلبہ لاٹھی چارج سے ڈر کر ''غیر جانبدار'' ہو گئے تھے۔ وہ الگ تھلگ ہو کر تماشائیوں میں کھڑے تھے۔ لیکن اپنے ساتھیوں پر ہونے والے تشدد کی وجہ سے ان کا دل تلملا رہا تھا۔ یہ ان لڑکوں میں سے تھے جو کبھی اس طرح کی ''کارروائیوں'' کا حصہ نہیں بنے تھے۔ تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ ان کا ایک اور ساتھی پولیس سے بھاگ کر ان سے آملا۔ مگر بچارے کی قسمت نے ساتھ نہ دیا اور تین پولیس والے بھی دوڑتے بھاگتے پہنچ گئے۔ انہوں نے اُسے پکڑ کر مارنا شروع کر دیا۔ باقی لڑکوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پولیس والوں پر حملہ کر دیا۔ تماشائیوں نے جب یہ منظر دیکھا تو انہوں نے بھی ہمت کی اور تین سپاہیوں پر درجن بھر افراد چڑھ دوڑے۔ تینوں کو گرا لیا گیا اور پھر وہ اٹھ نہیں سکے۔ دو کی پسلیاں ایک کا بازو اور دانت ٹوٹ گئے اور کئی روز تک ہسپتال میں پڑے رہے۔

ان کو شہر میں آئے ہوئے چند ہی روز گزرے تھے۔ شہر کے آداب سے ناواقفیت کے باعث دن دیہاڑے ہر جگہ منہ مارتے پھرتے اس لیے ان کی خوب پٹائی ہوتی۔ وہ بڑے حیران ہوتے کہ گاؤں میں تو ہمارے ساتھ یہ سلوک صرف بچے ہی کرتے تھے۔ مگر شہر کے بڑے تو ہمارے بچوں سے بھی زیادہ شرارتی ہیں۔ اپنی برادری والے بھی ان کو پناہ دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ بلکہ انہوں نے تو دو دن ان کی خوب دُرگت بنائی تھی۔ بھوک کی وجہ سے ان کی کمریں دہری ہو چکی تھیں اور ہڈیاں نکل آئی تھیں۔ ایک دن وہ شہر سے باہر نکل کر کھیتوں میں جا کر بیٹھ گئے اور دیہات کی یادیں تازہ کرنے لگے۔

''کیا خیال ہے واپس نہ چلے جائیں''؟ ڈبّو نے بلّی سے پوچھا۔

''کس منہ سے جائیں یار، سب سے لڑ کے تو آئے ہیں''؟ بلّی کی آنکھیں مسلسل جاگنے کی وجہ سے لال سُرخ ہو رہی تھیں اور اُن میں پِل پڑی ہوئی تھی۔ شہر کی آب و ہوا اسے بالکل راس نہ آئی تھی لیکن وہ واپس جانے کو تیار نہ تھا۔

ڈبّو کا بھی ہاضمہ خراب تھا۔ جو کچھ کھاتا قے کر لیتا۔

''اس حال میں تو یہاں مر جائیں گے''۔ ڈبّو نے کہا۔

''تمہارا کیا مطلب ہے گاؤں میں موت نہ آئے گی''؟ بلّی نے پوچھا

''موت تو کہیں بھی آسکتی ہے، لیکن کم سے کم وہاں بھوک سے تو نہ مریں گے''۔ ڈبو نے جواب دیا۔

''اس سے کیا فرق پڑے گا، بھوک سے مرے یا بھرے پیٹ مرے۔ مر گئے تو مر گئے''۔ بلّی نے کہا ''بھوکا کیوں مرے، اللہ کی اتنی بڑی زمین اور پھر آدمی بھوکا مر جائے، کیوں''؟ ڈبو نے کہا

''بھئی دیکھو، صرف ہم دونوں ہی نہیں ساری دنیا بھوکی ہے۔ ابھی آج کی مثال ہی لے لو۔ کرسی اور مال کے بھوکوں نے دیکھو تو لڑکوں کو مار مار کر کیا برا حال کیا ہے''۔ بلّی نے کہا۔

''سچ کہہ رہے ہو۔ میں تو بڑا حیران ہوا یہ دیکھ کر۔ اچھا تو یہ پولیس لوگوں کو مارنے کے لیے ہوتی ہے''؟ ڈبّو نے پوچھا۔

''ہاں ہاں بالکل، یہ لوگوں کو مارنے کے لیے ہوتی ہے۔ حکومت والوں کی تو کوشش ہوتی ہے کہ لوگ ان کے حُلیے کو دیکھ کر ہی سہم جائیں۔ بلّی ذرا سنبھل کر بیٹھا اور اسے لیکچر دینے لگا۔ 'لیکن سارے لوگ ڈرنے والے نہیں ہوتے۔ کچھ لوگ انکی کالی وردیاں اور مونچھیں دیکھ کر ''پاسا'' کھا جاتے ہیں۔ کچھ کو ان کے ڈنڈوں اور بوٹوں سے جُھرجُھری آتی ہے۔ کچھ کو اپنی عزت کا خیال ہوتا ہے۔ تھوڑے سے بچتے ہیں جو بے خوف ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ ہوتے ہیں جو انہیں حکم دیتے ہیں۔ اور دوسرے وہ جوان سے مار کھاتے رہتے ہیں''۔

''اچھا تو یہ لوگوں کو بے عزت بھی کرتے ہیں''؟ ڈبّو نے پوچھا۔

''ہاں نہیں تو اور کیا۔ ان کی اصلی ڈیوٹی یہی ہوتی ہے۔ ایسی ایسی گالیاں دیتے ہیں یقین جانو تمہارے باپ دادا میں سے بھی کسی نے نہ سنی ہوں گی''۔ بلّی نے وضاحت کی۔

''یار یہ تو بتاؤ کہ یہ آدمی لوگ جب آپس میں لڑتے ہیں تو ایک دوسرے کو کُتا کیوں کہتے ہیں؟ مجھے تو بڑا دُکھ لگتا ہے''۔

''دیکھو ان باتوں پر رنجیدہ نہ ہوا کرو۔ کبھی اپنے گریبان میں بھی تو جھانک لیا کرو۔ ہم بھی جب لڑتے ہیں تو دوسرے کو آدمی آدمی نہیں کہتے؟'' بلّی نے جواب دیا۔

''ارے بھاگو یار، دیکھو ادھر سے تین چار آدمی آ رہے ہیں''۔ ڈبو کھڑا ہو گیا۔

''بیٹھ جاؤ بھئی، ہر وقت کان کھڑے کیے رکھتے ہو'۔ بلّی نے اسے ڈانٹا۔ 'دیکھو تو کیا کرنے آ رہے ہیں''۔

''یہ تو کوئی چیز پھینک کر واپس جا رہے ہیں''۔ ڈبو نے کہا۔

''چلو دیکھتے ہیں کیا پھینک گئے ہیں''؟

''ارے یہ تو بکری ہے''۔ ڈبو خوشی سے چلاّیا۔

اپنی بھوک مٹانے کے بعد وہ ایک درخت کی چھاؤں میں آ کر بیٹھ گئے۔

''آج تو سچ پوچھو مزا آ گیا ہے۔ مجھے تو وہ دن یاد آئے ہیں جب سردیوں میں کتے کثرت سے مرتے تھے۔ کتنی عیاشی کے دن تھے''۔

''ہاں ہاں، بہت اچھے دن ہوتے تھے۔ اب بھی سردیوں میں گاؤں چلے جائیں گے''۔ ڈبو نے کہا۔

''گاؤں کو بھول جاؤ، وہ ہم سے چھوٹ گیا ہے'۔ بلّی نے افسردگی کے عالم میں کہا۔ 'دیکھا ابھی اچھے لوگ باقی ہیں دنیا میں۔ لیکن اس کے باوجود مجھے شہر کی زندگی کچھ اچھی نہیں لگی ہے یار۔ سوچ رہا ہوں بستیوں سے کہیں دور نکل جاؤں''۔

''لیکن بستی چھوڑ کہ جاؤ گے کہاں''؟ ڈبو نے پوچھا۔

''مختصر سی تو زندگی ہے یار ڈبو'۔ بلّی نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ 'کسی جنگل میں

گزار لوں گا''۔

''لیکن وہاں تو سُنا ہے بڑے بڑے درندے ہوتے ہیں، تمہیں پھاڑ کھائیں گے''۔ڈبو نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

''دیکھو یار جب موت ہی زندگی کا منطقی انجام ہے تو پھر تم اس سے ڈرتے کیوں ہو؟ کسی نہ کسی بہانے تو آنی ہے۔اصحابِ کہف کے ساتھ جو ہمارا بھائی چلا تھا وہ بھی تو مر گیا تھا۔مگر خود سوچو کہاں وہ اور کہاں ہم۔رہ رہ کر یہی خیال آتا ہے کہ تارک الدّنیا ہو جاؤں''۔ٹلّی نے اسے جواب دیا۔

''نہیں بھئی میں تو اس طرح کی آوارگی والی زندگی نہیں گزار پاؤں گا''۔ڈبّو نے کہا۔

''تو پھر کیا کرو گے''؟ٹلّی نے پوچھا۔

''بڑا دِل کرتا ہے یار کسی مالک کا ہو کہ رہوں۔کسی کے گھر کا پہرہ دوں،اس کے مال کی رکھوالی کروں۔بے شک بھوکا پیاسا ہی رہوں پر کسی در پہ پڑا رہوں۔جو مزا اس زندگی میں ہے پیٹ بھر کر آوارہ گھومنے میں کہاں ہے۔اپنی مرضی کی زندگی بھی کوئی زندگی ہوتی ہے۔مالک کی مرضی پہ گزرا ایک دن آوارگی کی ساری زندگی پر بھاری ہوتا ہے۔لیکن ہمیں کون اپنائے گا۔آج کل کا آدمی تو آزاد عورت کو اپنانے کے لیے تیار نہیں ہے''۔ڈبّو نے کہا۔

لڑکے دو دو تین تین کی ٹولیوں میں آ کر کالج میں جمع ہو رہے تھے۔نسیم کو بھی کسی نہ کسی طرح ہاسٹل میں پہنچا دیا گیا تھا۔اس کے پاؤں جل گئے تھے اور تکلیف کی وجہ سے وہ اندر ہی اندر رو رہا تھا۔

''کس بے وقوف نے تمہیں ننگے پاؤں چلنے کا مشورہ دیا تھا''؟ وہ شدید غصے میں تھا۔

''شکر ہے بول پڑا ہے'امجد نے کہا' بھئی کہیں سے دو چار آنے کی مٹھائی لا کر تقسیم کر دو۔مجھے تو شک پڑ گیا تھا کہ اب یہ بول ہی نہ پائے گا''۔

''ہر وقت بکواس کرتے رہتے ہو،اسی وجہ سے عقل ماری گئی ہے'۔نسیم اس پر برس پڑا۔' ننگے پاؤں جانے کی کیا تُک تھی بتاؤ،اس سے تمہیں کیا فائدہ ہوا؟ کھڑے منہ کیا دیکھتے ہو میرا، کوئی دوائی دارو کرو''۔

''ابے جِنّات شاہ، ہمارے پاؤں لکڑی کے تھے کیا؟ یا ہم نے سر پہ اٹھا رکھے تھے''؟ امجد نے کہا۔

''یار اِس کوّے کو خاموش کرواؤ اور یونس میرا ٹوتھ پیسٹ لا کر دے دو ذرا''۔ اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''ویسے نسیم بھائی ایک بات تو بتاؤ''۔ یونس نے اسے ٹوتھ پیسٹ دیتے ہوئے کہا۔

''کیا''؟

''تمھیں اس مظاہرے میں شامل ہونے کا مشورہ کس نے دیا تھا''؟

''تم ہی باقی رہ گئے تھے، خوب مذاق اڑالو موقع جو ملا ہوا ہے''نسیم کے لہجے میں طنز تھا۔

''اسی منحوس کی وجہ سے ساری گڑ بڑ ہوئی ہے۔ امجد اسے تنگ کرنے پہ تُلا ہوا تھا۔' پتہ نہیں کیوں منہ اٹھائے چل پڑا ہمارے ساتھ؟''

''کچھ لوگ فطرتاً نامعقول ہوتے ہیں، تعلیم اور ماحول ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے''۔ نسیم نے جل کر کہا۔

طلبہ نے اگلے دو دن کلاسوں کا بائیکاٹ کیا اور احتجاجی مظاہرے کیے۔ دو دن بعد گرفتار شدگان کو رہا کر دیا گیا۔

''شہر میں حکومتی جماعت کا کوئی پروگرام نہیں ہونے دیں گے''۔ اشتیاق نے کہا۔

''بالکل ٹھیک ہے، اگر ہمیں اپنے جائز مطالبات کے حق میں پرامن احتجاج نہیں کرنے دیا جاتا تو کسی اور کو بھی یہ حق نہیں کہ وہ عوام کو ورغلاتا پھرے''۔ اختر نے کہا۔

''سر جی کوئی لڑکے آپ سے ملنا چاہتے ہیں''۔ چپڑاسی نے پرنسپل صاحب سے درخواست کی۔

''ٹھیک ہے بلاؤ''۔ پرنسپل نے جواب دیا۔

پانچ لڑکے دفتر میں داخل ہوئے، سلام دیا اور ایک طرف کھڑے ہو گئے۔

''وعلیکم سلام، آؤ بھئی کیسے آنا ہوا''۔ پرنسپل نے پوچھا۔

''سر اس دن آپ ناراض ہو گئے تھے اس لیے معذرت کرنے آئے ہیں''۔ اشتیاق نے کہا۔

''سچ کہہ رہے ہو''؟ پرنسپل صاحب نے کہا۔

''جی سر ہم جو کہہ رہے ہیں سچ کہہ رہے ہیں اور سچ کے سوا کچھ نہیں کہہ رہے''۔اشتیاق نے کہا

''بہت خوب، چلو اب کام کی بات کرو''۔ پرنسپل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''دیکھیے سر آپ بحیثیت استاد ہمارے مسائل سے بہت اچھی طرح آگاہ ہیں۔ میں بر سبیلِ تذکرہ ان کا یہاں پر ذکر کروں گا''۔اشتیاق نے بولنا شروع کیا۔'ہمارے ہاں کوئی یونیورسٹی نہیں ہے، میڈیکل کالج نہیں ہے، انجنیئرنگ کالج حتیٰ کہ فنی تعلیم کا کوئی چھوٹا سا ادارہ بھی نہیں ہے۔ راولاکوٹ، میرپور اور مظفرآباد تین ڈگری کالج ہیں۔خواتین کے لیے الگ سے کوئی کالج نہیں ہے۔ سکولوں کی تعداد بھی اسی تناسب سے ہے اور ان کی حالت بھی ناگفتہ بہ ہے ۔بیسویں صدی میں بھی ہمارے بچے کھلے آسمان تلے بیٹھ کر تعلیم حاصل کرنے پر مجبور ہیں۔طلبہ کو سکول جانے کے لیے کئی کئی میل کا سفر طے کرنا پڑتا ہے۔اس مشکل کی وجہ سے اکثر والدین اپنے بچوں کو سکول نہیں بھیج رہے۔ یا زیادہ سے زیادہ پرائمری سے آگے نہیں جاتے کہ مڈل سکول جانے کے لیے کئی میل کا سفر درکار ہے۔

آپ ہمیں بتائیں کہ ان مسائل پر اگر ہم آواز نہیں اٹھائیں گے تو کون اٹھائے گا۔پچھلے ۲۵ سالوں میں ہماری حکومتوں نے کچھ بھی نہیں کیا۔اگر ہم ان مسائل کے حل کے لیے نہیں بولیں گے تو مزید ۲۵ سال گزرنے کے بعد بھی کچھ نہیں ہوگا''۔

''اس حد تک تم لوگوں کی بات ٹھیک ہے لیکن تم نے تو پوری قوم کا ٹھیکہ اٹھا رکھا ہے۔حالانکہ تم اس کے متحمل نہیں ہو''۔ پرنسپل صاحب نے جواب دیا۔

''سر آپ کی بات سے ہم اختلاف تو نہیں کر سکتے لیکن کیا ہمیں اس معاملے میں مکمل خاموشی اختیار کر لینی چاہیے''؟اشتیاق نے کہا۔

''دیکھو اشتیاق تم لوگ اگر اتنی بڑی ذمہ داریوں کو لے کر چلنا چاہتے ہو تو میرا کوئی اعتراض نہیں ہے۔لیکن اپنے ادارے میں ایک اچھے تعلیمی ماحول کو قائم کرنا بھی تمہاری ذمہ داری ہے''۔پرنسپل نے کہا۔

''سر ہم اسی لیے حاضر ہوئے ہیں۔دراصل ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے درمیان کوئی

ضابطہ اخلاق طے ہونا چاہیے''۔ اشتیاق نے کہا۔

''ٹھیک ہے تم اپنی تجاویز لکھ کر دو ہم اس پر غور کریں گے''۔ پرنسپل صاحب لڑکوں کے اس طرزِ عمل سے کسی قدر خوش دکھائی دے رہے تھے۔

طلبہ نے اپنی تجاویز تیار کرکے پرنسپل آفس میں جمع کروادیں۔ لیکن کوئی ضابطہ اخلاق طے نہ ہوسکا۔ اس لیے کہ ایسے کسی ضابطہ کے طے ہونے کا مطلب یہ تھا کہ کالج انتظامیہ طلبہ کو حکومت کے خلاف جلسہ جلوس کرنے کی نہ صرف باضابطہ اجازت دے رہی ہے بلکہ حوصلہ افزائی کررہی ہے۔ ان کوششوں کا البتہ یہ فائدہ ضرور ہوا کہ پرنسپل اور طلبہ پھر کسی ہڑتال وغیرہ کے موقع پر ایک دوسرے کے آمنے سامنے نہ آئے۔

کالج کے سالانہ کانووکیشن کی تیاریوں کے سلسلہ میں ہونے والی یہ آخری میٹنگ تھی۔ پرنسپل نذیر شاہ صاحب تیاریوں سے مطمئن تھے لیکن ایک بات انہیں مسلسل پریشان کیے ہوئے تھی۔ انہوں نے سٹاف کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''باقی تو سب ٹھیک ہے لیکن میں اِن لڑکوں کی طرف سے مطمئن نہیں ہوں''۔

''آپ کون سے لڑکوں کی بات کررہے ہیں سر''؟ عظیمی صاحب نے پوچھا۔

''یہی این ایس ایف کے لڑکے، آپ نے دیکھا نہیں بھٹو صاحب کے جلسے میں انہوں نے کیا کیا تھا''؟ پرنسپل صاحب نے جواب دیا۔

اس پر سب چونک پڑے اور ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

''ادھر تو ہمارا خیال ہی نہیں گیا''۔ عظیمی صاحب نے کہا

''میرا خیال ہے ہمیں اس سلسلے میں انتظامیہ سے مشورہ کرلینا چاہیے''۔ پرنسپل نے کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے سر، لیکن لڑکے اگر گڑبڑ کرنے پر اتر آئے تو پولیس انہیں روک نہیں پائے گی''۔ کریم صاحب نے کہا۔

''تو پھر کیا کرنا چاہیے''۔ پرنسپل نے پوچھا۔

''میرے خیال سے لڑکوں سے بات کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے''۔ پروفیسر ممتاز نے رائے دی۔

پروفیسر ممتاز پر این ایس ایف کے طلبہ کی حمائت کا الزام رہتا تھا۔اس لیے پرنسپل صاحب انہیں گھورتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے میں اس معاملے میں مزید سوچ کر ہی کوئی فیصلہ کروں گا"۔

پرنسپل صاحب نے دوسرے دن ڈپٹی کمشنر طارق مسعود سے مشورہ کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ تمام متحرک سٹوڈنٹس کو کانووکیشن سے ایک دن پہلے گرفتار کروالیا جائے۔سوایسا ہی ہوا ایک دن پہلے این ایس ایف کے تمام متحرک کارکنوں کے وارنٹ جاری ہو گئے اور رات کو انہیں گرفتار کر کہ افضل پور تھانے میں بند کر دیا گیا۔

وہ سب حیران تھے، گرفتاری کی کوئی وجہ ان کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔صبح انہوں نے ایس ایچ او سے پوچھا۔

"بھئی صاحب،ہمیں یہ تو بتاؤ کہ ہمارے خلاف الزام کیا ہے"؟

انسپکٹر: "کل تمہارے کالج میں کانووکیشن ہو رہا ہے جس میں محترمہ نصرت بھٹو تشریف لا رہی ہیں۔تم لوگوں کو حفظِ ماتقدم کے طور پہ زیرِ حراست رکھا جا رہا ہے"۔

غفار انقلابی: "کتنی انہونی بات ہے بھئی صاحب۔ ہمارے تو وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ ہم نے محترمہ کے آنے پر کوئی گڑبڑ کرنی ہے"۔

انسپکٹر: "ایسے ہی بھٹو صاحب کے جلسے کے دوران بھی ہمارے وہم وگمان میں نہ تھا کہ تم لوگ کچھ کرو گے"۔

غفار انقلابی: "لیکن یہ تو ہمارے کالج کا فنکشن تھا اور محترمہ ایک غیر سیاسی شخصیت ہیں۔ہم کیوں اپنے کالج میں ان کے خلاف کوئی حرکت کرتے"۔

انسپکٹر: "بہر حال تمہاری نیک نیتی کا اجر تمہیں مل جائے گا،اُس کی فکر نہ کرو۔تمہارے سابقہ ریکارڈ کے باعث اور کالج انتظامیہ کی خواہش پر یہ قدم اٹھایا گیا ہے۔کانووکیشن کے دوسرے دن تمہیں چھوڑ دیا جائے گا"۔

"کتنے افسوس کی بات ہے یار۔ ہمارے اساتذہ کو ہم پر اتنا بھی اعتماد نہیں رہا۔وہ ہم سے بات تو کر سکتے تھے"۔آزاد نے اپنے دوستوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''جو ہو گیا سو ہو گیا، اب اس پر افسوس کرنے سے کیا حاصل''۔غفار نے جواب دیا۔
تین دن بعد جب کانووکشن ہو گیا تو انہیں رات تین بجے چھوڑ دیا گیا۔صبح ان کا بی اے کا پرچہ تھا۔



آزاد اپنی تنظیم کے کالج یونٹ کا صدر رہ چکا تھا۔ اس کے بعد وہ ضلعی صدر بھی رہا اور پھر چیئر مین پبلسٹی بورڈ کی حیثیت میں بھی کام کر چکا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ عہدے یا ذمہ داریوں کے تقاضے پورے کرنا کس قدر مشکل کام ہے۔ اس لیے وہ مزید کوئی ذمہ داری لینے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس نے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا تھا اور وہ وقت پر اپنی پڑھائی مکمل کر کے عملی زندگی میں آنا چاہتا تھا۔ اس کے والد کا انتقال ہو چکا تھا اور وہ گھر میں سب سے بڑا تھا۔ اس کی والدہ محدود وسائل کو بڑے طریقے سلیقے سے استعمال کر رہی تھیں۔ انہیں کبھی کسی قسم کی تنگی کا احساس نہیں ہوا لیکن چھوٹے بہن بھائی زیرِ تعلیم تھے اور اب ان کے اخراجات دن بدن بڑھتے جا رہے تھے۔ والدہ کی پریشانی اس کے لیے بہت تکلیف کا باعث تھی۔ کبھی کبھی وہ سوچتا کہ اس نے انگلینڈ نہ جانے کا فیصلہ کر کے غلطی کر لی ہے۔ وہاں وہ پڑھائی کے ساتھ ساتھ کام کاج بھی کر سکتا تھا اور یوں اس کی والدہ اور بہن بھائیوں کو کسی قسم کی پریشانی نہ ہوتی۔ اسے اپنی غلطی کا احساس تھا اور وہ انگلینڈ جانے کا تقریباً ذہن بنا چکا تھا۔

سردیوں کی ایک شام وہ صحن میں بیٹھا اسی ادھیڑ بُن میں لگا ہوا تھا کہ ماں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

''کیا بات ہے آزاد، تم کچھ پریشان نظر آ رہے ہو''؟ ماں کی شفقت بھری آنکھیں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

''میں ٹھیک ہوں اماں، پریشان تو آپ ہیں''۔ آزاد نے جواب دیا۔

''ایک بات یاد رکھو آزاد حالات سے پریشان ہو جانے والے لوگ زندگی میں کچھ نہیں کر سکتے'۔ اس کی ماں بان کی ننگی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ 'حالات انسان کی تربیت کے لیے آتے ہیں۔ دیکھو جب ہم دانہ کھیت میں ڈال دیتے ہیں تو اس کے بعد وہ کن کن مرحلوں سے گزرتا ہے اور پھر کہاں پہنچتا ہے۔ ہم بھی اس زمین پہ خدا کے ڈالے ہوئے دانے ہیں''۔

ماں کی بات سننے کے بعد وہ اُس سے اپنے پروگرام کے بارے میں مشورہ کرنے کی ہمت نہ کر سکا۔ لیکن وہ سمجھتا تھا کہ اس کا خاندان معاشی مشکلات کا شکار ہے اور اس کا حل یہ تھا کہ وہ یہاں سے نکل جائے ۔ اچانک اس کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ ''پڑھائی کے ساتھ ساتھ پارٹ ٹائم جاب بھی تو کی جاسکتی ہے''۔

اب اس کے پاس دو آپشن تھے اور وہ کسی قدر مطمئن نظر آ رہا تھا۔ اس نے دو ایک جگہ پر بات بھی کر رکھی تھی اور پارٹ ٹائم جاب ملنے کے امکانات بھی تھے۔ لیکن حالات نے اس سے دشمنی کا تہیہ کر لیا تھا۔ ۱۹۷۸ء میں ہونے والے کنونشن میں انہوں نے اسے صدر بنوا دیا۔ پارٹ ٹائم جاب تو دور کی بات اسے اپنی تعلیم مکمل کرنا بھی مشکل نظر آنے لگا۔ وہ تین حصوں میں بٹ چکا تھا۔ اس کے دل و دماغ کا ایک حصہ معزور ہو کر گھر پہ پڑا تھا۔ دوسرا کتابوں اور شہناز کے خطوط سے الجھا ہوا اور تیسرا صدارت کے شکنجے میں جکڑا ہوا تھا۔ اسے اندیشہ تھا کہ وہ کوئی ایک بھی ذمہ داری پوری نہیں کر پائے گا۔ کبھی کبھی وہ شدید دباؤ کا شکار ہو جاتا لیکن ماں کی باتیں اسے حوصلہ دیتیں اور وہ حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جاتا۔

''آصف لڑکے تو زیادہ ہو گئے ہیں''۔ فاروق خاصا پریشان نظر آ رہا تھا۔

''ہاں تعداد واقعی زیادہ ہے لیکن پریشانی کی کوئی بات نہیں میں نے کینٹین والے کو بندوبست کرنے کے لیے کہہ دیا ہے''۔ آصف نے جواب دیا۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن اتنا بل کیسے دیں گے''؟

''جیسے اس سے پہلے دیتے آئے ہیں''۔ آصف نے کہا۔

''لیکن تم یہ بھول رہے ہو کہ کینٹین والا نیا ہے' فاروق نے کہا' پتہ نہیں ادھار بھی کرے گا یا نہیں۔ کڑک آدمی لگتا ہے موچھیں تو دیکھو اس کی''!

''داڑھی موچھوں پہ نہ جایا کرو' آصف نے کہا' چہرے مہرے سے انسان کو پہچاننے میں اکثر غلطی لگ جاتی ہے''۔

''اس کا مطلب ہے تمہاری اس سے بات ہو چکی ہے''؟ فاروق نے پوچھا۔

''دیکھو میرا کام مجھ پہ چھوڑ دو' آصف نے کہا' اپنے کام کی فکر کرو''۔

''پروگرام کے بارے میں تم بے فکر رہو میں نے تمام بندوبست کر لیا ہے''؟
آج کالج میں تھرڈ ایئر کے طلبہ کے اعزاز میں استقبالیہ تھا۔ جس میں حاضری ان کے اندازے سے کہیں زیادہ تھی۔

آزاد نے اپنی تقریر شروع کرتے ہوئے کہا۔

''میرے انتہائی عزیز دوستو میں اپنی طرف سے اور اپنی تنظیم کی طرف سے آپ کو مادرِ علمی میں آمد پر خوش آمدید کہتا ہوں۔ یہ ہمارے لیے بہت خوشی کی بات ہے کہ آپ اپنا تعلیمی سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔ آپ کے کئی دوست ایسے ہوں گے جو اپنا تعلیمی سلسلہ جاری نہ رکھ سکے۔ آپ ذرا پیچھے جائیں اور دیکھیں کہ آپ کے کتنے سکول فیلوز تعلیم ادھوری چھوڑ کر محنت مزدوری میں لگ گئے۔ اس اعتبار سے آپ خوش نصیب ہیں کہ آپ کو مزید فرصت ملی ہے۔ علم ایسی دولت ہے جسے کوئی خطرہ نہیں، نہ اس سے کسی کو خطرہ ہے۔ علم روشنی ہے دوستو۔ یہ سورج کی طرح ہے جب طلوع ہوتا ہے تو چیزیں نظر آنا شروع ہو جاتی ہیں۔ انسان سب سے پہلے اپنے گردونواح سے آگاہ ہوتا ہے۔ انسان کا سب سے پہلا سامنا اور سب سے پہلا مکالمہ ماں سے ہوتا ہے۔ ماں ہی اس کی پہلی استاد اور رہنما ہوتی ہے۔ انسان کے حصولِ علم کا سفر ماں کی گود سے شروع ہو جاتا ہے اور قبر پر ختم ہوتا ہے۔ اچھائی اور برائی کی تمیز، حق و ناحق کی تمیز، جھوٹ و سچ کی تمیز، نیکی اور برائی کی تمیز، جائز و ناجائز کی تمیز علم کے بغیر ناممکن ہے۔ علم کے بغیر انسان اپنے آپ کو بھی نہیں پہچان سکتا۔ اپنی ذات کی دریافت علم کی معراج ہے۔ علم ایسا ہتھیار ہے جس کے ذریعے کائنات کی تسخیر ممکن ہے۔ اس لیے میرے دوستو میری آپ سے یہی درخواست ہے کہ وقت اور حالات نے آپ کو جو مہلت دے رکھی ہے اس سے بھرپور فائدہ اٹھائیں۔ آپ کا وقت بہت قیمتی ہے، گزرا ہوا ایک لمحہ قیامت تک واپس نہیں آئے گا۔ زندگی بہت مختصر ہے، اس مختصر مدت میں جو انسان اپنے حصے کا کام نہ کر سکے سارا زمانہ مل کر اس کی تلافی نہیں کر سکتا۔ اور انسان اپنے حصے کا کام اس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک وہ علم نہ حاصل کر لے۔

میرے دوستو ہر ملک اور ہر قوم اپنی نسلوں کی تربیت اور رہنمائی کے لیے اپنی ضرورت کے مطابق نصاب تشکیل دیتی ہے۔ وہ نصاب تعلیمی اداروں میں پڑھایا جاتا ہے اور طلبہ کی عملی

تربیت کا نظام بھی اپنایا جاتا ہے۔ ہمارے ساتھ المیہ یہ ہے کہ ہمارا نصاب ہمارا بنایا ہوا نہیں ہے اور نہ ہی یہ ہماری ضرورت ہے۔ غلام قوموں سے ان کا نصاب، ان کی تاریخ، ان کا ماضی چھین لیا جاتا ہے......اور یہی ہمارے ساتھ ہوا ہے۔ ہم اگر اپنے ماضی سے آگاہ نہیں، اپنی غلامی کے اسباب کو نہیں جانتے، اپنی آزادی کی تحریک کو صحیح خطوط پر استوار کر سکتے ہیں نہ ہی عوام کا اعتماد حاصل کر سکتے ہیں۔

......دوستو

وطن کی تقسیم کے بعد ہم انتہائی مشکل دور میں داخل ہو چکے ہیں۔ ایسے دور میں جب ریاست تین حصوں میں تقسیم ہو چکی ہو عوام کے رابطے کٹ چکے ہوں، دو نئے وجود میں آنے والے ملک اپنے غاصبانہ قبضے کو دن بدن مضبوط کرتے جا رہے ہوں، آزادی کی تحریک کو نئے سرے سے منظم کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہماری قیادت پاکستان اور ہندوستان کے ساتھ الحاق پر راضی ہے۔ جس قوم کی قیادت غاصب قوتوں سے سمجھوتہ کر بیٹھے اسے آزادی دلائے گا کون؟ پھر قوم بھی ایسی جس سے اس کی تاریخ ہی چھین لی گئی ہو۔ ایسے میں وہ غیروں کو اپنے مقدر کا خدا سمجھ لیتی ہے اور غلامی کو ہی آزادی تصور کر بیٹھتی ہے۔ آج اگر آپ لوگوں کو یہ بتاتے ہیں کہ ہم کم و بیش پانچ ہزار سالہ شاندار تاریخ، تہذیب و ثقافت کے مالک ہیں تو وہ حیران رہ جاتے ہیں۔ اگر آپ لوگوں کو یہ بتائیں کہ کشمیری دنیا کی وہ واحد قوم ہے جس کی آزادی کی جدوجہد صدیوں پر محیط ہے تو لوگ دیوانہ سمجھنے لگتے ہیں۔ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ کشمیری اپنی تاریخ سے ناآشنا ہیں۔ آپ اپنا نصاب اٹھا کر دیکھ لیجیے، آپ کو اس میں اپنی تاریخ نہیں ملے گی، اپنے ہیروز نہیں ملیں گے۔ اپنی تاریخ سے قطعی غیر متعلق مواد اور جھوٹ کو ہماری نئی نسل کے سامنے اس کی تاریخ بنا کر پیش کیا گیا یہی وجہ ہے کہ وہ اندھیروں میں بھٹک رہی ہے۔ اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں جو بھی اس کا ہاتھ تھام لیتا ہے وہ اس کے ساتھ چلنا شروع کر دیتی ہے۔ ہماری قیادت نے اس معصوم اور اپنی تاریخ سے نابلد قوم کی اس کمزوری سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور وہ انہیں یہ سمجھانے میں کامیاب ہو گئے کہ آزادی کا مطلب پاکستان سے الحاق ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ۱۹۴۷ء سے پہلے کا دور کشمیر کی تاریخ کا سیاہ

ترین دور ہے جس میں عوام کو شاذ و نادر ہی انسان سمجھا گیا ہے۔ ظلم، جبر، بیگار اور معاشی استحصال کی جو تاریخ یہاں رقم کی گئی اس کی مثال شاید ہی کہیں اور مل سکے۔ لیکن اس طویل اور تاریک دور میں بھی کشمیری اپنی تحریک آزادی سے دستبردار نہیں ہوئے۔ جبکہ موجودہ دور کا اگر آپ سرسری جائزہ بھی لیں تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ آج کشمیری اپنی تحریک آزادی کے حوالے سے بدترین دور سے گزر رہے ہیں۔ بلکہ یوں کہنا بے جا نہ ہوگا کہ کشمیری قیادت تحریک آزادی سے عملاً دستبردار ہو چکی ہے۔ ہماری دونوں طرف کی اکثریتی قیادت بھارت اور پاکستان سے اپنے وظیفوں کے عوض الحاق پر راضی ہے۔

ہم ایک عبوری دور سے گزر رہے ہیں، ایسے دور سے جب کشمیری عوام میں ابہام پھیلا کر انہیں جدوجہد کے راستے سے ہٹانے کی سرتوڑ کوششیں کی جا رہی ہیں۔ لیکن اس صورتحال کو زیادہ دیر تک برقرار نہیں رکھا جا سکے گا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم حالات کی سنگینی کا ادراک کرتے ہوئے اپنی ذمہ داری کو پورا کریں۔ اس سلسلہ میں ہماری اولین ذمہ داری یہ ہے کہ عوام کو حقیقت سے آگاہ کیا جائے۔ انہیں بتایا جائے کہ وہ آزاد نہیں ہوئے ہیں، آزادی کی منزل ابھی بہت دور ہے۔ آزادی اور الحاق کی آپس میں کوئی رشتہ داری نہیں ہے۔ الحاق کو آزادی کا نام دینے والے تاریخ کا سب سے بڑا جھوٹ بول رہے ہیں۔ آزادی سے مراد یہ ہے کہ دنیا کی دیگر آزاد قوموں اور ملکوں کی طرح کشمیری ایک آزاد قوم ہوں اور کشمیر ایک آزاد وطن ہو۔ یہ بالکل سادہ سی بات ہے۔ جبکہ الحاق سے مراد یہ ہے کہ آپ کسی دوسری قوم و ملک کا حصہ ہوں گے۔ اقوام عالم میں آپ کی کوئی حیثیت، شناخت نہ ہوگی۔ آپ کی اپنی کوئی مرضی نہ ہوگی۔ آپ دوسروں کے رحم و کرم پر ہوں گے، آپ کے وسائل پر آپ کا کوئی اختیار نہ ہوگا اور تا قیامت آپ کا استحصال جاری رہے گا۔ آپ صدیوں پر محیط اپنی آزادی کی تحریک کا گلا اپنے ہاتھوں گھونٹ دیں گے اور آنے والی نسلیں اس کی سزا بھگتتی رہیں گی۔

کون باہوش آدمی اپنے ہاتھ کاٹ کر دوسروں کے حوالے کر سکتا ہے؟ زبان رکھتے ہوئے اپنے حق کی بات کرنے سے انکار کر سکتا ہے؟ کبوتر کی طرح بلی کے سامنے آنکھیں بند کر سکتا ہے؟ مگر وہی جو وقتی اور ذاتی مفاد کو عزیز رکھتے ہوں۔ یہ لوگ تاریخ کے اندر ایک نیا اور اچھوتا

کردار بن کر سامنے آئے ہیں۔ اتنے کوتاہ اندیش لوگ آپ کو کسی دوسری قوم میں نہ ملیں گے۔ یہ تاریخ کا وہ جبر ہے جس سے آج ہم نبرد آزما ہیں۔ یہ ایک بڑا مشکل مرحلہ ہے۔ خصوصاً ایسے وقت میں جب وہ قوم کو گمراہ کرنے میں کامیاب ہو چکے ہوں۔ جیسے بچے کھلونوں سے بہل جاتے ہیں ایسے ہی ہمارے لوگ آزاد کشمیر حکومت کے کھلونے سے بہلے ہوئے ہیں۔ اور مداری اپنے کرتب دکھا رہے ہیں۔ تماشا جاری ہے اور ان کا دل نہیں چاہ رہا کہ کسی اور طرف توجہ کریں۔ جب تک کہ وہ تھک نہ جائیں لیکن مداری کبھی مجمعے کو تھکنے نہیں دیتا۔ ہر آنے والا دن ہمیں پیچھے کی طرف دھکیل رہا ہے۔ منزل سے دور کرتا جا رہا ہے۔ جانے ظلمتوں کا یہ سفر کب ختم ہوگا؟ ہر قدم پہ رکاوٹ اور ہر کروٹ پہ رات لمبی ہوتی جا رہی ہے۔ اے کاش ہمیں بھی کوئی رہنما ملا ہوتا، جو ہمیں لے کر سُوئے منزل چلا ہوتا......! ہم ہوتے، ہمارے علم ہوتے اور صبح کے آخری ستارے ہوتے......"!

اُسے محسوس ہوا کہ اس کی باتوں سے مایوسی پھیل رہی ہے۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے رُکا اور پھر بولا۔

"لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ یہ رات کبھی ختم نہ ہوگی۔ یہ لمبی تو ہو سکتی ہے، قائم نہیں رہ سکتی۔ ہمیں اپنے دشمنوں کو پہچاننا اور ان سے نمٹنے کے لیے پلان بنانا ہوگا۔ ہمارا سب سے بڑا دشمن ہماری جہالت ہے۔ یہی ہمارا نقطہ آغاز ہے، علم کو ہم نے اپنا ہتھیار بنانا ہے۔ علم سے بڑا ہتھیار زمانے میں آج تک ایجاد نہیں ہوا۔ اس کی طاقت کے سامنے نہ کوئی ٹھہر سکا ہے نہ ٹھہر پائے گا۔ آپ جب سچ کو لے کر نکلیں گے تو اس کی روشنی اندھیروں کو پاٹ دے گی۔ مگر سچ ہے کیا اسے تلاش کرنا پڑے گا۔ ہمارا ماضی ایک بہت بڑا سچ ہے جسے نہ کوئی جھٹلا سکتا ہے نہ رد کر سکتا ہے۔ ہمارا ماضی سورج کی طرح روشن و منور رہے۔ ہم ہزاروں سال تک آزاد رہے اور پھر اس آزادی کے چھن جانے پر اس کے لیے لڑتے رہے۔ یعنی ہم پر دو ہی دور گزرے ہیں آزادی کا دور اور غلامی کے خلاف جدوجہد کا دور، تیسرا کوئی دور ہم پر نہیں گزرا ہے۔ ہم نے کبھی غلامی کو تسلیم نہیں کیا۔ مغل ہوں افغان ہوں، سکھ ہوں یا ڈوگرے، غاصبوں کے خلاف اور ظلم و بربریت کے خلاف ہم سر بکفن رہے۔ ہم اس قوم کے فرزند ہیں جس کے پُرکھوں نے زندہ کھالیں کھنچوا لیں مگر باطل کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ اس لیے ہم نہ تو حالات سے مایوس ہوں گے، نہ ان سے

ڈریں گے، نہ ان حالات کو پیدا کرنے والوں کے ہاتھ پہ بیعت کریں گے۔

جدوجہد کے راستے میں مزاحم ہونے والا ہر فرد، ہر گروہ ہر طاقت ہمارا دوسرا دشمن ہے۔ یاد رکھو دوستو! کمزور کا دشمن کمزور اور طاقتور کا دشمن طاقتور ہوتا ہے...... یہ فطرت کا اصول ہے۔ تم اپنے دشمن کو دیکھ کر اپنی طاقت کا اندازہ کر لو۔ آج یہ طاقت ہمارے خلاف استعمال ہو رہی ہے۔ اسے ایک نقطے پر اکٹھا کر کہ اس کا رخ تبدیل کرنا ہے۔ کام مشکل ضرور ہے مگر ناممکن ہرگز نہیں۔ جب قافلے چل پڑتے ہیں تو راستے سمٹ جاتے ہیں۔ جدوجہد کے اس کٹھن سفر میں ارد گرد کا ماحول آپ کو مایوس کرے گا۔ آپ دیکھیں گے کہ لوگ معاشی طور پر دن بدن آپ سے بہتر ہوتے جا رہے ہیں۔ آپ کے ساتھ پڑھنے والوں کو اچھی نوکریاں مل رہی ہیں۔ روائتی سیاست کا حصہ بننے والے کل کے حکمران ہوں گے۔ جبکہ آپ دربدر کی خاک چھانتے پھریں گے۔ آپ سے آپ کے والدین بھی ناراض ہوں گے، آپ کے عزیز رشتے دار آپ کو نکما اور آوارہ سمجھیں گے۔ سماج میں آپ کی کوئی حیثیت نہیں ہوگی، ہر قدم پر سمجھوتوں کے بھیڑیے منہ کھولے کھڑے ہوں گے۔ ہر آدمی کی اپنی استعداد ہوتی ہے۔ کمزور استعداد اور کمٹمنٹ والے لوگ زیادہ دیر و دُور تک آپ کے ساتھ نہیں چل پائیں گے اور ان بھیڑیوں کا شکار ہو جائیں گے۔ اس طرح کے حادثات آپ کو پریشان ضرور کریں گے مگر ان سے مایوس نہیں ہونا۔ یہ اس سفر کا لازمی جزو ہے۔ کامیاب اور سرخرو وہی ہوں گے جو آخر تک چلیں گے۔ منزل شاید ہم نہ دیکھ سکیں، سفر ہماری زندگی سے لمبا بھی ہو سکتا ہے! ہمارا کام راستہ بنانا ہے، جہاں تک بن سکے۔ آنے والے اپنا کام سنبھال لیں گے۔ مایوسی تحریکوں کو کھا جاتی ہے جیسے زنگ لوہے کو۔ انسان مایوس تب ہوتا ہے جب وہ حالات یا افراد سے زیادہ توقعات وابستہ کر لیتا ہے۔ ہمیں زمینی حقائق کو سامنے رکھ کر چلنا ہوگا اور کسی بھی موقعے پر اپنی کوشش اور محنت سے زیادہ نتائج کی توقع نہیں رکھنا ہوگی۔ آپ کا معاشرہ آپ کو جائز مقام دینے کے لیے تیار اس لیے نہیں ہوگا کہ معاشرہ کسی اور سمت پہ جا رہا ہے جبکہ آپ کی سمت کوئی اور ہے۔ ہر کوئی اپنے مستقبل کی فکر میں ہے اور اسی کو سامنے رکھ کر چل رہا ہے۔ یہ ایک آسان ٹارگٹ ہے لیکن ہم ایک ایسے فرسودہ نظام میں رہ رہے ہیں جہاں اس کے حصول کے لیے بھی لوگوں کو اپنا بہت کچھ گروی رکھنا پڑ جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں آپ کے

سامنے اپنے مستقبل کے ساتھ ساتھ اپنی قوم اور نسلوں کا مستقبل بھی ہے۔ یہ ایک مشکل اور بڑی ذمہ داری ہے۔ اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش میں آپ روائتی دوڑ میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ نتیجۃً آپ اپنا اثر و رسوخ کھو دیتے ہیں جس کی وجہ سے لوگ آپ کو نالائق سمجھ کر نظرانداز کر دیتے ہیں۔ لیکن یہاں پر وہ یہ بھول رہے ہوتے ہیں بحیثیت قوم ان کی کیا حیثیت ہے۔ جس قوم اور اس کی قیادت کی اپنی کوئی شناخت، حیثیت، مقام و مرتبہ نہ ہو اس کے افراد کی حیثیت چہ معنی دارد؟

ایسے سماج کے اندر لوگوں، اداروں اور حکمرانوں کے رویے غلامانہ ہوتے ہیں۔ ان سے نالاں ہونے کی بجائے ان پر ترس کھانے کی ضرورت ہے۔ ہم بحیثیت قوم و معاشرہ ایک خوفناک جہالت اور فرسودگی کا شکار ہیں۔ ہمارے دل و دماغ پر غلامی کی پپڑی جمی ہوئی ہے۔ غلامی کی اس پپڑی کو کھُرچنا کوئی آسان کام نہیں اس لیے کہ ایک تو اس کے اثرات ہماری نس نس میں اتر چکے ہیں اور دوسرا ہماری قیادت تعمیر و ترقی مذہبی، ثقافتی اور جانے کون کون سے رشتوں کے افیونی ٹیکے لگا کر اس ذہن کو کسی دوسری طرف متوجہ ہونے سے باز رکھے ہوئے ہے۔ اور یہ سب وہ اس لیے کر رہے ہیں کہ اگر ملک آزاد ہو گیا تو ان کے لیے اپنی پہچان بھی باقی رکھنا مشکل ہو جائے گی۔

یہ وہ حالات ہیں جن کا تحریکی زندگی میں آپ کو سابقہ پڑے گا۔ میں نے ان کا خلاصہ بیان کیا ہے۔ ہماری ضرورت یہ بنتی ہے کہ ہم اپنے سماج کی تاریخ سے مکمل طور پر آگاہ رہتے ہوئے اس کا اچھی طرح سے تجزیہ کرتے رہیں۔ تاکہ ایک بہتر حکمت عملی کو اختیار کرتے ہوئے اپنی جدوجہد کو حالات کے اثرات سے بچا سکیں۔ قومی آزادی کی تحریکوں کو منظّم کرنا ایک بڑا اور مشکل کام ہے شاید ہم اس کے لیے کوئی مناسب لوگ نہ ہوں۔ لیکن اگر ہم لوگوں میں تحریکی شعور بیدار کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو سمجھ لیں کہ ہم نے تحریک کی بنیاد رکھ دی ہے۔ اس اعتبار سے ہماری حیثیت اور ذمہ داری بہت بڑی ہے ہمیں اس کا شعور بھی ہونا چاہیے اور اس پر فخر بھی۔ لیکن یہ بات بھی ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اس کے تقاضے پورے کیے بغیر اس کا حصول ناممکن ہے۔ ہمیں اس بات کا پورا یقین ہونا چاہیے کہ باطل قوتیں اپنے مصلحت پسند شراکت

داروں سمیت بری طرح ناکام ہوں گی، ہماری قوم آزاد ہوگی اور حق و سچ غالب آ کر رہے گا"۔

یونیورسٹی میں ہونے والی چھٹیوں میں وہ گھر پہ کم ہی رہتا۔ مظفر آباد، کوٹلی، پونچھ کے دوروں پر نکل جاتا اور بعض اوقات سیدھا وہاں سے واپس لاہور چلا جاتا۔ دو ماہ پہلے کوٹلی میں نکیال کے چند دوستوں سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ ہماری طرف تو کوئی آتا ہی نہیں ہے۔ آزاد نے ان سے وعدہ کرلیا کہ دو ماہ بعد مارچ کی ۲۳ تاریخ کو ان کے پاس آئے گا۔ مقررہ تاریخ پر جب وہ کوٹلی پہنچا تو وہاں کے دوستوں نے اسے بتایا کہ آج تو اجمل کی شادی ہے۔ لہٰذا وہاں جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ لیکن آزاد انہیں لے کر چلا گیا۔ البتہ نکیال پہنچ کر وہ آگے نہ گئے اور آزاد کو اکیلے جانا پڑا۔ جب وہ پہنچا تو بارات تیار ہو رہی تھی۔ اجمل کو جب پتا چلا تو وہ بہت حیران بھی ہوا خوش بھی اور شرمندہ بھی۔ آزاد ان کی شادی میں شرکت کرنے کے بعد اگلی تاریخ لے کر روانہ ہو گیا۔ اور جب دوسری مرتبہ وہ وہاں گیا تو طلبہ کی ایک بڑی تعداد وہاں موجود تھی۔ اسی طرح وہ ہر اس جگہ تک پہنچا جہاں اسے پتا چلا کہ اس کی تنظیم کے کچھ ساتھی موجود ہیں۔

اس دوران اس کے ماموں اور ان کی فیملی چھٹیوں میں گھر آئے لیکن وہ باوجود کوشش کے انہیں اتنا وقت نہ دے سکا جتنا وہ توقع رکھتے تھے۔ اس نے شہناز اور ماموں سے اس پر معذرت بھی کی۔ البتہ اس نے پاسپورٹ بنوا کر ماموں کو دے دیا تھا جس کی وجہ سے وہ کسی قدر مطمئن ہو گئے تھے۔ شہناز اگر اس سے ناراض نہیں تھی تو خوش بھی نہ تھی۔ اسے بھی اس کا احساس تھا لیکن وہ مجبور تھا۔ تنظیمی صدارت کی ذمہ داری کو اس نے باقی تمام تر ذمہ داریوں پر ترجیح دے رکھی تھی۔ وہ اس سے ناانصافی نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ ان کی واپسی سے چار دن پہلے وہ مظفر آباد کے ضلعی کنونشن سے فارغ ہو کر گھر آ گیا تھا۔ وہ دو ڈھائی ماہ کی آنکھ مچولیوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ انسان جتنا بھی اپنے آپ سے فرار حاصل کرنے کی کوشش کرے وہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس نے شہناز کی موجودگی کو اپنے تنظیمی کام کی راہ میں حائل نہیں ہونے دیا تھا۔ لیکن آج جب اس کی واپسی میں چند دن باقی تھے، وہ پریشان تھا۔ پچھلا ڈیڑھ سال اس نے انتظار میں گزار دیا تھا اور جب وہ لوگ آئے تو گذشتہ دو ماہ اس نے تنظیمی بھاگ دوڑ میں خرچ کر دیے۔ اب اسے افسوس ہو رہا تھا۔ گو کہ وہ اپنے کام سے مطمئن تھا لیکن یہ اطمینان اس کی محرومی کا ازالہ کرنے سے قاصر

تھا۔اس کے خطوں میں پورے کشمیر کی سیر کے وعدے لکھے کہ لکھے شہناز کے پاس رہ گئے۔لندن میں وہ بار بار ان خطوط کو پڑھتی اور اب انہیں الٹ پلٹ کر دیکھتی رہتی تھی۔لیکن اس نے آزاد کو احساس نہیں ہونے دیا۔

گنتی کے یہ چار دن پلک جھپکنے میں گزر گئے۔اور اگست کی ایک بھیگی رات میں وہ انہیں ائرپورٹ پر الوداع کہہ رہا تھا۔شہناز کی آنکھوں میں کئی ایک سوال تھے جنہیں صرف وہی پڑھ سکتا تھا۔یہ سوال کانٹوں کی طرح اس کے دل میں چھب گئے تھے۔اس چھبن سے نڈھال وہ اگلے دو دن ہوٹل کے کمرے میں پڑا رہا۔گزرے ہوئے دو ماہ اسے خواب کی طرح لگ رہے تھے۔نیند میں آنے والا خواب ......جس نے اس کے سوچے ہوئے خوابوں کو سُلا دیا تھا۔اب سوئے ہوئے یہ خواب پوری طرح بیدار ہو چکے تھے۔نیند اُن کی آنکھوں سے رخصت ہو چکی تھی اور وہ دن رات جاگتے رہتے تھے۔اُن کی سسکیوں کو سُن سُن کر کمرے کی چھت اور دیواریں بھی افسردہ ہوگئی تھیں۔میز پر پڑے ہوئے دو دن کے اخبارات ابھی تک دیکھے جانے کی امید لگائے ہوئے تھے۔ایک بلیک اینڈ وہائٹ ٹی وی کونے میں ٹرالی پر اُلو کی طرح خاموش بیٹھا تھا۔کمرے کا پنکھا البتہ رواں دواں تھا جس کی گڑگڑاہٹ ماتمی ترانے میں ڈھل چکی تھی۔تپائی پر رکھی ایش ٹرے کا پیٹ سگریٹ کے ٹوٹوں اور راکھ سے بھرا ہوا تھا اور اس کے ساتھ پڑے دو پیکٹوں کا بھی یہی حشر ہو رہا تھا۔سامنے رکھا سنگھار میز اب ریٹائرمنٹ کی عمر کو پہنچ چکا تھا۔اس کا آئینہ اب چہرہ دکھانے کے قابل نہیں رہا تھا۔اس میز کا رُواں رُواں ہوٹل والوں کی قدردانی کی گواہی دے رہا تھا۔کمرے کی دیواروں کو بھی آج مدت بعد کوئی ہمزاد ملا تھا جس پر وہ اپنا دکھ سکھ کھول رہی تھیں۔ اپنی ذات کے سوا آزاد کو یہ سب کچھ بامعنی و بامقصد نظر آتا تھا۔



بہار گئی، برسات گئی، اب خزاں ڈیرے ڈال چکی تھی۔ سُوکھے زرد پتے اُس کے اردگرد اس طرح اڑ رہے تھے جیسے بہت سارے چوہے مُردہ بلّی کے گرد ناچ رہے ہوں۔ اپنی تیسری اور چوتھی انگلی کے درمیان پھنسے کے ٹوکے سگریٹ کی طرح اس کا بھی دم گھُٹ رہا تھا۔ اور کچے گھر کے ''اوغالے'' کی طرح اس کے منہ سے نکلتا دھواں اس کے چولہے میں سُلگتی گیلی لکڑی کے سارے راز اگل رہا تھا۔ ٹھٹھرتی ہوئی شامیں وہ کھَیس اوڑھے کسی کھیت کے کنارے، کسی پگڈنڈی ، کسی درخت کے نیچے گزار دیتا۔ جب اندھیرا گہرا ہو جاتا تو وہ چوری چوری گھر میں داخل ہوتا۔ مٹی کا دیا جلاتا اور دن کی بچی روٹی کھا کر لحاف اوڑھ لیتا۔

یہ حکمداد ہی تھا جسکی جوانی پر لوگوں کو رشک آتا تھا اور جس کے بیلوں کو دیکھنے لوگ دور دور سے آتے تھے۔ ۵۰ سال کی عمر میں ۷۰ سال کا سفر کر چکا تھا۔ غربت انسان کو کتنا ایڈوانس کر دیتی ہے۔ اسے اچھی طرح یاد ہے جب انہیں زمینیں خالی کرنے کا آرڈر ملا تو وہ دیر تک پاگلوں کی طرح کھیتوں میں گھومتا رہا تھا۔ وہ ایک ایک درخت سے لپٹ کہ رویا تھا۔ وہی درخت جن پر چڑیوں اور میناؤں کے بسیرے تھے۔ انسانوں کے ساتھ وہ بھی دربدر ہونے کو تھیں۔ چشمے کے پاس پہنچ کر وہ رک گیا اور اس کا دل چاہا کہ اس میں چھلانگ لگا دے۔ اس کی ماں یہ خبر ملنے کے دوسرے دن فوت ہو گئی تھی۔ ماں کو دفنا کر وہ لوٹا تو دنیا اس کے لیے اندھا کنواں بن چکی تھی۔ اب وہ اس اندھے کنوئیں کا باسی تھا۔ اُسے اپنے کل کی کوئی خبر نہ تھی، کوئی رستہ نہ تھا، کوئی منزل نہ تھی۔ آس امید کے سارے جگنو مر گئے تھے اور آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی تھی۔ یہ مایوسی کے بعد کا کوئی مقام تھا جہاں وہ بے حس وحرکت پڑا تھا، کٹے ہوئے پیڑ کے تنے کی طرح۔

مال مویشی مٹی کے مول گیا۔ باقی وزنی سامان کا خریدار کوئی نہ تھا۔ جب وہ گاؤں سے نکلا تو ٹرک پر بیٹھتے ہی اس نے چہرے کو چادر میں چھپا لیا۔ بہاولپور میں انہیں ایک وسیع علاقے میں آباد کیا گیا۔ ان سب سے کہا گیا کہ جلد ہی انہیں زمین کی ملکیت کے کاغذات مل جائیں

گے۔ وہ کاغذات ملنے کی آس میں ان زمینوں پر مزدوری کرتے رہے۔ وہ دن رات محنت کرتے اور اناج زمیندار اٹھا لے جاتے۔ ان کے لیے کھیتوں میں اناج نہیں بھوک، بیماری اور غربت اُگتی تھی۔ ہر فصل کے اٹھنے پر وہ اپنے نصیب کے دانے گننا شروع کر دیتے۔ یقیناً جو کچھ انہیں ملتا ،اگر چاہتے تو اسے گن بھی سکتے تھے۔ یہ حالات دیکھ کر نوجوان لڑکوں نے شہروں کا رخ کیا اور محنت مزدوری شروع کر دی۔ حکمداد نے بھی کئی بار شہر جانے کے بارے میں سوچا مگر جوان بیوی کو دیکھ کر ارادہ ترک کر دیتا۔ ایکڑوں زمین کے مالک لوگ اب مزارعے بن چکے تھے۔ وہ اپنی قسمت پہ روتے اور اسے خدا کی مرضی سمجھ کر خاموش ہو جاتے۔ حالانکہ خدا نے انہیں ظلم پر خاموش رہنے کے لیے کبھی نہیں کہا تھا۔ بہر حال کچھ عرصے بعد انہیں زمین کی ملکیت تو مل گئی لیکن مقامی لوگوں اور ان کے مزاج، رہن سہن، عادات واطوار واقدار میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ لاکھ کوشش کے باوجود اُس معاشرے کا حصّہ نہیں بن پا رہے تھے۔ بلکہ ان کے لیے وہاں رہنا کسی اذیّت سے کم نہ تھا۔ لیکن ان کے پاس کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں تھا اس لیے جوں توں کر کے وہ زندگی کے دن گزار رہے تھے۔

حکمداد نے البتہ اتنا کیا کہ اپنے دونوں لڑکوں کو سکول میں ڈال دیا تھا اور ان کی برابر نگرانی بھی کرتا رہا۔ بڑے لڑکے نے جب میٹرک کر لی تو ریشم جان نے اس سے پوچھا۔

''اب اس کا کیا کریں گے''؟

''اسے فوج میں بھرتی کروائیں گے''۔ حکمداد نے جواب دیا۔

''فوج میں ہی بھرتی کرانا تھا تو اتنا پڑھایا کس لیے ہے'۔ ریشم جان نے ناراض ہوتے ہوئے کہا۔'اب تو اس کی اتنی تعلیم ہے کہ کہیں بابو لگ سکتا ہے''۔

''تم بھی پاگل ہو فوج میں سارے لوگ تو ان پڑھ نہیں ہوتے۔ پڑھے لکھے لوگ بھی ہوتے ہیں اور ان کے لیے فوج میں ترقی کے بڑے موقعے ہوتے ہیں۔ بابو بچارے کی کیا حیثیت ہے۔ ایک فوجی افسر پورے ضلعے کو ہانک لیتا ہے۔ حیران ہوں تمہیں اب بھی فوج کی طاقت کا اندازہ نہیں ہوا۔ فوج میں چلا جائے گا تو ہماری بھی یہاں پر کوئی حیثیت بن جائے گی''۔ حکمداد نے جواب دیا۔

''تو آپ ابھی تک یہاں رہنے کے خواب دیکھ رہے ہیں''؟ ریشم نے پوچھا۔

''کیا مطلب؟ رہ تو رہے ہیں''۔ حکمداد نے کہا۔

''میں تو اس آس میں جی رہی ہوں کہ کب اپنے وطن کو لوٹیں گے''۔ ریشم نے کہا۔

''مگر لوٹ کہ جائیں گے کہاں''؟

''گاؤں میں نہ سہی دور پار کہیں کوئی جھونپڑی بنالیں گے''۔

لڑکا فوج میں بھرتی ہو گیا۔ وہ ذہین بھی تھا اور دلیر بھی پھر حکمداد کی ہدایت کاری بھی برابر جاری تھی۔ چار سال بعد آخر وہ دن بھی آ ہی گیا جس کا حکمداد کو انتظار تھا۔ اس کے لڑکے کو کمیشن مل گیا تھا اور وہ ایک سپاہی سے لفٹیننٹ بن گیا تھا۔ لیکن اسی دوران ریشماں بیمار ہو گئی۔ اسے ایک عرصے سے بخار رہتا تھا اور وہ کھانستی بھی رہتی تھی۔ ڈاکٹروں نے ٹی بی کا علاج شروع کر دیا۔ لیکن وہ ٹھیک ہونے کی بجائے دن بدن کمزور ہوتی چلی گئی۔ لڑکے نے اسے فوجی ہسپتال میں داخل کروا دیا۔ تھوڑا فرق پڑا تو اس نے میرپور جانے کی ضد شروع کر دی۔

''میں اپنے دیس میں مرنا چاہتی ہوں، مجھے یہاں سے لے چلو''۔ اس نے حکمداد کی منت کی۔

وہ اسے لے کر ڈڈیال میں اپنے رشتہ داروں کے ہاں چلا آیا۔ اس کے پاس کچھ رقم جمع تھی جس سے اس نے ایک آدھ کنال زمین خرید لی اور گاؤں والوں کی مدد سے مہینے بھر میں اس کا مکان بھی بن گیا۔ لیکن اپنے گھر میں منتقل ہونے کے چند دن بعد ریشماں مر گئی۔ جب وہ یہاں سے نکلا تھا تو ماں کے سائے سے محروم ہو گیا تھا۔ واپس آیا تو بیوی بھی ساتھ چھوڑ گئی۔ حکمداد بت کا بت بنا رہ گیا۔ بالکل تنہا، لق ودق صحرا میں سوکھی ہوئی جھاڑی کی طرح۔ لوگ اس کے پاس تعزیت کے لیے آتے مگر وہ منہ کھولے ان کو دیکھتا رہتا۔ نہ کوئی بات کرتا نہ بات کا جواب دیتا۔ ریشماں کے مرنے پر لوگوں کو پتہ چلا کہ حکمداد کو اس سے کتنی محبت تھی۔ دراصل حکمداد پر بھی یہ راز اس کی موت پر ہی کھلا تھا۔



مارچ ۱۹۸۰ء میں راولاکوٹ میں جلسہ ہوا جس میں امان اللہ خان بھی شریک تھے۔ جلسے کے دوران حکومت کی ایماً پران کے خلاف ایک جلوس نکلوایا گیا جس میں کہا گیا کہ یہ لوگ انڈیا کے ایجنٹ ہیں۔ پاکستان کے دشمن اور اس کی سالمیت کے خلاف کام کر رہے ہیں۔ امان اللہ خان اس وقت برطانیہ سے آئے ہوئے تھے اور راولاکوٹ میں مہمان تھے۔ لیکن انہیں ریسٹ ہاؤس میں رہنے کی اجازت نہ دی گئی جس پر طلبہ مشتعل ہو گئے۔ جاوید نثار اس وقت تنظیم کے نائب صدر تھے انہوں نے سب کو جمع کیا اور کہا۔

''دوستو اس وقت حکومت ہی نہیں اپوزیشن بھی ہمارے خلاف ہے۔ آپ نے دیکھا کہ انہوں نے مل کر ہمارے جلسے کو خراب کرنے کی پوری کوشش کی جس میں وہ کامیاب نہیں ہو سکے۔ اب وہ موقع کی تلاش میں ہیں کہ ہم سے کوئی غلطی ہو جس پر ایکشن لیا جائے۔ اس لیے ہمیں پر امن رہنا ہو گا۔ جہاں تک ریسٹ ہاؤس میں جگہ نہ دینے کی بات ہے تو میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ ہم اپنے مہمانوں کو ریسٹ ہاؤس میں ہی ٹھہرائیں گے۔ ریسٹ ہاؤس کسی کی ذاتی جاگیر نہیں یہ عوام کی ملکیت ہے اور اس پر ہمارا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا حکومت یا کسی اور کا ہے۔ لہٰذا میری آپ تمام دوستوں سے اپیل ہے کہ آپ پر امن رہیں ہم آج رات اسی گیسٹ ہاؤس میں رہیں گے''۔

رات کو انہوں نے گیسٹ ہاؤس کے تالے توڑ کر تمام کمرے کھول دیے۔ امان اللہ خان کو وی وی آئی پی روم میں ٹھہرایا گیا۔ البتہ انہیں باری باری تمام رات جاگ کر پہرا دینا پڑا تا کہ بے خبری میں گرفتار نہ کیے جائیں۔

این ایس ایف کی موجودہ قیادت کو دو سال پورے ہو چکے تھے۔ آزاد بھی ایل ایل بی کا امتحان دے کر فارغ ہو چکا تھا۔ جون رجولائی ۱۹۸۰ء میں کابینہ اور سینٹرل کمیٹی کی مشترکہ میٹنگ ہوئی جس میں اگلا کنونشن راولاکوٹ میں کروانے کا فیصلہ ہوا۔ جبکہ حکومت کی منشأ تھی کہ یہ کنونشن

راولاکوٹ میں نہ ہو۔ حکومت نے پوری کوشش کی کہ اس کنونشن کو کسی دوسری جگہ منتقل کروایا جائے لیکن اسے کامیابی نہ ہوئی۔ کنونشن کی تیاریاں زور و شور سے شروع ہو گئیں۔ پورے آزاد کشمیر میں چاکنگ کی گئی، جھنڈے اور بینرز لہرائے جانے لگے۔ جہاں پر ضرورت تھی وہاں نئے یونٹس بنائے گئے۔ کارکنوں کا جوش و خروش قابلِ دید تھا۔ میر پور کے لوگوں نے دل کھول کر چندہ دیا۔

کنونشن کی تاریخ ۳/۲ نومبر ۱۹۸۰ء تھی لیکن آزاد، میر خالد اور طاہر نعیم انصاری ۳۰ اکتوبر کو ہی راولاکوٹ روانہ ہو گئے۔ وہ شام کو راولاکوٹ پہنچ گئے جہاں وہ پیلس ہوٹل میں ٹھہرے۔ مقامی ساتھی ان کی خبر ملنے پر وہاں جمع ہو گئے۔ جاوید نثار نے انہیں کنونشن کی تیاریوں بارے تمام تفصیلات سے آگاہ کیا۔ رات دیر تک وہ اکٹھے رہے۔ جب تمام لوگ چلے گئے تو وہ تینوں بستر پہ دراز ہو گئے۔ ابھی مشکل سے آنکھ لگی ہی تھی کہ دروازے پہ دستک ہوئی، ایک بار پھر دوسری بار۔

میر خالد نے اٹھ کر بتی جلائی اور کن اکھیوں سے آزاد کی طرف دیکھا۔

''کون ہو سکتا ہے''؟ آزاد نے پوچھا۔

''شاید اپنا ہی کوئی دوست ہو''۔ خالد نے خیال ظاہر کیا۔

''کون ہے بھئی''؟ آزاد نے آواز لگائی۔

دوسری طرف سے جواب نہ پا کر ان کی تشویش میں اضافہ ہو گیا۔ اتنے میں تیسری بار دستک ہوئی۔

''بھئی جب تک تم اپنا تعارف نہیں کرواتے ہم دروازہ نہیں کھولیں گے۔ آزاد نے بلند آواز میں کہا۔

''آزاد میں سٹی انسپکٹر ہوں، ہمارے پاس تم لوگوں کے وارنٹ گرفتاری ہیں''۔ دوسری طرف سے آواز آئی۔

''ہماری گرفتاری تمہیں بہت مہنگی پڑے گی، بہتر ہے واپس چلے جاؤ''۔ آزاد نے جواب دیا۔

''ہمارا خالی ہاتھ واپس جانے کا مطلب تم اچھی طرح سے سمجھتے ہو، ہم مجبور ہیں۔

تمہاری گرفتاری کے علاوہ ہمارے پاس کوئی راستہ نہیں ہے''۔انسپکٹر نے کہا۔

آزاد نے پچھواڑے کی کھڑکی کا پردہ ہٹایا اور کھڑکی میں لگی موٹی سلاخوں پر زور آزمائی شروع کر دی۔سلاخیں بہت موٹی اور مضبوط تھیں، پورا زور لگانے کے باوجود ایک سلاخ معمولی سی ٹیڑھی ہوئی لیکن آدمی کا نکلنا ممکن نہ تھا۔آزاد نے بے بسی میں اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔

''بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں ہے''۔خالد نے کہا۔

آزاد نے ایک مرتبہ پھر سلاخ پر زور لگایا لیکن کامیابی نہ ہو سکی۔

باہر مکمل خاموشی چھا گئی۔

آزاد نے کاغذ قلم اٹھایا اور لکھنا شروع کیا۔

''جاوید غالباً پولیس ہمیں گرفتار کرنے پہنچ گئی ہے۔اگر ایسا ہو گیا تو تمام سینئر دوست گرفتاریوں سے بچنا اور سب جگہوں پہ اطلاع دے دینا......''۔

وہ اتنا ہی لکھ پایا تھا کہ پھر دستک ہوئی۔

آزاد نے دونوں کی طرف دیکھا۔انہوں نے جواباً گرفتاری دینے کا اشارہ کر دیا۔ان کے پاس اور کوئی آپشن تھا بھی نہیں۔

''صبر کرو،ہمیں تیار ہو لینے دو''۔آزاد بولا۔

ٹوتھ پیسٹ،تولیے،صابن،سلیپر جو کچھ بیگوں سے نکالا تھا واپس ڈالا۔کپڑے تبدیل کیے،جوتے پہنے اور دروازہ کھول دیا۔

باہر انسپکٹر کے ساتھ درجن بھر سپاہی کھڑے تھے۔

آزاد نے ہتھکڑی لگوانے کے لیے بایاں ہاتھ آگے کیا تو انسپکٹر نے کہا۔

''دوسرا ہاتھ آگے کرو''۔

''دیکھتے نہیں اس ہاتھ میں سگریٹ ہے''۔آزاد کے لہجے میں تلخی تھی۔

''تم اس وقت پولیس کی حراست میں ہو اپنا لہجہ درست رکھو''۔انسپکٹر نے اسے ہتھکڑی لگاتے ہوئے کہا۔

''تمہیں بھی پتہ ہونا چاہیے کہ تم نے سٹوڈنٹس پر ہاتھ ڈالا ہے۔ تمہیں جلد ہی اس کا جواب ملنا شروع ہو جائے گا''۔ آزاد کا لہجہ اور بھی تلخ ہو گیا۔

انسپکٹر نے جواب میں کچھ نہ کہا۔ انہوں نے تینوں کو ہتھکڑیاں لگائیں اور چل دیے۔

ہوٹل سے باہر نکلتے ہی انہیں جیپ میں بٹھا دیا گیا۔ کچھ دیر انہیں تھانے میں رکھا گیا اور اس کے بعد انہیں پھر گاڑی میں بٹھا کر روانہ کر دیا گیا۔ آزاد سمجھ گیا کہ انہیں کسی دوسری جگہ لے جایا جا رہا ہے۔ رات ٹھنڈی بھی تھی اور تاریک بھی پولیس والوں اور حکمرانوں کے ذہنوں کی طرح۔ وہ ایک بازار میں پہنچے آزاد نے پہچان لیا یہ کھائیگلہ تھا۔ جونہی وہ دائیں طرف مڑے اسے اندازہ ہو گیا کہ انہیں پلندری جیل میں لے جایا جا رہا ہے۔ لیکن

تراڑکھل سے پلندری کی طرف مڑنے کی بجائے جیپ بائیں طرف مڑ گئی۔ اس نے سوچا شاید ان کی منزل کوٹلی ہے۔ تراڑکھل کراس کرنے کے بعد ان کی آنکھ لگ گئی۔ وہ پچھلے دو دن سے جاگ رہے تھے اور سفر کی تھکاوٹ اضافی تھی۔

رات کے ساڑھے تین بجے کا وقت تھا جب جیپ رک گئی۔ سپاہیوں نے اتر کر دروازہ کھولا اور خالد اور طاہر کی ہتھکڑیاں کھولتے ہوئے بولے۔

''تم لوگ اترو اور جاؤ، تمہارے لیے ضلع بدری کے احکامات ہیں''۔

یہ بات سن کر وہ بہت حیران ہوئے۔

''یہ اس وقت، اس جنگل میں کہاں جائیں گے بھائی صاحب۔ نہ آس پاس کوئی آبادی ہے نہ کوئی گاڑی''۔ آزاد نے اُن سے پوچھا۔

''تم اپنی خیر مناؤ، ان کو اپنے راستے پر جانے دو''۔ تھانیدار نے کہا۔

''کیا کر لو گے تم میرے ساتھ؟'' آزاد چلاّ اٹھا۔ 'کیا جرم کیا ہے میں نے، کوئی چوری کی ہے، ڈاکہ ڈالا ہے، قتل کیا ہے۔ تم کر کیا سکتے ہو۔ ساری زندگی کے لیے اگر بند رکھ سکتے ہو تو جو مرضی ان کے ساتھ سلوک کرو۔ لیکن یاد رکھو جس دن باہر آیا تمہارے ساتھ حساب برابر کیے بغیر گھر نہیں جاؤں گا۔ لاوارث سمجھ رکھا ہے کہ رات ساڑھے تین بجے اس جنگل میں انہیں اتار رہے ہو اور اعتراض کرنے پر دھمکیاں دے رہے ہو''۔

انہیں واپس گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ کافی دیر گاڑی وہیں رکی رہی۔ ایک ٹرک آیا تو انہیں اس پر سوار کر دیا گیا۔ آزاد کو واپس بلوچ چوکی پر لایا گیا۔ اسے ۱۱ دن تک اس چوکی میں چارپائی کے ساتھ باندھ کر رکھا گیا۔ یہ اس کی زندگی کے انتہائی تکلیف دہ دن تھے۔ سردار حنیف خان چوکی افسر تھے۔ انہیں آزاد سے ہمدردی تو تھی لیکن وہ کچھ نہیں کر سکتے تھے سوائے حوصلہ افزائی اور دلجوئی کے۔

''حنیف صاحب ان بدبختوں نے مجھے یہاں پر کیوں باندھ رکھا ہے۔ ان کے پاس تھانے کم پڑ گئے ہیں کیا''؟ آزاد نے پوچھا۔

''نہیں بیٹا تھانے تو کم نہیں پڑے۔' حنیف صاحب ہاتھوں کی انگلیوں سے اپنی داڑھی کو کنگی کرتے ہوئے بولے۔' تمہارا دراصل ان حکمرانوں سے واسطہ نہیں پڑا ہے۔ میں تو کہتا ہوں پتر انسان کے لیے دنیا میں حکومت سے بڑا فتنہ کوئی نہیں ہے۔ حیات خان بذاتِ خود بہت شریف انسان ہے۔ میں نے آج تک اس جیسا انسان نہیں دیکھا۔ لیکن یہ سیاست بڑی بدکردار لونڈی ہے۔ آدمی کو اپنا غلام بنا کر رکھ دیتی ہے۔ پھر خصوصاً جب اسے کوئی کرسی پر پہنچا ہوا آدمی مل جائے تو اس کے تو وارے نیارے ہو جاتے ہیں۔ وہ اسے اپنے اقتدار کو طول دینے کے نئے نئے طریقے سکھانا شروع کر دیتی ہے۔ اور آدمی بھی کرسی ہاتھ سے جانے کے خوف سے اس کی تابعداری کرنے لگتا ہے''۔

بابے کی باتیں بڑی دلچسپ تھیں، آزاد اسے چھیڑ کر سنتا رہتا تھا۔ بابا اس کی زنجیر ڈھیلی کر لیتا، پانی اور سگریٹ پلاتا۔

''یہ بابو ابراہیم ہے نا۔ تم نہیں جانتے ہو اِسے۔ کرسی سے تو اُتر گیا ہے لیکن لوگوں کے ذہنوں سے نہیں اُترا اور مر کے بھی نہیں اُترے گا۔ یاد رکھنا۔ حیات خان کو اِس بات کا اچھی طرح اندازہ ہے۔ بابو اُس سے ضرور بدلہ لے گا۔ اُس نے اِس کے خلاف تقریریں شروع کر دی ہیں۔ تُم بھی سنا ہے کوئی جلسہ جُلسہ کرنے جا رہے تھے راولاکوٹ''؟

''ہم نے تو اس سے پہلے بھی جلسے کیے ہیں''۔ آزاد نے جواب دیا۔

''تو کیا ہوا تھا''؟

تب تو خیریت ہی رہی تھی''۔

''مگر اب خیریت کا ٹیم نہیں ہے''۔اس نے کہا۔

''کیوں،اب کیا ہوگیا ہے''؟ آزاد نے پوچھا۔

''بھئی دیکھو سردار ابراہیم کو تو چنگاری کی تلاش ہے۔تیل ڈالنا تو وہ اچھی طرح جانتا ہے۔تمھیں نہیں پتا ہے نا بابو۔تمہاری عمر ہی کیا ہے۔کرنل شیر احمد خان سے پوچھو۔بھئی میرپور، کوٹلی میں جو مرضی کرتے رہو۔راولاکوٹ میں تمھیں کھلی چھٹی دینا حکومت کے لیے موت کے برابر ہے۔سمجھے''؟

''وہ تو میں سمجھ گیا حنیف صاحب لیکن میرا سوال تو یہ تھا کہ مجھے تھانے میں کیوں نہیں رکھتے یہ لوگ''؟ آزاد نے اپنا سوال دہرایا۔

''ہاں،اسی سوال کا جواب دینے کے لیے تو اتنی لمبی کہانی کی ہے۔'حنیف خان نے لمبا کالا بوٹ کھینچ کر اتارتے ہوئے کہا۔'دیکھو تمہارے ساتھی سارے آزاد کشمیر کے تھانے تلاش کر چکے ہیں۔ابھی تک انہیں تمہارا سراغ نہیں ملا۔جلسوں پہ جلسے کر رہے ہیں۔روز ہڑتالیں ہو رہی ہیں، کالج بند ہو رہے ہیں۔شور شرابا مچا ہوا ہے۔ایسے میں تمھیں کسی تھانے میں رکھنا مناسب نہیں۔مجھے لگتا ہے حکومت کو لڑکوں سے لڑنے میں مشکل پیش آ رہی ہے۔تازہ خون ہوتا ہے نا۔ اُبال پہ ہی رہتا ہے''۔

''آپ کا کیا خیال ہے حنیف صاحب سردار ابراہیم صاحب حیات خان کو اتارنے میں کامیاب ہو جائیں گے''؟ آزاد نے سوال کیا۔

''دیکھو بابو بات یہ ہے کہ سردار صاحب کے بس میں ہوتا تو حیات خان کو ایک دن بھی حکومت نہ کرنے دیتے۔لیکن مسئلہ یہ ہے ایک تو حیات خان نے کام بہت کروائے ہیں۔تم خود ہی ایمانداری سے بتاؤ۔میں نے تو اپنی زندگی میں کسی حکومت کو اتنے کام کرتے نہیں دیکھا۔کے ایچ خورشید نے کام کروائے تھے۔مگر حیات خان اسے پیچھے چھوڑ گیا ہے۔تمہارا کیا خیال ہے تم بھی تو سیاست کرتے ہو''؟ بابے نے پوچھا۔

''یہ بات تو ہے حنیف صاحب،اس میں تو اختلاف کی گنجائش نہیں''۔آزاد نے بابے

کی بات کی تصدیق کی۔

''اچھا تو اب سنو! اِس وجہ سے لوگ حیات خان کو دل سے چاہتے ہیں۔ گو کہ سردار ابراہیم کا پلہ اب بھی بھاری ہے لیکن حیات خان کو اپنے کاموں کا فائدہ تو مل رہا ہے کہ لوگ اس کے خلاف گرم نہیں ہو رہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جتنے ریٹائرڈ فوجی ہیں سب کے سب حیات خان کی پُشت پر ہیں۔ یہ بھی اس کو فائدہ جاتا ہے''۔

حنیف خان، ایک پولیس والا بڑا اچھا سیاسی تجزیہ پیش کر رہا تھا اور آزاد اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔

''لیکن اصل بات بتاؤں تمہیں؟ پیپل پاٹی کو حیات خان نے بہت مارا ہے اس میں کوئی شک نہیں۔ لیکن ساری پاٹی ابھی تک کھل کر اس کے خلاف جلسے جلوس اور ہڑتالیں کرنے کے حق میں بھی نہیں ہے''۔ بابے کی یہ بات آزاد کے لیے عجیب تھی۔

''یہ کیسے کہہ سکتے ہیں آپ''؟ اُس نے پوچھا۔

''ہاں یہی تو باریک نقطہ ہے۔ بھئی دیکھو پیپل پاٹی کے لوگ یہ بات سمجھتے ہیں کہ جب تک پاکستان میں ضیاء الحق ہے اور مارشل لأ لگا ہوا ہے، آزاد کشمیر میں جمہوریت نہیں آسکتی۔ سمجھ گئے بات''؟

بابے کی بات میں وزن ہے، آزاد نے دل ہی دل میں بابے کو داد دی۔

''اس لیے اگر بریگیڈئر حیات خان گیا تو کوئی اور بریگیڈئر آ جائے گا۔ اور کسی دوسرے بریگیڈئر کو لانے کے لیے لاتیں، مکّے، لاٹھیاں، گولیاں اور جیلیں کس لیے کھائیں۔ اب بھی سمجھ آئی ہے کہ نہیں''؟ حنیف خان نے اُس سے پوچھا۔

''یار حنیف صاحب آپ کو چوکی افسر نہیں ہونا چاہیے تھا''۔ آزاد نے کہا۔

''تو کیا ہونا چاہیے تھا''؟

''کرنل منشأ خان کی جگہ ہونا چاہیے تھا''۔ آزاد نے کہا۔

بابے کو پہلی مرتبہ غصہ آیا اور وہ دیر تک آزاد کو گھورتا رہا۔

''کوئی غلطی ہوگئی ہے حنیف صاحب''؟ آزاد نے پوچھا۔

''تم میرے مہمان ہو اس لیے معاف کر دیتا ہوں۔ تم کیا سمجھتے ہو چوکی افسر کا دماغ نہیں ہوتا؟ وہ لوگوں میں نہیں رہتا؟ وہ روٹی کی بجائے گھاس کھاتا ہے؟ وہ نہیں دیکھتا کہ ملک میں کیا ہو رہا ہے۔ اور کیا ہونے والا ہے''؟

''حنیف صاحب مجھے معاف کر دیں، میرا یہ مطلب نہیں تھا''۔ آزاد نے کہا۔

''مجھے پتہ ہے۔ دیکھو مجھے تمہاری اس بات پر غصہ آیا ہے کہ تم مجھے منشأ خان سے ملاتے ہو۔ یاد رکھو اگر کوئی آدمی باتیں کرتے کرتے آسمان پر اڑنے لگے تو اس کا یہ مطلب نہیں کے وہ اس وقت کے بڑے لوگوں کا ہمسر ہو جائے۔ منشأ خان ایک فوجی افسر، کمانڈر، سپیکر ہی نہیں ایک بڑا انسان بھی ہے۔ اور میں ایک بڑا آدمی ہونے کے ناطے اس کی عزت کرتا ہوں۔ ایک بات سن لو، یہ عہدے اور سیاست انسان کو پہچان تو دے دیتے ہیں۔ اُسے بڑا نہیں بنا سکتے۔ منشأ خان کے اندر جو انسان ہے نا اس کے سامنے ان عہدوں وغیرہ کی کوئی حثییت نہیں ہے''۔ حنیف خان نے اپنی بات مکمل کی اور اٹھ کر باہر چلا گیا۔

دوسری صبح وہ آیا تو کچھ بُجھا بُجھا سا تھا۔ بیٹھتے ہی بولا۔

''لو آزاد میاں تمہارا دانا پانی ہمارے ہاں سے اٹھ گیا۔ چلو اب تیاری کرو تمہاری رخصتی کا وقت آ گیا ہے''۔

''کِدھر بھیج رہے ہو حنیف صاحب''؟ آزاد نے پوچھا۔

''میر پور تو نہیں جا رہے، بس اتنا ہی مجھے پتا ہے''۔ حنیف خان نے کہا۔

کوئی دس بجے کے قریب اسے جیپ میں ڈال کر روانہ کر دیا گیا۔ بلوچ چوکی میں اس نے بڑی تکلیف دیکھی تھی لیکن حنیف خان سے جدا ہوتے وقت اس کے آنسو نکل آئے۔ تراڑکھل پہنچ کر اسے چوکی پر اتار لیا گیا۔

''اوئے غلام حسین......''۔ چوکی افسر نے آواز لگائی۔

''جی سر''۔ ایک مرِیل سا سپاہی اندر داخل ہوا۔

''وہ کوٹھی خالی کر کہ اِسے اندر کر دو''۔ چوکی افسر نے اسے حکم دیا۔

''ٹھیک ہے سر''۔ سپاہی جلدی سے باہر نکل گیا۔

آزاد نے جھانک کر باہر دیکھا وہ تیس چالیس بکریوں کو نکال کر ایک طرف ہانک رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد آزاد کو اُسی کوٹھڑی میں دھکیل دیا گیا۔ یہ حرکت جتنی انہونی تھی اُسی قدر سُرعت سے ہوئی۔ آزاد حیرت کے مارے بول تک بھی نہ سکا کہ اس کے ساتھ یہ کیا سلوک کیا جا رہا ہے۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ شوکت کشمیری جو اس کی تنظیم کا ایک ممبر تھا نے دیکھ لیا۔ وہ گیا اور کچھ اور دوستوں کو لے کر چوکی پر آ گیا۔

''کیا بات ہے بھئی''؟ چوکی افسر نے انہیں دیکھتے ہی سوال کیا۔

''ہم نے آزاد صاحب سے ملنا ہے''۔ شوکت نے کہا۔

''دیکھو شوکت یہ میرپوریے پونچھیوں اور سُدھنوں کے خلاف ہیں۔ تم انہیں نہیں جانتے اس لیے چھوڑو اپنا کام کرو''۔ چوکی افسر نے اسے جواب دیا۔

''بھائی صاحب نہ تو ہمارا تعلق پونچھ سے ہے، نہ سدھنوں سے۔ ہمارا تعلق این ایس ایف سے ہے اور یہ ہمارا صدر ہے۔ ہم اِسے کسی قیمت پر یہاں نہیں چھوڑیں گے''۔ شوکت نے کہا۔

اس پر ہنگامہ ہو گیا۔ بہت دیر تک پولیس اور لڑکوں کے درمیان تکرار ہوتی رہی۔ چوکی افسر سیانا آدمی تھا۔ اس نے نفری آنے تک لڑکوں کو الجھائے رکھا اور جب اس کی نفری پہنچ گئی تو اس نے لڑکوں پر حملہ کر دیا۔ خوب لڑائی مار کٹائی ہوئی بالآخر پولیس کا پلّہ بھاری ہو گیا۔ ۸/۱۰ لڑکے گرفتار ہو گئے جنہیں ہجیرہ تھانے میں بھیج دیا گیا۔

اس ہنگامے کا فائدہ یہ ہوا کہ آزاد کو فوری طور پر پلندری تھانے بھیج دیا گیا۔

''یا اللہ تیرا شکر ہے، میرے مولیٰ تو نے ان بدبختوں سے مجھے نجات دلائی ورنہ رات وہاں گزارنا پڑتی تو میرا کیا حشر ہوتا''۔ آزاد نے باہر نکلتے ہی چین کا سانس لیا۔

''توبہ توبہ، کتنے خوفناک لوگ ہیں'۔ آزاد نے ایک جُھرجُھری لی۔ 'آدمی کے ساتھ کچھ بھی کر سکتے ہیں یہ۔ اذیت دینے کے کیسے کیسے طریقے آتے ہیں ان کو۔ خدا دشمنوں کو بھی ان سے بچائے۔ کم بخت اگر یہ طریقے پیشہ ور مجرموں پر آزمائیں تو ان کی کیا جرأت ہے کہ دوبارہ تھانے کا منہ دیکھیں''۔

پورا راستہ وہ یہی کچھ سوچتا رہا۔ جب وہ پلندری پہنچا تو رات ہو چکی تھی۔ سیل کے اندر مکمل اندھیرا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ خلافِ توقع بہت اچھا بستر لگا ہوا ہے۔ شنیل کی چادر، رزائی، گاؤ تکیہ۔ اس کا ہاتھ بستر پر پڑی کسی چیز سے ٹکرایا۔ سگریٹ کے دو پیکٹ اور ماچس رکھی تھی۔

"یہ کیا ماجرا ہے"؟ اس نے سرگوشی کی۔ "شاید بھولے سے کسی افسر کے کمرے میں لے آئے ہیں"۔ اس نے سوچا۔

بہر حال وہ صورتحال کو سمجھنے سے قاصر تھا۔

اتنے میں مین گیٹ کھلا اور ایک آدمی اندر داخل ہوا۔ اس کے ایک ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے میں کھانے کے برتن تھے۔ وہ سیدھا کمرے میں آیا اور سلام دینے کے بعد بولا۔

"جناب یہ آپ کے لیے کھانا ہے"۔

پوری مرغی کی کڑاہی اور روٹیاں تھیں۔ آزاد کی حیرانگی میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

"یہ کیا ماجرا ہے بھئی، یہ بستر، کھانا یہ سب کچھ......"؟ آزاد نے سپاہی سے پوچھا۔

"جناب آپ خاموش رہیں۔ دراصل ہمارے تھانیدار صاحب کا بیٹا ہے اس نے ہمیں کہا تھا کہ آج ہمارے صدر صاحب آرہے ہیں تو آپ لوگوں نے ان کے لیے اچھا بندوبست کرنا ہے"۔ سپاہی نے جواب دیا۔

"نظریاتی تعلق بھی کتنا عجیب ہوتا ہے۔ میں اسے جانتا تک بھی نہیں لیکن اس نے کتنا خیال رکھا ہے"۔ آزاد کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔

ایک طرف تو یہ سلوک تھا اور دوسری طرف پورے آزاد کشمیر میں مظاہرے جلسے اور ہڑتالیں ہو رہی تھیں۔ راولاکوٹ میں حالات زیادہ خراب ہوئے۔ وہاں سے ۲۲ کے قریب لوگ گرفتار ہوئے جن میں قاری نثار، جاوید نثار، سردار عابد، سردار صدیق اور دیگر لوگ شامل تھے۔ ان سب لوگوں کو پلندری جیل میں رکھا گیا تھا۔ آزاد کو گرفتار ہوئے ۱۱ دن ہو گئے تھے۔ ایک دن سردار علی جو وہاں پر تحصیلدار اور قائمقام افسر مال بھی تھے آزاد سے ملنے آئے۔ خیر خیریت اور حال احوال لینے کے بعد انہوں نے اپنے کپڑے اُسے دیتے ہوئے کہا۔

"آپ یہ کپڑے پہن لیں اور اپنے کپڑے مجھے دے دیں۔ ہم دھلائی وغیرہ کروا دیں گے"۔

تحصیلدار صاحب رخصت ہوئے تو آزاد نے سوچا ضرور کچھ ہونے والا ہے۔ اتنے میں عبدالغفار انقلابی اور طارق عزیز ملاقات کے لیے پہنچ گئے۔ عبدالغفار انقلابی چیف آرگنائزر رہ چکے تھے اور اب لوکل گورنمنٹ میں سروس کرتے تھے۔ جبکہ طارق عزیز سابق صدر تھے اور اب میں محکمہ برقیات میں تھے۔ وہ کافی دیر اُس سے گپ شپ کرتے رہے۔ طارق عزیز نے اس سے کہا۔

"آزاد حالات کافی خراب ہیں۔ تم لوگ حیات خان کے خلاف بھی نعرے لگاتے ہو اور ضیاء الحق کے خلاف بھی کہ "ڈینگی مُوچھ، کانی اَکھ۔۔۔۔۔۔ ضیاء الحق ضیاء الحق"۔ یہ ساری رپورٹیں تمہیں پتا ہے اوپر تک جاتی ہیں۔ اس لیے ضیاء الحق کا حیات خان پر بڑا پریشر ہے وہ کہتے ہیں کہ ان لوگوں کو ہمارے حوالے کرو ہم ان پر قلعے میں تشدد کریں گے۔ لہٰذا آپ لوگ ایسا کرو کہ حیات خان کے ساتھ معاملات طے کرلو"۔

آزاد اُس کی بات پر بڑا حیران ہوا اور اس نے جواب میں کہا۔

"یار آپ لوگ بھی این ایس ایف میں رہے ہو۔ یہ آپ کون سا درس دے رہے ہو مجھے؟ قلعے میں تو ہمارے ہیرو مقبول بٹ رہے ہیں، ہاشم رہا ہے، اشرف رہا ہے، میر قیوم اور دیگر بے شمار لوگ رہے ہیں۔ اور آپ مجھے قلعے سے ڈرا رہے ہیں۔ یہ کام تو نہیں ہوگا مجھ سے۔ آپ خود دیکھو کتنے لوگ میرے اوپر اعتماد کر رہے ہیں اور میں گدھا ہوں گا جو اتنے لوگوں کے اعتماد کو ٹھیس پہنچاؤں گا۔ آپ ان سے کہیں کہ مجھے حوالے کر دیں۔ وطن کی آزادی کے لیے تو ہم مرنے کے لیے تیار ہیں تشدد کون سی بڑی بات ہے"۔

اسی اثنا میں طارق عزیز اٹھ کر واش روم میں چلا گیا۔ غفار انقلابی اُسے کہنے لگا۔

"یہ ویسے کہہ رہا ہے۔ حکومت ڈری ہوئی ہے اور حیات خان تمہارے ساتھ مذاکرات کے لیے آ رہا ہے"۔

انتظامیہ نے اسی دن پلندری ریسٹ ہاؤس کو سب جیل قرار دے کر آزاد کو وہاں شفٹ کر دیا۔ دوسرے دن صبح اس کے کپڑے بھی آ گئے۔ آج ہر طرف جہل پہل تھی۔ پولیس والے

چاک و چوبند کھڑے تھے۔مختلف محکموں کے افسران انتظامی امور کا جائزہ لینے کے لیے بھاگ دوڑ رہے تھے۔ٹائی سوٹ میں ملبوس ایک نوجوان دو ملازموں کو ڈانٹ رہا تھا۔تھوڑی ہی دیر بعد وہ دونوں ایک ٹین کا کنستر لیے سڑک کی طرف بھاگ رہے تھے۔سڑک پر پہنچ کر انہوں نے دونوں طرف کچی زمین پر چونا ڈالنا شروع کر دیا۔ایک نے جب چونے سے مٹھی بھری تو اڑتا ہوا چونا شاید دوسرے کی آنکھ میں چلا گیا۔اس کے ہاتھ سے چونا گر گیا اور وہ اپنا سر بازو پر رکھ کر بیٹھ گیا۔دوسرا اس پر جُھک گیا اور پھر بھاگتا ہوا ایک طرف گیا۔تھوڑی دیر بعد لوٹے میں پانی لیے واپس آیا اور اس کی آنکھوں پر چھینٹے مارنے لگا۔آزاد اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس کرسی ڈال کر دھوپ میں بیٹھا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔کیکر کے درخت پر ایک کوا کائیں کائیں کر رہا تھا۔صاف نیلے آسمان پر پرندے غول در غول اڑے جا رہے تھے۔خزاں رسیدہ درختوں سے چڑیاں اُڑ اُڑ کر دیوار کے پاس جمع ہو رہی تھیں۔جنگلی مینائیں کسی بات پر آپس میں لڑ رہی تھیں اور ان کے شور شرابے نے چڑیوں کی چُوں چُوں دبا رکھی تھی۔

مقامی معززین بھی جمع تھے اور ان کی تعداد میں رفتہ رفتہ اضافہ ہو رہا تھا۔خزاں کی ٹھنڈی دھوپ ان کے جُوتوں اور خُوشی ان کے چہروں پر چمک رہی تھی۔قراقلی ٹوپیاں ان کے وقار میں اضافہ کر رہی تھیں اور ہاتھوں میں اٹھائی لاٹھیاں ان کے مزاج کا پتہ دیتی تھیں۔وہ ٹولیوں میں بٹے باتیں کر رہے تھے۔دو ملازم لوہے کے اونچے پول سے لٹکتی رسی پر جھنڈا باندھ رہے تھے۔اچانک وہ دوسری طرف متوجہ ہو گئے،شاید کسی نے انہیں آواز دی تھی۔وہ خاموشی سے کھڑے ہو گئے۔ایک آدمی نے معززین سے جا کر کچھ بات کی جس پر وہ سب آہستہ آہستہ آ کر پول کے پاس جمع ہو گئے۔سب نے مل کر ایک آدمی کو آگے کیا۔وہ ادھیڑ عمر کا ایک دراز قد آدمی تھا۔لال سُرخ چہرے پر سیاہ شیروانی اور سفید پگڑی میں وہ بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔اس نے جھنڈے کے ساتھ بندھی رسی پکڑ کر کھینچی،آزاد کشمیر کا جھنڈا اوپر کی طرف سرکنا شروع ہو گیا۔پھر اس نے رسی اپنے ساتھ کھڑے دوسرے آدمی کے ہاتھ میں دی اور خود ذرا فاصلے پر لاٹھی سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔دوسرے آدمی نے بھی پہلے کی تقلید کی اور یوں مجمعے میں کھڑے آخری آدمی نے جب رسی کھینچی تو جھنڈا پول کے آخری سرے پر پہنچ چکا تھا۔پرچم اب ایک جگہ پر رُک کر ہوا میں

لہرا رہا تھا۔اس منظر نے آزاد پر عجیب کیفیت طاری کر دی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ رونا شروع ہو گیا اور دیر تک روتا رہا۔ پھر اسے باہر کی خبر نہ رہی۔
اب دُھوپ کھڑکی سے ذرا ہٹ گئی تھی۔دروازے پر دستک ہوئی تو وہ چونک پڑا۔
''یس کم اِن''۔
افسر مال صاحب کمرے میں آئے اور کہا کہ صدرِ ریاست آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔
آزاد اس کے ساتھ چل دیا۔ یہ ایک وی آئی پی کمرہ تھا جس میں اعلیٰ درجے کا قالین بچھا ہوا تھا۔ مشرق کی سمت سے دھوپ کی کرنیں کمرے سے الوداع ہو رہی تھی۔لال رنگ کے پردے سمٹ کر خاموش کھڑے تھے۔جنوب کی طرف ایک بالکونی تھی جس میں چند کرسیاں پڑی تھیں۔اور اس سے آگے دور حدِ نگاہ تک پہاڑوں اور وادی میں گاؤں پھیلے ہوئے تھے۔
وہ ایک صوفے میں دھنس کر بیٹھ گیا۔تقریباً دس منٹ بعد بریگیڈیئر حیات خان جو آزاد کشمیر کے صدر بھی تھے تشریف لائے۔آزاد نے اٹھ کر سلام کیا۔صدر صاحب نے گرم جوشی ملتے ہوئے اُسے خوشخبری سنائی۔
''آزاد مبارک ہو،آپ ایل ایل بی کے امتحان میں پاس ہو گئے ہیں''۔
حیات خان ایک خوش اخلاق اور منکسر المزاج انسان تھے۔آزاد کے ذہن میں ان کا جو نقشہ تھا وہ اس کے برعکس نکلے۔
''آپ بتائیں کون سی نوکری کریں گے۔جو بھی نوکری آپ کرنا چاہیں آپ کو دیں گے''۔صدر صاحب نے اسے کہا۔
''سر میرے والد صاحب مجھ سے ناراض رہتے تھے کہ تم پڑھتے نہیں ہو سیاست کرتے ہو۔ اب میں پڑھائی سے فارغ ہو گیا ہوں، اب تو میرا مسلہ ہی حل ہو گیا ہے''۔ آزاد نے جواب دیا۔
اس پر صدر نے اسے کہا۔
''دیکھو آزاد سیاست آپ افورڈ نہیں کرتے اس لیے کہ سیاست کے لیے پیسہ چاہیے۔آپ کے والد ٹیلرنگ کا کام کرتے ہیں اور آپ کے دس بہن بھائی ہیں۔انہیں آپ کی

مدد کی ضرورت ہے۔ بہتر ہے کہ آپ سروس جائن کر لیں۔ اچھی سے اچھی نوکری آپ کو مل جائے گی۔ آپ کا اور آپ کی نسل کا مستقبل سنور جائے گا"۔

"غلام نسل کا مستقبل نوکریوں کے مل جانے سے سنور جاتا ہے صدر صاحب"؟

آزاد کے اس سوال پر حیات خان چونک پڑے، انہوں نے صوفے پر پہلو بدلا اور کہا۔

"ہمارے بس میں جو کچھ ہے وہ کر رہے ہیں۔ اگر آپ سیاست ہی کرنا چاہتے ہیں تو میرے لیے خوشی کی بات ہے۔ جتنا پیسہ آپ چاہیں آپ کو ملے گا۔ میں ابھی میرپور میں بریگیڈئر کو فون کرتا ہوں وہ آپ کو پلاٹ الاٹ کر دے گا"۔

"نہیں جناب، یہ نہیں ہو سکتا۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ میں اپنے دوستوں کے اعتماد کو ٹھیس پہنچاؤں"۔ آزاد نے جواب دیا۔

"آپ سوچ لیں"۔

"اس میں سوچنے کی بھی گنجائش نہیں ہے"۔ آزاد نے مکمل انکار کر دیا۔

"ٹھیک ہے اگر آپ کو یہ منظور نہیں ہے تو ہمارے ساتھ معاہدہ کر لیں"۔ صدر نے کہا۔

"جناب صدر آپ ہمارے ساتھ کیا معاہدہ کرنا چاہتے ہیں۔ آپ ہمیں اتنا ہی بتا دیں کہ ہمیں کس جرم میں گرفتار کیا گیا ہے۔ نہ ہم نے کوئی قانون توڑا ہے، نہ کسی کو کوئی نقصان پہنچایا ہے، نہ حکومت کے خلاف کوئی سازش کی ہے"۔

"دیکھئے ریاست کے حالات اس وقت ٹھیک نہیں ہیں۔ میں مانتا ہوں آپ لوگ حکومت کے خلاف کوئی سازش نہیں کر رہے۔ لیکن وہ لوگ جو حکومت کے خلاف مسلسل سازشوں میں مصروف ہیں آپ کے جلسے جلوسوں سے ان کو فائدہ پہنچ رہا ہے"۔ صدر نے کہا۔

"لیکن اس کے باوجود یہ کوئی جرم تو نہیں ہے، الا یہ کہ ہم کسی سازش کا حصہ ہوں"۔ آزاد نے کہا۔

"ٹھیک ہے لیکن اس پر بات تو ہو سکتی ہے"۔ صدر نے کہا۔

"بات کرنے پر تو مجھے کوئی اختلاف نہیں ہے۔ لیکن میں گذشتہ پندرہ دن سے گرفتار ہوں۔ میں حالات سے لاعلم ہوں۔ میرے بیشتر ساتھی بھی جیلوں میں ہیں۔ ان حالات میں

کیسے بات ہو سکتی ہے"۔آزاد نے کہا۔

"تو آپ اپنے ساتھیوں کی رہائی چاہتے ہیں"؟صدر نے پوچھا۔

"رہائی کا معاملہ اپنی جگہ پر ہے۔لیکن میں اکیلا تو آپ کے ساتھ کوئی بات نہیں کر سکتا"۔آزاد نے جواب دیا۔

"تو ٹھیک ہے آپ جن ساتھیوں سے مشورہ کرنا چاہتے ہیں ان کے نام دے دیں ہم انہیں بلا لیتے ہیں"۔صدر نے کہا۔

آزاد نے تمام اضلاع سے دو دو نام دے دیے۔وہ مرکزی عہدیدار اور ضلعی صدور تھے۔صبح یہ نام انتظامیہ کو دیے گئے شام تک تمام لوگ پلندری پہنچ گئے۔پلندری جیل میں جو لوگ تھے ان سب کو بھی بلا لیا گیا۔انہوں نے میٹنگ کی اور طے کیا کہ حکومت نے جو بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی کی ہے اس پر معافی مانگے۔صدر نے جب ان کی شرط مان لی تو وہ صدر کی شرافت کے قائل ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔بلکہ حیات خان تحریری طور پر لکھ کر دینے کے لیے تیار ہو گئے۔لیکن اسی دوران راجہ نیاز وہاں پہنچ گئے۔انہوں نے صدر سے کہا کہ جناب آپ کو یہ کام کسی صورت نہیں کرنا چاہیے۔اس وقت سری نگر والوں کے منہ پاکستان کے خلاف کھلے ہوئے ہیں۔ایسے حالات میں یہ بہت بڑی بات ہوگی کہ صدر نے طلبہ سے ان کی گرفتاری پر معافی مانگی۔اس پر آزاد اور اس کے ساتھیوں نے کہا۔

"جناب ہمیں واپس جیلوں میں بھیج دیں۔ماریں تشدد کریں،جو مرضی ہمارے ساتھ سلوک کریں ہم اس طرح باہر نہیں جائیں گے"۔

اس پر صدر بہت پریشان ہوئے۔اتنے میں کچھ اور لوگ بھی مذاکرات میں شامل ہو گئے۔انہوں نے کہا۔

"آپ اخبار میں دیں کہ صدرِ حکومت نے این ایس ایف کے صدر سے معافی مانگ لی ہے۔ہم اس کی تردید نہیں کریں گے"۔

"اس بات کی کیا گارنٹی ہے؟ ہمارے جیل سے باہر جانے کے بعد آپ کی طرف سے تردید آ سکتی ہے"۔آزاد نے کہا۔

''ہم آپ کو یقین دھانی کرواتے ہیں کہ ہماری طرف سے اس طرح کی گھٹیا حرکت ہر گز نہ ہوگی۔ہم آپ کو اخبار میں خبر آنے کے بعد رہا کریں گے''۔

اس کے بعد مذاکرات ختم ہو گئے۔خبر ڈرافٹ کر کہ اخبارات کو بھیج دی گئی اور اخبارات میں آنے کے بعد وہ تمام لوگ باہر آئے۔جیل سے باہر آتے ہی پلندری سے نیچے ایک نالے کے قریب انہوں نے پھر میٹنگ کی اور یہ طے کیا کہ کنونشن راولاکوٹ میں ہی ہوگا۔سردار مشتاق (سابق سیکریٹری) نے ان پر بہت زور لگایا کہ آپ کنونشن راولاکوٹ کے علاوہ کسی دوسری جگہ پر کرو۔اس کے تمام تر اخراجات حکومت کرے گی۔لیکن وہ اس پر راضی نہ ہوئے اور کنونشن راولاکوٹ میں ہی طے ہوا۔

اب انہیں ایک اور بڑا مسلہ درپیش تھا۔اس سے پہلے کنونشن کے لیے جو رقم جمع ہوئی تھی وہ ۱۵/۲۰ دن کے اندر ختم ہوگئی اور کنونشن ابھی باقی تھا۔آزاد کو دوسری مرتبہ لوگوں کے پاس جانے میں بڑی مشکل پیش آرہی تھی۔آخر اس نے ہمت کی اور دوبارہ لوگوں کے پاس جا کر انہیں صورتحال سے آگاہ کیا اور انہیں بتایا کہ کنونشن کے لیے پھر پیسے درکار ہیں۔میر خالد کے والد اڈے پر ہوٹل کرتے تھے اور کٹر مسلم کانفرنسیے تھے۔آزاد جب ان کے پاس گیا تو انہوں نے اپنا سیف کھولا اور منہ دوسری طرف کر لیا۔

''پُتر اجتنے پیسے چائیدے نی کھڈ لے تو اَساں نی عزت رکھی تے آیا ایں''۔

دراصل اسی سال مسلم کانفرنس نے بھی آزاد کشمیر میں فوجی حکومت کے خلاف احتجاج وغیرہ کیا تھا جس میں میر پور سے ان کے دو لیڈر گرفتار ہوئے تھے۔انہیں بھی پلندری جیل میں رکھا گیا تھا جہاں تمام سٹاف مسلم کانفرنس کا تھا۔اس لیے وہاں انہیں ہر طرح کی سہولتیں بھی میسر تھیں لیکن وہ جیل میں نہ رہ سکے اور حیات خان سے معافی مانگ کر آئے تھے۔جس کی وجہ سے میر پور کے لوگ ان سے سخت نالاں تھے۔یہی وجہ تھی کہ وہ آزاد کی عزت کرنا شروع ہو گئے تھے۔میر پور کے لوگوں نے انہیں پہلے سے زیادہ چندہ دیا۔جس نے پچاس دیا تھا اس نے سو اور جس نے دوسو دیا تھا اس نے پانچ سو روپیہ دیا۔اعظم راٹھور صاحب اڈے پر گاڑیوں کے ٹکٹ کاٹتے تھے انہوں نے دراز کھولا اور کہا۔

''پر ہاواتو تے عزت رکھی تے آیا ایں میر پور والیاں نی وی تے سارے سیاسی کارکناں نی۔ اے پیسے نی، جتنے مرضی کھڈ لے''۔

آزاد کی آنکھوں میں آنسو اتر آئے۔ اسے لوگوں نے جتنی عزت دی اس کی وہ توقع نہیں کر رہا تھا۔ گوکہ این ایس ایف کبھی بھی صرف طلبہ کے مسائل یا آزادی کے نعروں تک محدود نہیں رہی بلکہ وہ محنت کش عوام کے مسائل کو حل کرنے میں ان کے شانہ بشانہ جدوجہد کرتی رہی۔ یہی وجہ تھی کہ جب بھی وہ کوئی ہڑتال کرتے، جلسہ جلوس ہوتا، شہر بھر کے مزدور، رکشے والے اور تاجران کے ساتھ ہوتے۔ لیکن اب کی بار لوگ اس پر اس لیے نچھاور ہو رہے تھے کہ اس نے ایک مضبوط کردار کا مظاہرہ کیا تھا۔ لوگ اچھی طرح سے جانتے تھے کہ حکومت نے اس کی بولی لگائی ہو گی لیکن اس نے انکار کر دیا۔ اسی ایک انکار نے اسے معتبر کر دیا تھا۔ سارے میر پور شہر کی زمین اس اعتبار اور عزت کے سامنے ہیچ تھی۔

ایک آدمی نے آزاد اور اس کے ساتھیوں سے کہا۔

''کردار بڑی انمول چیز ہے بیٹا۔ ساری دنیا مل کر بھی اس کی قیمت ادا نہیں کر سکتی۔ تم جس شخص کو اپنا قائد مانتے ہو اس نے ذوالفقار علی بھٹو کی پیشکش پر کہا تھا کہ ہماری منزل کشمیر کی آزادی ہے آزاد کشمیر کی وزارتِ عُظمیٰ نہیں۔ یہی کردار تمہاری میراث ہے۔ دولت کی کوئی حثیت نہیں۔ دنیا میں ایسے لوگ بھی گزرے ہیں جنہوں نے حکومتوں کو قرض دیے مگر تاریخ میں ان کا کوئی ذکر نہیں۔ کردار کبھی مرتا نہیں، ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ تاریخ کبھی اسے فراموش نہیں کرتی۔ قومیں کردار پہ زندہ رہتی ہیں۔ جو قومیں اپنا کردار باقی نہیں رکھ سکتیں فناہ ہو جاتی ہیں، غیروں کی چراگاہ بن جاتی ہیں''۔

آزاد اور اس کے ساتھیوں کو لوگوں نے ڈیڑھ لاکھ روپے چندہ دیا۔ کنونشن کے بعد بچ جانے والی رقم انہوں نے نئی کابینہ کو دے دی۔



نذیر حسین شاہ کی پریشانی دن بدن بڑھتی اور صحت گرتی جا رہی تھی۔ اس کی بیوی کا بھی یہی حال تھا۔ دونوں لڑکی کے غم میں مرے جا رہے تھے۔ بیٹیاں جب جوان ہوتی ہیں تو ماں باپ سُولی پہ لٹک جاتے ہیں۔ تب اترتے ہیں جب وہ بابل کے دیس سے رخصت ہو جاتی ہیں۔

''بیٹی خدا کی رحمت ہوتی ہے' عارفہ بولی 'لیکن ہمارے لیے تو اللہ نے اسے آزمائش بنا دیا ہے''۔

''خدا کو کیوں قصوروار ٹھہراتی ہو'؟ شاہ جی نے اعتراضاً کہا' قصور تو اپنا ہے کہ اسے کالج تک لے کر گئے۔ دنیا کی تعلیم اور ماحول نے اپنا اثر تو دکھانا ہی تھا۔ انگریز کی تعلیم کا شرم و حیا سے کیا تعلق۔ یہ تو حیا کے لباس کو تار تار کر کے رکھ دیتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بیٹیاں خدا کی رحمت ہوتی ہیں لیکن دین کے مطابق ان کی تربیت بھی بڑی ضروری ہوتی ہے''۔

''آپ کو ہی تو شوق تھا اسے پڑھانے کا۔ میرا دل تو اسی دن کانپ اٹھا تھا جب یہ جارجٹ کا دوپٹہ اوڑھ کر گھر سے نکلی تھی''۔ عارفہ نے کہا۔

''بس غلطی ہو جاتی ہے نا آدمی سے'۔ شاہ جی نے آہستہ آہستہ اپنے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔' آدمی جب بھولتا ہے تو پھر دیکھو کہاں کا کہاں پہنچ جاتا ہے۔ کبھی سر نیچا کر کے نہیں چلا ہوں۔ اب نظر اٹھانے کے قابل نہیں رہا''۔ آنسو شاہ جی کی ناک پر بہہ رہے تھے۔

عارفہ اٹھی، اس نے لالٹین کی بتّی اوپر کی اور مٹی کے گھڑے سے پانی انڈیل کر شاہ جی کو دیا۔

''حالات اللہ کی طرف سے ہی آتے ہیں۔ دعا کریں وہ ہمارے حال پر رحم کرے''۔ عارفہ نے اسے ایک طرح کی تسلّی دی۔

""اپنی کمائی کو اللہ کے کھاتے میں کیسے ڈال دوں""؟ شاہ جی نے بے بسی میں کہا۔

""ایسی بھی کوئی بات نہیں شاہ جی۔ رفعت اکیلی ہی تو نہیں تھی کالج میں۔ زمانے بھر سے الگ ہو کر کیسے رہ سکتا ہے کوئی۔ معصوم تھی غلطی کر بیٹھی ہے۔ اب کیا کریں۔ اللہ سے معافی مانگ رہے ہیں دن رات، مدد بھی مانگ رہے ہیں۔ دے دے تو کیا جائے گا اُس کا""۔

عارفہ کی یہ بات اس کے دل کو لگی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اُس نے جُھر جُھری سی لی اور کہا۔

""تم بھی ٹھیک کہتی ہو عارفہ۔ لیکن تمہیں کیا بتاؤں لوگ کسی کیسی نظروں سے مجھے دیکھتے ہیں""۔

""آپ لوگوں کی نظروں کی بات کرتے ہیں۔ مجھے تو لوگوں کی باتوں اور طعنوں کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پہلی بار اندازہ ہوا ہے کہ عورت ذات اتنی کمینی بھی ہو سکتی ہے""۔ عارفہ نے کہا۔

""صبر کرو، اب صبر کے علاوہ کوئی چارہ نہیں""۔ شاہ جی نے اسے تسلی دی۔

""صبر ہی ہے ہمارا، سوائے صبر کے کر ہی کیا سکتے ہیں ہم""۔ اُس نے اپنا پلّو دونوں ہاتھوں پر اٹھا کر آگے کر دیا۔ ""اُسی سے ہمارا سوال ہے۔ چور کی ماں چھپ چھپ کر روتی ہے شاہ جی۔ چھپ چھپ کر روتی ہے""۔ وہ زار و قطار رو رہی تھی۔

رفعت کو کالج سے فارغ ہوئے دو سال ہونے والے تھے۔ اس دوران بہت سے رشتے آئے مگر ایوب کے معاملے کی بھنک پڑنے کے بعد لوگ کنارا کر لیتے۔ دو جگہوں پر تو بات پکی ہونے کے بعد لڑکے والے پیچھے ہٹ گئے تھے۔ حالانکہ ایوب کا اس میں کوئی قصور نہ تھا۔ اس نے اشارۃً بھی کسی سے کوئی ذکر نہیں کیا۔ لیکن لوگ معاملے کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے اور طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرتے۔ عورتوں کے مابین تو کوئی بات پرانی ہوتی ہی نہیں۔ وہ ہر وقت گڑھے مردے اکھاڑتی رہتی ہیں۔ دراصل یہ کام بھی عورتوں کا ہی خراب کیا ہوا تھا۔ عورت کے ہاتھ میں ایک دیا سلائی دے دو پورے شہر کو جلا کر راکھ کر دیں گی۔ ایک آدھ لڑکی کے مستقبل کا فیصلہ کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے اور یہ کھیل وہ پچھلے دو سال سے کھیل رہی تھیں۔ وہ اس میں کامیاب تھیں اور اس کامیابی پر خوش بھی۔

""بیٹھی رہے اب ماں باپ کے گھر میں۔ جب چوہدری کے لڑکے کے ساتھ گُل چھرّے اڑاتی تھی اس وقت اسے خیال نہ تھا کہ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا""؟ برکتی خالہ نے کہا۔

''سیّدانی تو بڑی بن بن کہ بیٹھتی تھی۔ کہتی تھی اس کی لڑکی تو اب کالج پڑھتی ہے۔ پڑھ کر پروفیسر لگے گی''۔ عظمت چاچی بولی۔

''لگ گئی نا پھروفیسر''۔ برکتی خالہ نے لقمہ دیا۔

''اسی لیے تو میں نے اپنی ایک بھی بیٹی کو کالج کی شکل تک نہیں دیکھنے دی۔ اپنی عزت سے کوئی چیز پیاری نہیں ہے۔ مگر لوگوں کی عقل میں یہ بات نہیں آتی''۔ عظمت چاچی نے اپنی تھیوری پیش کی۔

''بھئی میں تو کہتی ہوں لڑکیاں ہمیشہ ماں پر جاتی ہیں۔ اس بچاری کا کیا قصور''؟ نصیر جان نے اپنا حصہ ڈالا۔

''بات تو پتے کی کی ہے اِس نے''۔ برکتی خالہ نے عظمت چاچی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''سنا ہے آج کل کوئی رشتے کی بات چل رہی ہے''؟ عظمت چاچی نے پوچھا۔

''کون ہے ذرا پتہ تو چلاؤ''۔ برکتی خالہ نے کہا۔

''بڑی کوشش کی ہے لیکن ابھی تک پتہ نہیں چلا'۔ عظمت چاچی بولی۔ 'نُوری تو زمین کے نیچے سے بھی خبر نکال لیتی ہے لیکن اس دفعہ اُسے کچھ دیر لگ گئی ہے''۔

''پتہ نہیں کون شریف لوگ ہیں بچارے؟ بے خبری میں مارے نہ جائیں''۔ برکتی خالہ کو اُن سے ہمدردی ہو رہی تھی۔

''فکر نہیں کرو جب تک نصیر جان زندہ ہے، اپنے محلے میں کسی کے ساتھ دھوکہ نہ ہونے دے گی'۔ نصیر جان نے اٹھتے ہوئے کہا۔ 'چلتی ہوں ابھی بہت کام پڑا ہے گھر پہ''۔

ابھی مشکل سے ایک مہینہ بھی نہیں گزرا تھا کہ عظمت چاچی کی بڑی لڑکی غائب ہوگئی۔ کچھ دن تو بات چھپی رہی مگر عظمت چاچی کے زیرِ زمین چلے جانے کے بعد بات کھل گئی۔ ہفتہ بھر تو یونہی تلاش جاری رہی۔ پھر پولیس میں رپورٹ لکھوا دی گئی۔ لیکن پولیس بھی لڑکی کو برآمد کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ کچھ عرصے کے بعد البتہ خبر ملی کہ لڑکی دوسرے محلّے کے ایک قصاب کے ساتھ کراچی میں ہے۔

رفعت نے اپنی ایک ٹیچر کے کہنے پر پرائیویٹ طور پہ ایم اے کی تیاری شروع کردی تھی۔ پڑھائی میں مشغولیت کی وجہ سے وہ کافی حد تک نارمل ہوگئی تھی۔ لیکن داغ جو لگ جاتا ہے، دل پہ لگے چاہے دامن پہ، اثر دکھائے بنا نہیں رہتا۔ دل کی لگی کو انسان چھپا بھی لے دامن کو کیسے چھپائے۔ یہ جُرم ہی ایسا ہے کہ جتنی سزا ملے کم ہے۔ مگر سزاؤں کے باوجود اس میں کمی نہیں آئی۔ جانے کیوں لوگ اس سے باز نہیں آتے۔ حالانکہ ذلت و رسوائی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ رفعت نے تو اس کے ساتھ ساتھ اب ماں باپ کے غم کو بھی سینے سے لگا لیا تھا۔ کبھی کبھی وہ خود کو چور سمجھنے لگتی تھی۔ ماں باپ کی، بہن بھائیوں کی چور، خاندان کی چور...... زمانے بھر کی چور! وہ کہیں کی بھی نہیں رہی تھی۔ زمانہ تو اُسے ٹھکانے بھی نہیں لگنے دے رہا تھا۔ یہ سب سے بڑا انتقام تھا جو اس سے لیا جا رہا تھا۔ حالانکہ ٹھکانے لگنا بھی سزا ہی کی ایک شکل ہے لیکن اس کا بھی دُور دُور تک کوئی امکان نہیں تھا۔

نسرین کی شادی کے بعد وہ زیادہ تنہا ہوگئی تھی۔ شادی کے بعد ایک سال کے دوران وہ صرف دو دفعہ ہی اس سے مل سکی تھی۔ وہ اس کے حالات سے باخبر بھی تھی اور ان کی وجہ سے پریشان بھی۔ اس نے اپنے خاوند سے اس پریشانی کا ذکر کرنا چاہا لیکن اسے ہمت نہ ہوئی۔ اتفاق سے اس کے خاوند کا ایوب سے اچھا تعلق تھا۔ اور وہ سمجھتی تھی کہ اس کے ذریعے سے اس مسئلے کا کوئی حل نکالا جا سکتا ہے۔ لیکن وہ ہر بار یہ سوچ کر خاموش ہو جاتی کہ اس کا خاوند اگر یہی پوچھ لے کہ ایسی خراب عورت سے اس کا کیا تعلق ہے تو وہ کیا جواب دے گی۔ لیکن ایوب بھی تو اتنا ہی خراب آدمی ہے......! جس دن یہ بات اس کی سمجھ میں آئی اسی دن اس نے اپنے خاوند سے ساری بات کی اور اسے کہا کہ اس مسئلے کا کوئی حل نکالے۔

''اس بارے میں میں نے پہلے بھی بہت کچھ سن رکھا ہے لیکن میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں''؟ حفیظ نے پوچھا۔

''آپ ہی سوچئے، مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آرہی''۔ نسرین نے جواب دیا۔

''پھر بھی، آخر تمہارے ذہن میں کوئی تو بات ہوگی''؟ حفیظ نے اسے کریدنا چاہا۔

''دیکھیے، یہ بات تو طے ہے کہ رفعت کو اس کے والدین ساری زندگی گھر بٹھا سکتے ہیں،

ایوب کو نہیں دے سکتے۔ اور جب تک ایوب کی شادی نہیں ہو جاتی، رفعت بھی گھر بیٹھی رہے گی"۔ نسرین نے جواب دیا۔

"تو تمہارا مطلب ہے کہ ایوب کی شادی کروائی جائے"؟ حفیظ نے پوچھا۔

نسرین نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے ہاں میں سر ہلایا۔

"یہ تو بہت ٹیڑھا کام ہے۔ میں کافی عرصے سے اس سے ملا بھی نہیں ہوں۔ پتہ نہیں اس کا اپنا کیا ارادہ ہے"؟ حفیظ نے اپنی مجبوری ظاہر کی۔

"شادی تو ایک نہ ایک دن اس نے کرنی ہی ہے، اور یہ بالکل سیدھا کام ہے"۔ نسرین نے کہا۔

"ہاں لیکن ایوب کو تم نہیں جانتی۔ میرے خیال میں فی الوقت تو وہ کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں ہوگا"۔

دونوں خاموش ہو گئے۔

"ایک کام ہو سکتا ہے"۔ کافی دیر بعد حفیظ بولا۔

"وہ کیا"؟

"اگر رفعت راضی ہو جائے تو دونوں کی کورٹ میرج کروا دیں"۔ حفیظ نے تجویز پیش کی۔

نسرین نے اپنی انگلی دانتوں میں لے لی مگر منہ سے کچھ نہ بول سکی۔ وہ دیر تک حفیظ کے چہرے پہ نظریں گاڑھے بیٹھی رہی۔

"تم تو بہت ہی حیران ہو رہی ہو" حفیظ نے کہا "جہالت اور فرسودگی کا مقابلہ گھر بیٹھے نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے قربانی تو دینا پڑے گی۔ دیکھو ہمارے سماج کے چہرے پہ صدیوں کی جمی یہ میل اگر عورت کے آنسو دھو سکتے تو یہ چہرہ آج چودھویں کے چاند سے زیادہ روشن ہوتا"۔ حفیظ کے لہجے میں دکھ بھی تھا اور اعتماد بھی۔

"آپ کی بات درست ہے مگر ہمارے سماج کی عورت اپنے نفس کی پیروی پر سفّت اسماعیلی کو ترجیح دیتی ہے"۔ نسرین کا سر فخر سے بلند تھا۔

"پھر تو بات ہی ختم ہو گئی"۔

''بات تو ختم ہی ہے مگر ناپاک جو ہوگئی ہے ایوب سے ملنے کے بعد، کوئی اسے قبول ہی نہیں کرتا''۔ نسرین نے جواب دیا۔

طنز کا یہ تیر حفیظ کے دل و دماغ کے ساتھ اس کی روح کو بھی زخمی کر گیا۔ نسرین کی بات اس قدر تلخ اور نا قابلِ تردید حقیقت تھی کہ اگر ارسطو اور سقراط بھی زندہ ہوتے تو اس کا جواب نہ دے پاتے۔ وہ کئی روز تک اس زہر کے گھونٹ پیتا رہا۔ دراصل اس ایک بات نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ہوش سنبھالنے سے لے کر آج تک اسے اپنے مرد اور ایک باغیرت آدمی ہونے پر فخر تھا، آج اسے اپنے آپ سے نفرت ہو رہی تھی۔ مرد کی ذات سے اٹھنے والی بدبو کے بھبھوکوں سے اس کا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ گھر سے لے کر بازار تک عورت کے جتنے غیر فطری و غیر انسانی رُوپ و کردار ہیں، ان سب کا خالق مرد ہے۔ یہ مرد کا ایک ایسا کردار ہے جس نے انسانیت کا منہ کالا کر کے رکھ دیا ہے۔ اس مسئلے پر سوچنے سے اس کے سر میں درد ہونا شروع ہو جاتا اور وہ بے بس ہو کر سر جھٹک دیتا۔

''آخر ایوب سے بات کرنے میں حرج ہی کیا ہے''؟ کئی بار اس کے ذہن میں یہ خیال آیا لیکن اسے ایوب سے بات کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ دوسری طرف اس معاملے پر نسرین کی خاموشی بھی اس کا منہ چڑا رہی تھی۔ اپنی ناکامی یا شکست کے احساس کے کانٹے اس کے دل و دماغ میں کھُب گئے تھے۔ فرصت کے لمحات میں دلیل کی سوئی سے وہ ان کانٹوں کو نکالتا رہتا مگر اگلی رات ان میں زیادہ اضافہ ہو جاتا۔ اب تو اس کا چہرہ بھی اندر کی کیفیت کو چھپانے میں ناکام ہو رہا تھا۔ بالآخر اس نے دیوار سے سر ٹکرانے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ ایوب سے اس نے ساری تفصیل بتائی تو اس نے پوچھا۔

''کہنا کیا چاہتے ہو، صاف صاف بتاؤ''؟

''اگر تم شادی کر لو تو سارا مسئلہ ہی حل ہو جائے گا''۔ حفیظ نے کہا۔

''مگر تم تو خود ہی کہہ رہے ہو کہ وہ رشتہ نہیں دے سکتے''۔ ایوب نے جواب دیا۔

''میرا مطلب ہے کسی دوسری جگہ سے''۔ حفیظ نے نحیف سی آواز میں کہا۔

ایوب کے چہرے پہ خاک اڑنے لگی اور اس کی وہ آخری امید جو دل کے تہہ خانے میں

ابھی تک باقی تھی، اس کا دم گھٹنے لگا۔ اس کی آنکھیں ڈوبتے سورج کے ساتھ دُور افق میں کہیں اپنا ٹھکانہ تلاش کر رہی تھیں۔ اس کے حلق میں کانٹے چبھے ہوئے تھے اور بات منہ سے نکل نہیں رہی تھی۔

''خودکشی کرنے کو کیوں نہیں کہتے''؟ اس نے بڑی مشکل سے زبان کھولی۔

''یہ مسئلے کا حل نہیں ہے''۔ حفیظ نے جواب دیا۔

''میں عمر قید نہیں کاٹ سکتا''۔ ایوب نے جواب دیا۔

''رفعت کے کہنے پر بھی نہیں''؟ حفیظ نے پوچھا۔

حیرت کا جھٹکا لگنے سے اگر کوئی مرتا تو ایوب مر گیا ہوتا۔ مگر وہ یہ بات سننے کے بعد بھی زندہ تھا اور یہی اس کا المیہ تھا۔ آج پہلی بار اس کی آنکھوں میں آنسو اُترے، پھلدار درخت پہ اترنے والے پھولوں کی طرح۔ بہار کے موسم میں گلابی پھولوں سے لدے خُوبانی کے درخت وادی کو جو حُسن و رعنائی بخشتے ہیں، محبت نے دنیا کی وادی کو اُس سے کہیں زیادہ سجا رکھا ہے۔

''چلو اب چلتے ہیں''۔ بہت دیر کی خاموشی کے بعد حفیظ بولا۔

ایوب کوئی جواب دیے بغیر سگریٹ پیتا رہا۔ حفیظ نے دوبارہ اسے چلنے کے لیے کہا تو وہ بولا۔

''تم چلے جاؤ''۔ ایوب نے قہر آلود نگاہوں سے اسے دیکھا۔

وہ بہت دیر تک اکیلا بیٹھا رہا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کرے۔ دکھ اور غم سے اس کے چہرے کی ہڈیاں بھی دُکھ رہی تھیں۔ جب اس کے پاس سگریٹ ختم ہو گئے تو وہ اٹھ کر چلا آیا۔

دوسرے دن وہ کھڑی شریف چلا گیا اور شام ڈھلے واپس آیا۔ اگلا پورا ہفتہ اس نے گھر پہ گزار دیا۔ وہ زیادہ دیر ماں کے ساتھ ہی رہا۔ اس کے ساتھ ڈھیر ساری باتیں کیں، بچپن کی وہ ساری یادیں اس نے دہرائیں جو اسے یاد تھیں۔ ماں بھی اس کے ساتھ شریک رہی۔ اس نے ماں کے ہاتھ اور پاؤں کے ناخن کاٹے۔ اس کے پھٹے ہوئے میلے پاؤں زبردستی دھوئے ان پر واسلین لگائی۔ ماں حیرانی سے اسے دیکھتی رہی۔ اس پورے ہفتے میں اس نے ماں کو کوئی کام نہ کرنے دیا۔ سالن وہ خود بنا لیتا، چائے اور ناشتہ بھی۔ اس کے لیے تین جوڑے نئے کپڑے بھی بنوا لایا۔ یہ جمعہ کا دن تھا۔ اس نے غسل کیا، جمعہ کی نماز پڑھی، محلے داروں سے ملا اور واپس گھر

آ گیا۔ ماں کے ساتھ کھانا کھایا اور کہا۔

''اماں آجکل یہاں کام دھندا اچھا نہیں ہے اس لیے گاڑی لے کر کراچی جا رہا ہوں''۔

''اچھا خاصا گزارا تو چل رہا ہے پُتر پھر کیوں اتنی دُور جا رہے ہو''۔شفقت سے ماں کی آنکھیں چھلک رہی تھیں۔

''کچھ عرصہ یہاں سے دُور رہنا چاہتا ہوں امّاں''۔ایوب نے جواب دیا۔

''کب تک واپس آؤ گے پُتر''؟

''زیادہ عرصہ نہیں امّاں، چار چھ ماہ یا کم زیادہ''۔ایوب نے برتن اٹھاتے ہوئے کہا۔

''چھوڑ دے میں خود اٹھا لوں گی''۔

''نہیں امّاں آپ بیٹھیں میں واپس آتا ہوں''۔ برتن دھوتے ہوئے ایوب کی آنکھیں بہتی رہیں۔

کئی بار اس کا دل چاہا کہ وہ ماں سے اپنی غلطیوں پر معافی مانگ لے لیکن ہر بار اسے یہ محسوس ہوا کہ یہ بات کر کہ کہیں وہ ماں کی ممتا کی توہین نہ کر بیٹھے۔

''کچھ دوستوں سے ملنا ہے امّاں، شام تک واپس آجاؤں گا''۔ایوب نے ماں سے اجازت چاہی۔

''ضرور مل آؤ''۔ ماں نے کہا۔''کب تک جانے کا ارادہ ہے''؟

''جب آپ اجازت دے دیں امّاں''۔

''ٹھیک ہے تم دوستوں سے مل آؤ''۔

وہ سب سے الوداعی ملاقاتیں کر چکا تھا اور اب ماں کی اجازت کے لیے انتظار کر رہا تھا۔ دوسری شام ماں نے اسے اس شرط پر اجازت دے دی کہ دو ماہ بعد مل کر جاؤ۔ اس نے ماں سے وعدہ کر لیا۔ آج وہ جا رہا تھا۔ اس کی طبیعت پہ کافی بوجھ تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ شاید اس نے غلط فیصلہ کر لیا ہے۔ لیکن اب سوچنے کا وقت نہ تھا۔ گھر سے نکلتے ہوئے اس نے بڑی مشکل سے اپنے آنسو روکے اور مسکراتے ہوئے الوداع ہوا۔ ماں دروازے پر کھڑی دیکھتی رہی۔ گلی

کے آخر میں مین روڈ پر اس کی گاڑی کھڑی تھی۔ وہ فرداً فرداً سب دوستوں سے مل کر گاڑی پر سوار ہو گیا۔ گاڑی چل پڑی تو وہ شہر کو الوداعی نظروں سے دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں ماں کا اداس چہرہ بسا ہوا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ گاڑی سے کود کر گھر کی طرف بھاگ جائے، مگر یہ اس کے لیے ممکن نہ تھا۔

''نیک جی اتنا پریشان ہیں تو پھر کراچی جانے کی ضرورت کیا ہے''؟ ڈرائیور نے اس سے پوچھا۔

''تو کہاں جاؤں''؟

''کیوں جائیں نیک جی' ڈرائیور نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا'اپنے شہر میں رہیں''۔

''کبھی کبھی اپنا شہر بھی پرایا ہو جاتا ہے خورشید'ایوب نے کہا' روڈ پہ دھیان رکھو گردش کے دن ہیں''۔

وہ اندرونِ سندھ سے کپاس، گنّا اور دیگر زرعی اجناس کراچی اور یہاں سے فیکٹریوں کا تیار شدہ سامان سندھ کے مختلف شہروں میں لاتے لے جاتے رہے۔ کام بہت تھا اور ریٹ بھی اچھے تھے۔ انہوں نے ایک اور ڈرائیور منگوا لیا اور اپنے کام میں لگے رہے۔ ایوب اکثر گاڑی کے ساتھ رہتا تھا۔ مصروفیت کی وجہ سے اس کے دل کا بوجھ کافی ہلکا ہو چکا تھا۔ ایوب ہر مہینے اپنے بھائی کے لیے پیسے بھیج دیتا تھا جس کی وجہ سے وہ خوش تھا اور اس کی ماں بھی مطمئن تھی۔ چھ ماہ گزر گئے تھے، اس دوران رفعت کا رشتہ ہو گیا اور اس کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ایوب کی ماں اس پر بہت خوش تھی اور اس نے ایوب کے لیے لڑکی کی تلاش شروع کر دی۔ بلکہ اس نے شادی کی خریداری بھی شروع کر رکھی تھی، وہ جب بھی بازار جاتی کوئی نہ کوئی چیز خرید لاتی۔ لیکن انہی دنوں ایوب کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ اس نے نماز پڑھنے کے لیے گاڑی رکوائی اور سڑک کی دوسری طرف مسجد کو جاتے ہوئے ایک کار کی زد میں آ گیا۔ تین دن زندگی اور موت کی کشمکش میں رہنے کے بعد عین اُس دن جب اس کی ماں

نے اس کے لیے ''گانا'' تیار کر کہ بکسے میں رکھا، ایوب اللہ کو پیارا ہو گیا۔ شام چھ بجے کا وقت تھا، شہر کی ایک سڑک پر ٹریفک جام تھی۔ ایک طرف گاڑیوں کی لمبی قطار تھی، باجے بج رہے تھے اور ڈھول کی آواز گونج رہی تھی دوسری طرف ایوب کی ایمبولینس کا ماتمی ترانہ رفعت کو رخصت کر رہا تھا۔



آزاد کا خیال تھا کہ اب وہ دل جمعی کے ساتھ وکالت کرے گا تاکہ اپنے گھر کا بوجھ اٹھا سکے۔ لیکن عملی زندگی میں آکر بھی وہ وطن کی آزادی کی تحریک سے دستبردار نہ ہو سکا۔ آزاد کشمیر میں بحالی جمہوریت کی تحریک میں وہ دن رات مصروف ہو گیا۔ وکالت اور سیاست میں توازن رکھنا اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا لیکن اس نے ہمت نہ ہاری اور دونوں کو برابر وقت دیتا رہا۔ اس کی امی بھی گذشتہ دو سال سے انتظار میں تھی کہ آزاد اپنی پڑھائی اور سیاست کے جھمیلوں سے فارغ ہو تو وہ شہناز کو اپنے گھر لے آئے۔ آزاد بھی ماں کی بات سے متفق تھا۔ وہ اس سلسلے میں شہناز کو دو خط لکھ چکا تھا لیکن اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ یہ بات اس کے لیے پریشانی کا باعث تھی۔ طرح طرح کے وسوسے اس کے ذہن میں پروان چڑھ رہے تھے اور وہ کسی نتیجے پر پہنچنے سے قاصر تھا۔ ایکسچینج میں گھنٹوں انتظار کر کے فون کرنا اسے گوارا نہ تھا لیکن دونوں مرتبہ اس کی ممانی اور ماموں سے ہی بات ہو سکی شہناز اتفاقاً گھر پہ نہیں تھی۔ تقریباً تین ماہ گزر چکے تھے اور اب اس کی تشویش بڑھ رہی تھی۔ یقیناً شہناز کی طرف سے اتنی طویل خاموشی بلاوجہ نہیں ہو سکتی۔

''اس خاموشی کے پیچھے کوئی طوفان نہ چھپا ہو''؟

وہ بار بار اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیتا لیکن یہ سوال اسے ڈستا رہتا تھا۔ یہ اُس زہریلے سانپ سے بھی زیادہ مُوذی تھا جس کے ڈسے جانے سے انسان پل دو پل میں مر جاتا ہے۔ جس رات یہ زہر اس کے جسم و جاں میں اترتا وہ رات اس کے لیے عذاب بن جاتی۔ اس پر اسرار خاموشی کو جب چھ ماہ گزر گئے تو وہ بے خوابی کا شکار ہو گیا۔ اس کی صحت تیزی سے گرنا شروع ہو گئی اور اس کی پریکٹس بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ ماں سے وہ مسلسل جھوٹ بولتا رہا کہ ابھی وہ پڑھ رہی ہے اور فارغ ہوتے ہی آجائے گی۔ وہ اس بات پر مطمئن تھی لیکن آزاد کی گرتی ہوئی صحت نے اسے بہت پریشان کر دیا تھا۔

''تمہاری وجہ سے خالہ بھی پریشان ہیں' عارف نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا'تم صورتحال کو Mishandle کرر ہے ہواور یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ہم اگر قوم کی آزادی کی بات کرتے ہیں اوراس کے لیے آخری سانس تک جدو جہد کرنے کا عزم رکھتے ہیں تو پھر ذاتی زندگی کے معاملات میں ہمیں پتھر دل ہونا پڑے گا۔دوڈھائی لاکھ سے زاید لوگ صرف جمّوں میں قتل کردیے گئے،پونچھ،مظفرآباد،میرپور میں مارے جانے والے اس کے علاوہ ہیں۔تم کیا سمجھتے ہو یہ تقسیم خاموشی سے ہوگئی تھی۔ہمارے شہیدوں کے خون کی خوشبوتو آج بھی اس مٹّی میں رچی بسی ہے۔سب سے بڑاظُلم تو یہ ہوا کہ کشمیری کے ہاتھوں کشمیری قتل ہوا۔قبائلی تو غیر تھے ان سے ہمارا کیا شکوہ۔مہاراجہ کشمیری تھا،اس کی فوج میں سب کشمیری تھے، اس کے ہاتھوں مارے جانے والے بھی فقط کشمیری ہی تھے اور سِول لوگوں کے ہاتھوں مارے جانے والے مسلم یا غیر مسلم بھی کشمیری ہی تھے۔کوئی جمّوں میں قتل ہو یا پونچھ میں، سری نگر میں مارا جائے یا مظفرآباد میں......خُون ہندو کے ہاتھوں بہا کہ مسلمان کے ہاتھوں،خون تو اپنا تھا......!

یہ کیا کم المیہ ہے زندگی بھر کے ماتم کے لیے......آنے والی نسلوں کے ماتم کے لیے!

کسی دوسرے روگ کے لیے تم نے گنجائش نکالی کہاں سے یہ تو بتاؤ......؟

جس حالت میں تم خود کو لے جا چکے ہو اس نے تو مجھے سخت مایوس کیا ہے''۔عارف کی آنکھیں نمناک ہوچکی تھیں۔

آزاد کو یوں لگا جیسے بجلی کے ننگے تار اس کے دماغ کو چھُو گئے ہوں۔

تھوڑی دیر تک مکمل خاموشی رہی۔آزاد کے نمکین آنسو اس کے حلق سے نیچے اتر رہے تھے اور وہ خود کو بہت چھوٹا محسوس کرر ہا تھا۔

''چلوتم یہ بتاؤ،زیادہ سے زیادہ کیا ہوجائے گا تمہارے ساتھ''؟ عارف نے پوچھا۔

آزاد کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر وہ پھر بولا۔

''بھئی حد زیادہ یہی ہوگا کہ وہ کشمیر آنے پر راضی نہیں ہوگی اور تم لندن نہیں جاؤ گے''؟

''ہوسکتا ہے''۔آزاد نے جواب دیا۔

''پھر کیا ہوگا''؟ عارف نے آزاد کی طرف دیکھا۔

''اچھا تمہیں ہمت نہیں ہو رہی تو مجھ سے سنو' عارف بولا 'یہی ہوگا کہ تمہارے درمیان علیٰحدگی ہو جائے گی؟ یہی ہوگا ناں''؟

''ہاں ایسا ہی ہوگا''۔ آزاد نے کہا۔

''اور پھر ایک دن طلاق ہو جائے گی''۔ عارف بلا خوف بولتا جا رہا تھا۔

آزاد نے اس کی طرف دیکھا مگر کوئی جواب نہ دیا۔

''تو پھر کیا ہو جائے گا؟ زندگی ختم ہو جائے گی کیا''؟؟ عارف نے سوال اٹھایا۔

''زندگی تو اپنے وقت پر ہی ختم ہوگی''۔ آزاد نے کہا۔

''ابھی کل ہی کی بات ہے' عارف نے پھر بولنا شروع کیا 'ایوب کو دیکھ لو۔ ذات پات کی تفریق نے اس کی جان لے لی۔ برہمنی سماج کی بدبو نہیں آ رہی تمہیں ان روائتوں میں''؟

آزاد کے آنسوؤں نے راستہ بدل لیا اور اب وہ آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ ایوب دونوں کا مشترکہ دوست تھا۔ وہ دیر تک اس کی یاد میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ پھر وہ وہاں سے اٹھ کر اُس کی قبر پر گئے۔

دعا کے بعد وہ ادھر ہی بیٹھ گئے۔

''یہ ہمارا انجام ہے یار۔ ساری زندگی یہاں تک کے سفر کا نام ہے'۔ عارف نے بولنا شروع کیا۔' اتنا سا فاصلہ طے کرنے کے لیے آدمی کتنا کچھ کرتا ہے۔ کتنے لوگوں کی حق تلفی کرتا ہے، کتنوں کا دل دکھاتا ہے، کتنوں سے خواہ مخواہ ناراض رہتا ہے۔ ظلم، عداوت، قتل و غارت، جھوٹ، منافقت...... کتنا بوجھ اٹھا کر انسان قبر میں جاتا ہے''۔

''دنیا اسی کا نام ہے۔ جب تک انسان کی آنکھیں کھلی رہتی ہیں وہ وہ سرکش گھوڑے کی طرح دوڑتا رہتا ہے۔ نہ سمت دیکھتا ہے نہ راستہ، نہ منزل'۔ آزاد نے کہا۔' مجھے تو خوف آتا ہے بھئی، کہتے ہیں انسان مرتا نہیں ہے بلکہ اس کی ایک اور زندگی شروع ہو جاتی ہے۔ قبر کی بھی ایک زندگی ہوتی ہے۔ سوچو تو ذرا، جو کچھ یہ مولوی لوگ کہہ رہے ہیں اگر سچ نکلا تو ہمارا کیا بنے گا''؟

''مولوی نہیں کہتے بھئی، یہ تو قرآن کہتا ہے'۔ عارف نے کہا۔' ویسے قرآن کی تعلیمات کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے''؟

''پتہ نہیں یار، سچ پوچھو تو پڑھا ہی کب ہے، جو کچھ سنا ہے اس حساب سے تعلیمات تو بری نہیں۔ لیکن قرآن کی کس حد تک صحیح ترجمانی ہوئی ہے اس کے بارے میں ہمیں کیا پتہ۔ تم کیا کہتے ہو''؟ آزاد نے جواب دیا۔

''پتہ نہیں یار! کبھی کبھی تو دِل کرتا ہے سچے دل سے مسلمان ہو جاؤں۔ لیکن ہمت نہیں ہوتی۔ نجانے کیوں؟ محمد ﷺ اور ان کی ٹیم کے بارے میں جب پڑھتا ہوں تو حیران ہو جاتا ہوں۔ ان کے اخلاق، ان کا کردار، ان کی سیاست، ان کی معاشرت ہر پہلو حیران کر دینے والا ہے۔ انسان کی سوچ وفکر پر اثر انداز ہونے والے اتنے لوگ یقیناً کسی زمانے میں نہ گزرے ہوں گے''۔

چوہدری اسلم بہت حلیم طبع مگر حسّاس انسان تھا۔ شہناز کے معاملے میں اب وہ پریشان رہنے لگا تھا۔ اس نے کئی بار بیوی سے پوچھا مگر وہ بھی اسے صحیح صورتحال نہیں بتا رہی تھی۔

''دیکھو رضیہ مجھے سچ سچ بتاؤ کیا وجہ ہے، چھ ماہ سے اوپر ہو گئے اس نے آزاد سے رابطہ ختم کر رکھا ہے۔ آخر وجہ کیا ہے''؟ چوہدری اسلم نے بیوی سے پوچھا۔

''میں کیا کہوں جی، بہت پوچھا ہے لیکن کچھ بھی نہیں بتا رہی''۔ رضیہ نے جواب دیا۔

''آخر کچھ تو کہتی ہوگی۔ کشمیر نہیں جانا چاہتی کیا''؟ اسلم نے سوال کیا۔

''شاید ایسی ہی بات ہے''۔ رضیہ نے کہا۔

''اگر ایسی بات ہے تو صاف صاف بتاؤ۔ خواہ مخواہ معاملے کو لٹکائے رکھنا کہاں کی عقلمندی ہے''۔ اسلم نے کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن آپا کو کیا جواب دیں گے''؟ رضیہ نے کہا۔

''یہ تو تم لوگوں کو بہت پہلے سوچ لینا چاہیے تھا۔ آزاد نے تو یہاں سیٹل ہونے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس کے بعد یہ سارا ڈرامہ کرنے کی کیا ضرورت تھی اگر اِسے وہاں نہیں رہنا تھا تو''؟ چوہدری اسلم نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

''اس وقت تو اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا''۔

''تواب کیا ہو گیا ہے۔ بہر حال میرا نہیں خیال کہ آزاد اِدھر آئے گا''۔ اسلم نے کہا۔

''ٹھیک ہے مجھے ایک بار پھر شہناز سے بات کر لینے دیں''۔ رضیہ نے کہا۔

رضیہ نے شہناز سے بات کی تو اس پر یہ انکشاف ہوا کہ مسئلہ آزاد کے لندن آنے یا شہناز کے کشمیر جانے کا نہیں بلکہ وہ اس سے طلاق لینا چاہتی ہے۔ رضیہ کے ہوش اڑ گئے اور وہ بیمار پڑ گئی۔ اب اسے چوہدری اسلم سے بات کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے شہناز کی سہیلیوں کو فرداً فرداً بلایا تا کہ اسے سمجھا سکیں مگر بات نہ بنی اور ایک دن اس نے چوہدری اسلم کو حقیقت سے آگاہ کر دیا۔

''ٹھیک ہے تو میری بہن کو اطلاع کر دو تا کہ وہ اِس کے انتظار میں تو نہ رہے''۔ اس دن سے چوہدری اسلم ہائی بلڈ پریشر کا مریض بن گیا۔

آزاد کے چند قریبی دوست لندن میں تھے۔ رضیہ نے ان میں سے ایک کو بلا کر ساری بات بتائی اور آزاد کو خبر کرنے کو کہا۔ آزاد کو اتنے طویل قطعہ تعلق کے باوجود یہ اندازہ یا توقع نہ تھی۔ اسی لیے جب اسے خط کے ذریعے یہ خبر ملی تو وہ سٹپٹا کر رہ گیا۔

''جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اب اس پر غمزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے'۔ عارف اُسے تسلّی دے رہا تھا۔ 'ایک بات یاد رکھو کہ حادثات کمزور لوگوں کو پیس کر رکھ دیتے ہیں جبکہ دلیر لوگوں کو جینے کا ڈھنگ سِکھا دیتے ہیں۔ ہر انسان کو اپنی زندگی کے بارے میں فیصلے کرنے کا حق ہے۔ جبکہ ہم نے شادی کے بعد عورت سے یہ حق چھین لیا ہے۔ تم اُسے یہ حق لوٹا دو۔ باتیں کرنا آسان جبکہ عمل کرنا مشکل ہوتا ہے۔ ہمیں ان مشکلوں سے گزرنا ہو گا۔ تا کہ ہماری طرح نئی نسل کو ہم سے شکوہ نہ ہو۔ دنیا بدل رہی ہے، ہم نے اگر اپنے سماج کو اس تبدیل ہوتے ہوئے سانچے میں نہ ڈھالا تو یہ ہماری نسلوں کا جینا حرام کر دے گا''۔

''پتہ نہیں کیا بات ہے عارف، جو کچھ ہو رہا ہے مجھے اس پر یقین نہیں آ رہا۔ مجھے یہ سب ایک خواب لگتا ہے۔ بہر حال اگر یہ حقیقت ہے تو میرا کوئی اعتراض نہیں لیکن اس کی وجہ کیا ہے۔ یہ جاننے کا حق تو رکھتا ہوں''۔ آزاد نارمل دکھائی دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

''اور اگر وجہ معلوم نہ ہو سکے تو''؟ عارف نے پوچھا۔

''تو میں کوئی فیصلہ نہیں کر پاؤں گا''۔ آزاد نے دوٹوک الفاظ میں کہا۔

''یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ ایک بات ذہن میں رکھنا آزاد، چونکہ میں تم سے اس موضوع پر پہلے بھی بات کر چکا ہوں۔ اور اتفاقاً حالات کچھ ویسی ہی صورت اختیار کر چکے ہیں۔ اس لیے کہیں یہ نہ سمجھنا کہ مجھے اس معاملے کا پہلے سے علم تھا۔ چاہو تو مجھ سے قسم لے لو''۔ عارف نے کہا۔

''تمہیں پہلے سے خبر تھی یا نہیں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن مجھے وجہ بھی نہ بتائی جائے، اس سے بہر حال فرق پڑتا ہے''۔ آزاد نے کہا۔

''کیا فرق پڑتا ہے''؟ عارف نے پوچھا۔

''بھئی آخر میں انسان ہوں، کوئی مردہ چیز تو نہیں کہ استعمال کر کہ پھینک دو''۔ آزاد کسی قدر جذباتی ہو رہا تھا۔

''نہیں ایسی بات بھی نہیں ہے۔ جو تم کہو گے ویسا ہی ہوگا۔ تم اطمینان رکھو، میں تمہارے ساتھ ہوں اور کسی قیمت پر زیادتی نہیں ہونے دوں گا۔ لیکن تھوڑی دیر کے لیے اپنی ذات سے باہر نکل کر سوچو''۔ عارف نے کہا۔

''کیا مطلب''؟ آزاد نے پوچھا۔

''تمہیں تو اچھی طرح اندازہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں عورت کی کیا حیثیت ہے، ہم کہتے ہیں عورت پاؤں کی جوتی ہے۔ جب چاہو اتار پھینکو اور دوسری پہن لو۔ اب شاید کہتے تو نہیں ہیں لیکن عملاً صورت ایسی ہی ہے۔ تم علیحدگی کے کمزور، معصوم سے مطالبے پر کیوں اتنے سیخ پا ہو گئے ہو''؟

ایک عورت کے چہرے پر جب طلاق کی کالک ملتے ہو تو کیوں نہیں سوچتے انسان بن کر؟؟؟ مگر انسان بننے میں تو اپنا نقصان ہے نا۔ نہ اس کی عزت سے کھیل سکتے ہو، نہ اس کے جذبات سے نہ اس کی زندگی سے۔

یہ ہیں ہم مردوں کے کرتوت، جنہوں نے اس معاشرے کو عورت کے لیے ایک غلاظت بھری، بدبودار جیل بنایا ہوا ہے۔ آج بھی تمہارے گھروں میں عورت پر تشدّد ہوتا ہے،

جسمانی بھی، نفسیاتی بھی۔ مسلسل اذیّت سے دوچار ہے ہماری عورت۔ ایک عورت جس کا خاوند ظالم ہے، کیوں نہیں اُس کو فی الفور آزاد ہونے کا حق دیا جاتا''؟

آزاد کمرے میں ٹہلتے ہوئے سگریٹ کے گہرے کش لگا رہا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ عارف نے واقعتاً اسے اپنا غم بھلا دیا تھا۔ اس نے عارف کی بات سنی اور کہا۔

''اونچی آواز میں نہ بولو مولوی فتوٰی دے دے گا''۔

''خدا مولوی کے فتوے سے بھی آگاہ ہے اور میری نیت سے بھی۔ یہ مولوی جو عدالتوں میں بیٹھے ہوئے ہیں، خُلع کی فریادیں لیے مظلوم عورتیں سالوں ان کے دَر کی خاک چھانتی رہتی ہیں، ان پر کچھ اثر ہی نہیں ہوتا۔ کس مٹّی کے بنے ہوئے ہیں یہ، کس پتھر سے پھوٹے ہیں؟ کس غیرت اور عزت کے دعویدار ہیں یہ؟

ارے میں پوچھتا ہوں یہ محمدﷺ کی شریعت لے کر بیٹھے ہوئے ہیں یا فرعون کی شریعت لے کر بیٹھے ہیں''؟ عارف کافی جذباتی ہو گیا تھا۔

''اصل میں قصور ہمارے عدالتی نظام کا بھی ہے''۔ آزاد نے کہا۔

''اسی لیے تو کہہ رہا ہوں عورت کو بھی انسان سمجھو، اسے جینے کا حق دو۔ تم عدالتی نظام کی بات کرتے ہو۔ قسم دے کر پوچھو اپنے ججوں سے، جن کے بوجھ سے انصاف دب گیا ہے، کہ یہ موسیٰؑ کے ساتھ کھڑے ہیں یا قارون کے ساتھ''؟ عارف نے کہا۔

''چلو چھوڑو یار غصّہ تھوک بھی دو''۔ آزاد نے کہا۔

''بات غصے کی نہیں ہے بھئی، تم خود سوچو کہ پلاٹوں پر بک جانے والے لوگ جب انصاف کی کرسی پر بیٹھے ہوں گے تو معاشرے کا کیا بنے گا''؟ عارف نے کہا۔

''تم پلاٹوں کی بات کرتے ہو، یہاں ٹکوں پہ انصاف بکتا ہے''۔ آزاد نے کہا۔

''مجھے بتاؤ، دین نے خلع کا حق عورت کو اس لیے دیا ہے کہ تم انہیں عدالتوں میں بلا کر سالوں سال ذلیل و رُسوا کرتے رہو''۔ عارف پھر بولنا شروع ہو گیا۔ 'تمہاری بیٹی تمہارے در پہ

انصاف کی بھیک مانگے، تمہاری بہن تمہاری دہلیز پہ خون کے آنسو روئے۔ تمہیں اس کی پرواہ نہیں۔ نکاح کو تم نے ملکیت کی ڈگری بنا رکھا ہے؟ تمہاری بیوی تمہاری بیوی نہیں ہے، سنو......! وہ تمہارا باورچی ہے، وہ تمہارا تندوری ہے، تمہارا موچی ہے، تمہارا دھوبی ہے، تمہارا نوکر ہے، تمہاری زرخرید باندی ہے۔ بہنوں اور بیٹیوں کو تم جہیز کی ٹھیکریاں دے کر وراثت سے بے دخل کر دیتے ہو۔ انہیں اپنے باپ کی وراثت سے حصہ دو یا پھر کہہ دو وہ تمہارے باپ کی اولاد نہیں......۔ تمہاری عدالتیں، تمہارا بنچ، تمہارے تھانے، تمہاری پنچائتیں، تمہاری نظریاتی کونسلیں، تمہاری اسمبلیاں، تمہارے سارے ادارے، تمہارا سارا سماج عورت کے معاملے میں عبداللہ بن ابی سے آگے نکلا ہوا ہے......۔ ارے سماج کچھ تو خیال کر، کچھ تو غیرت کر، کچھ تو اپنا بھرم رکھ، کچھ تو انسان ہونے کا ثبوت دے......! تمہاری عدالتوں میں، تمہارے قانون ساز اداروں میں ہر روز انسانیت کے منہ پر جوتے مارے جاتے ہیں، اس کا منہ کالا کر کے رُسوا کیا جاتا ہے۔

ارے اٹھو اس نظام کا بوسیدہ، بدبودار لحاف کو اتار پھینکو۔ یہ بدبو تمہارے دماغوں میں رچ بس گئی ہے۔ غلاظت کے اس ٹوکرے کو اب تو سر سے اتار دو۔ اے میرے بچوں کو پڑھانے والے، اے میرے چمن کے مالی......! ہائے تمہیں کس کی نظر کھا گئی؟ تمہاری سوچ جل کر کباب ہوگئی، تمہاری بینائی چلی گئی، ارے بتاؤ میں اپنی فریاد لے کر کس کے پاس جاؤں......؟ کہاں سویا ہے معاشرے کا ضمیر جس کے بند دروازے پر جا کر میں اپنا سر پھوڑوں۔ جس نے تمہیں بے توقیر کر دیا، بے نور کر دیا۔ تمہی ہو فقط تمہی ہو اے مالی......تمہارے سوا اور کوئی نہیں۔ کبھی لوٹ کے دیکھو تو اپنے ماضی میں، کیسے کیسے کردار تم نے تخلیق کیے تھے۔ تم ایک ستارہ تھے......، روشنی کا استعارہ تھے۔ لوٹ آؤ اے میرے محسن لوٹ آؤ...... مجھے معاف کر دو، اور سزا نہ دو، اپنے ماضی کی طرف لوٹ آؤ۔ یہ چمن اجڑ گیا ہے، ہر ایک پھول، ہر ایک خواب بکھر گیا ہے۔ ہمیں پھر سے پھول دو، ہمیں پھر سے خواب دو......۔ پھاڑ کر پھینک دو یہ کتابیں جن سے جہالت ٹپکتی ہے اور ایک نیا نصاب دو، کردار دو، اطوار دو، اخلاق دو، اقدار دو......! مگر مجھے پتا ہے تم کہو گے یہ میرے بس میں نہیں۔ دیکھو دامن نہ بچاؤ، خدارا دامن نہ بچاؤ۔ یہ جن تنظیموں کے سائے تلے تم سب ایک ہو

وہ کیا کچھ نہیں کر سکتیں؟ لیکن پھر بھی اگر تم کہتے ہو، تم کچھ نہیں کر سکتے تو سنو۔ تم اس نہ کر سکنے کے غم میں، اس قوم کے مستقبل کے غم میں کُڑھ کُڑھ کر مر تو سکتے ہو۔ اس غم میں مر جاؤ.........خدا کی قسم تمہاری قبروں سے انقلاب پھوٹے گا"!!!

آزاد نے ماں کو بھی بتا دیا تھا کہ وہ وجہ معلوم کیے بغیر طلاق نہیں دے گا۔ شہناز کی امی نے اُس سے بار ہا پوچھا مگر وہ کچھ بھی نہیں بتا رہی تھی۔ ایک دن شہناز کی ایک سہیلی سے اس کی ملاقات ہوئی۔ وہ اسے ایک کافی ہاؤس میں لے گئی اور اس سے اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔

"آنٹی میں آپ کو حقیقت بتا دیتی ہوں مگر شہناز کو میرا پتا نہ چلے"۔ کوثر نے کہا۔

"بالکل نہیں پتہ چلے گا، تم بے فکر رہو"۔ رضیہ نے اس سے وعدہ کر لیا۔

کوثر: "آنٹی ہماری ایک مشترکہ دوست ہے جُولی، اس کی بڑی بہن ڈاکٹر ہے۔ آپ کو یاد ہے جب سردیوں میں اسے کچھ بخار وغیرہ ہو گیا تھا تو وہ اسے بہن کے کلینک پر لے گئی تھی۔ وہاں اس نے شہناز کے سارے ٹسٹ وغیرہ کیے۔ وہ بالکل ٹھیک تھی۔ البتہ اس نے شہناز کو بتایا تھا کہ وہ ماں نہیں بن سکتی۔ اس کے بعد سے وہ بہت پریشان رہنے لگی تھی۔ پھر ایک دن اس نے بتایا کہ وہ طلاق لے لے گی۔ میں نے اسے بہت سمجھایا لیکن وہ کہتی ہے کہ جب آزاد کو آٹھ دس سال انتظار کے بعد دوسری شادی کرنی ہی ہے تو بہتر ہے کہ وہ آج ہی کر لے۔ اور میں بھی آج سے اپنا راستہ الگ کر لوں، آدھی زندگی میں جا کر خوار ہونے کا کیا فائدہ"۔

رضیہ نے بات پوری توجہ سے سنی، کوثر کا شکریہ ادا کیا اور گھر چلی آئی۔

چوہدری اسلم یہ بات سن کر ہکا بکا رہ گیا۔ دونوں نے طے کر لیا کہ بہن کو حقیقت سے آگاہ کر لیا جائے۔ لیکن آزاد کی ماں کہاں ماننے والی تھی اس نے کہا۔

"میری بیٹی کو میرے گھر بھیج دو، تم لوگوں کو کس نے کہا کہ اللہ کے معاملات میں مداخلت کرو۔ کل کے اندازوں پر میرا اور میرے بیٹے کا آج برباد نہ کرو۔ اگر تمہیں اس کے مستقبل کی فکر ہے تو میں ایک مکان اس کے نام کر کے کاغذات بھیج دوں گی۔ مجھے بتاؤ تم لوگ کب آرہے ہو"؟

چوہدری اسلم بہن کا یہ جواب سن کر رو دیا۔ بہرحال سب نے مل جل کر شہناز کو راضی کر لیا اور جولائی میں گھر آنے کی تیاری کرنے لگے۔

آزاد کی امی بھی انہیں لینے ائرپورٹ جانا چاہتی تھی لیکن طبیعت کی خرابی کی وجہ سے نہ جا سکی۔ آزاد، اس کا بھائی اور دونوں بہنیں اگلے دن پنڈی چلے گئے۔ وہ انہیں پھوپھی کے گھر چھوڑ کر خود ہوٹل پر چلا گیا اور انہیں کہہ گیا کہ وہ صبح ٹائم پہ ائرپورٹ پہنچ جائیں وہ انہیں ادھر ہی ملے گا۔ وہ صدر میں پہنچا تو نثار اور جاوید جو پنجاب یونیورسٹی میں اس کے سینئر تھے ان سے ملاقات ہوگئی۔ ان کے ساتھ چند اور دوست بھی تھے۔ وہ کافی عرصے بعد ملے تھے۔ سب نے ایک ہی ہوٹل میں کمرے لیے اور ایک دوسرے کے حال احوال سننے سنانا شروع کر دیے۔ کھانا کھا کر جب وہ واپس ہوٹل پہنچے تو ۱۲ بج چکے تھے۔ فلائٹ صبح ۶ بجے آنی تھی اس لیے وہ بے فکر ہو کر ان کے ساتھ گپ شپ میں مصروف ہو گیا۔

''بھئی ایک بات تو بتاؤ''۔ آزاد نے ان سے پوچھا۔

''کیا''؟

''یہ ۴۷ء میں تم پونچھ والوں نے کیا کیا''؟

''جو کیا تمہارے سامنے ہے۔ چھپا ہوا تو کچھ ہے نہیں''۔ نثار نے قہقہہ لگایا۔

''میرا مطلب یہ ہے کہ یہ سب کچھ کیوں کیا''؟ آزاد نے پوچھا۔

''بس ہمارا دِل کرتا تھا، سو کر لیا۔ تمہیں کوئی اعتراض''؟

''یار تم میری بات کو سنجیدہ نہیں لے رہے''۔ آزاد نے شکوہ کیا۔

''رات کا ڈیڑھ بج گیا ہے بھائی، یہ کوئی وقت ہے سنجیدہ بات کرنے کا؟ ایک تو ہمیں جاوید کے لیے لڑکی نہیں مل رہی اوپر سے تم قومی مسائل چھیڑ کر بیٹھ گئے ہو۔ کچھ اس بچارے کے بارے میں سوچو''۔ نثار اسے ٹالنے پر تلا ہوا تھا۔

''بھئی دیکھو ایک تو تم نے بنا بنایا کام خراب کیا بغاوت کر کے ملک تقسیم کروا دیا، اب جواب بھی نہیں دے رہے''۔ آزاد نے کہا۔

''اچھا تو یہ بات ہے''۔ نثار اٹھ بیٹھا اور سگریٹ سلگا کر آنکھوں سے زمین کریدنے

لگا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے بولنا شروع کیا۔

''آزاد تمہارے سوال کا جواب اُس کے اندر موجود ہے''۔نثار نے کہا۔

''وہ کیسے''؟

''تمہارا کہنا ہے کہ ہم لوگوں نے ۷۱ء میں بغاوت کی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بغاوت ہوتی کیوں ہے؟ تم ہی بتاؤ''۔

''بہتر ہے تم ہی بات کرو''۔نثار نے جواب دیا۔

''وہ تو میں نے کرنی ہی کرنی ہے۔ تم نے فرض جو کر دی ہے میرے اوپر جمعے کی نماز کی طرح لیکن تم بھی کچھ اظہارِ خیال کرو''۔

''تم بات کرو جہاں کہیں ضرورت پڑی میں بول لوں گا''۔آزاد نے کہا۔

''فرعون کے بارے میں تو تم نے سنا ہو گا۔ اس نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا تھا اور موسیٰ علیہ السّلام نے انہیں نجات دلائی تھی۔ یہاں بھی صورتحال ویسی ہی تھی فرق صرف یہ ہے کہ یہاں حکمرانوں کو بھاگنا پڑا اور ان کی زندگیاں بھی بچ گئیں۔ تقسیم کے معاملے میں عرض یہ ہے کہ بغاوت جن کے خلاف ہوئی وہی تقسیم کے ذمہ دار ہیں، ہم نہیں۔ ہم نے تو غلامی کا جندرا اپنے گلے سے اتار پھینکنے کی کوشش کی تھی''۔نثار نے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے دیوار کے ساتھ ٹیک لگالی اور ہر طرف خاموشی چھا گئی۔

''تمہاری بات ختم ہو گئی''؟ چپ چاپ، خاموش کمرے میں آزاد کی حیران سی آواز اُبھری۔

''میرے خیال سے میں اپنی بات مکمل کر چکا ہوں''۔نثار نے جواب دیا۔

''اتنی مختصر وضاحت پر تو ملزم کو پھانسی سے کوئی نہیں بچا سکتا''۔آزاد کی بات پر زوردار قہقہہ لگا۔

''تو تمہارا مطلب یہ ہے کہ اپنے اور حکمرانوں کے گناہوں کی پوٹلی کھول کر تمہارے سامنے رکھی جائے''؟ نثار نے پوچھا۔

''شاباش، اب تمہاری عقل میں بات آئی ہے''۔آزاد نے خوش ہو کر کہا۔

''عقل میں تو آ گئی ہے دوست لیکن میں یہ کہانی نہیں دہرانا چاہتا''۔نثار نے عذر پیش کیا۔

''تمہیں دہرانا پڑے گی''۔آزاد نے کہا۔

''اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے اور تکلیف دہ بھی ہے''۔

''بات فائدے،نقصان کی نہیں ہے، میں حقائق جاننا چاہتا ہوں''۔آزاد نے کہا۔

''حقائق کی تفصیل تو ایک رات میں بیان نہیں ہو سکتی'۔نثار نے بولنا شروع کیا۔'بہر حال میں کوشش کروں گا کہ ان پر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے۔لیکن دیکھنا یہ ہوگا کہ آیا مہاراجہ کے خلاف پونچھ میں ہی بغاوت ہوئی اور باقی پوری ریاست میں لوگ ڈوگروں کے ساتھ تھے؟ اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ ۱۹۰۹ء میں جموں میں بننے والی ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن کی ۱۹۲۳ء میں تنظیم نو کرنے والوں، سری نگر میں ''ریڈنگ روم پارٹی'' کی بنیاد رکھنے والوں یا بعد میں بننے والی مسلم کانفرنس اور نیشنل کانفرنس کی قیادت میں سے کسی کا شجرہ نسب پونچھ کے کسی قبیلہ سے نہیں ملتا۔مہاراجہ کے خلاف جموں اور ویلی کے لوگ طویل عرصہ تک سراپا احتجاج رہے۔کشمیر چھوڑ دو تحریک میں پونچھ کا قابلِ ذکر حصہ نہیں ہے۔عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ مہاراجہ کے خلاف بغاوت یا تحریک فقط پونچھ میں نہیں چلی، بلکہ پوری ریاست جموں کشمیر کے عوام حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ہاں پونچھ میں البتہ سیاسی جدوجہد کی بجائے مسلح جدو جہد ہوئی۔جس کا باعث یہاں کے لوگوں کا عسکری پسِ منظر تھا۔مہاراجہ کے خلاف ریاست میں جاری تحریک کی دو بنیادی وجوہات تھیں۔اول یہ کہ معاشی طور پر لوگوں کا استحصال اپنی آخری حدوں کو چھورہا تھا اور دوم یہ کہ مہاراجہ کی حکومت میں مسلمانوں کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھا جاتا تھا۔یہ زیادہ دور کی بات نہیں ہے اُس دور کے حالات کا تذکرہ غیر جانبدار مورخین اور سیاحوں کی یادداشتوں میں دستیاب ہے۔

شیخ عبداللہ ''آتشِ چنار'' میں لکھتے ہیں کہ سر ایلبین بنر جی بنگالی برہمو تھے اور حکومت ہند کے ایک اعلیٰ ملازم تھے۔مہاراجہ نے ان کو اپنی ایگزیکٹو کونسل کا سینئر منسٹر مقرر کر دیا اور وہ قلمرو کشمیر کے وزیر اعظم اور وزیر خارجہ کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔وہ ایک باضمیر اور روشن دماغ

منتظم تھے۔ انہوں نے کچھ بنیادی مسئلوں کی طرف توجہ دی اور مہاراجہ کے سچے بہی خواہ کی حیثیت میں عوام پر روا رکھی جانے والی ستم ظریفیوں کو کم کرنے کی وکالت کی۔ لیکن مہاراجہ اور اس کے حواریوں کو یہ دانشمندانہ مشورہ ایک آنکھ نہ بھایا اور انہوں نے ان اقدامات کی پیدائش سے پہلے ہی ان کا گلا گھونٹ دیا۔ اس پر بنرجی نے استعفیٰ دے دیا۔ یہ مارچ ۱۹۲۹ء کی بات ہے۔ لاہور میں جب اخباری نمائندوں نے ان سے استعفیٰ کی وجوہات دریافت کیں تو انہوں نے ایک بیان دیا جس کے کچھ اقتباسات یوں ہیں:

''جموں کشمیر کی ریاست بہت سی ناانصافیوں کا شکار ہے۔ اس ریاست کی بڑی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے جو قطعی طور پر ناخواندہ ہیں۔ یہ لوگ غربت اور افلاس کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور انہیں بالکل اندھے اور گونگے مویشیوں کی طرح ہانکا جاتا ہے۔ حکومت اور عوام کے درمیان کوئی رابطہ نہیں ہے اور نہ ہی شکایات کے ازالہ کے لیے کسی قسم کا کوئی موقع فراہم کیا جاتا ہے۔ ریاست میں رائے عامہ کو ابھرنے کا موقع ہی نہیں دیا گیا ہے۔ اخبارات تقریباً مفقود ہیں۔ عوام کی شرمناک اقتصادی بدحالی ریاست کے تمام مصائب کی جڑ ہے۔ اگرچہ لوگ بڑے اچھے اور سمجھدار ہیں لیکن انہیں زندگی کا کوئی سکھ نہیں ملتا''۔

(آتشِ چنار صفحہ ۵۶/۵۵)۔

سر والٹر لارنس جو ایک انگریز افسر تھا وہ ۱۸۹۸ء میں کشمیر کا پہلا سیٹلمنٹ کمشنر بھی تعینات ہوا۔ اپنی کتاب The India we served میں لکھتا ہے:

"army was employed in forcing the villagers to plough and sow, and worse still, the soldiers came at harvest time and when the share of the state had been seized" and "there was very little grain to tide the unfortunate peasants over the cruel winter."

اپنی دوسری کتاب The valley of kashmir میں بھی اس نے ڈوگرہ عہد میں کشمیریوں کی حالت زار کا نقشہ کھینچا ہے۔

شیخ عبداللہ آتشِ چنار کے صفحہ ۵۱ پر لکھتے ہیں:

''میں نے بڑے بڑے قافلوں کی صورت میں کشمیری مسلمانوں کو اپنے خوبصورت وطن سے پنجاب کے چٹیل اور سنگلاخ میدانوں کی طرف جاتے دیکھا۔ یہ لوگ اپنی سرزمین سے روزی نہ پا کر اس کی تلاش میں پنجاب کا رخ کرتے۔ یہ حیرتناک بات تھی کی اپنی شاداب سرزمین ان کے پیٹ کی آگ بجھانے کی سلسلے میں کسی بانجھ کی کوکھ کی طرح خشک ہوگئی تھی۔ جس سے اُگنے والی گھاس بھی زعفران بن جاتی ہے......۔ ان مزدوروں کو بانہال اور مری جیسے برفانی کوہستان پیدل طے کرنا پڑتے تھے اور یہ ہزار دقتیں برداشت کر کے آگے بڑھتے۔ بعض اوقات پہاڑوں کی چوٹیاں عبور کرتے ہوئے وہ برفانی طوفانوں کی نذر ہو جاتے۔ نہ کفن دفن کی باری آتی نہ جنازے فاتحہ کی باری۔ ان کی بے گور و کفن لاشیں گدھ اور دوسرے آدم خور جانوروں کا لقمہ بن جاتیں۔ کچھ نصیبوں کے مارے سخت جان پنجاب کے شہروں میں پہنچ جاتے تو وہاں پر بھی غم والم کے سائے ان پر منڈلاتے ہی رہتے۔ دن بھر گلی کوچوں میں مزدوری کی تلاش میں خاک چھانتے۔.........رات کسی مسجد یا سرائے میں گزارتے، وہاں بھی ان کو بے زبان مویشیوں کی طرح ہانکا جاتا۔ کئی بار میں نے کچھ کشمیری مزدوروں کو روٹی کے لیے بھیک مانگتے ہوئے دیکھا۔ مجھے شرم محسوس ہوئی اور میں نے ایک مزدور سے پوچھا کیا تم مزدوری نہیں کرتے کہ بھیک کی نوبت آ گئی ہے؟ مزدور نے جواب دیا جی ہاں ہم مزدوری کرتے ہیں۔ بہت ہوا دن میں بارہ سولہ آنے کما لیے۔ لیکن ہم اس پونجی کو جمع کرتے ہیں کیونکہ واپسی پر سرکاری مالیہ ادا کرنا ہوتا ہے، بال بچوں کے لیے کچھ کپڑے لتے بنانا پڑتے ہیں اور کچھ چائے نمک ساتھ لے جانا پڑتا ہے۔ اگر ہم اس پیسے کو اپنا پیٹ پالنے پر خرچ کردیں تو یہ اخراجات کہاں سے ادا کریں گے۔ مزدور نے یہ لفظ کچھ اس بے ساختگی اور سادگی سے کہے کہ میں اس جواب سے تڑپ گیا۔ میں سوچنے لگا کہ مہاراجہ اور اس کے مصاحبوں کا جاہ و حشم اور ٹھاٹ باٹ ان مزدوروں کی گاڑھے پسینے کی کمائی کا صدقہ ہے۔ لیکن خود بچارے یہ اس دیارِ غیر میں ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔ جب میں نے لاہور کے گلی کوچوں میں کشمیری مزدوروں کی لاشیں پڑی ہوئی دیکھیں۔ راہ گیران پر نظر ڈال کر ایسے کنی کاٹ کر نکل جاتے تھے جیسے یہ انسانوں کے جسم نہ ہوں بلکہ ناسور کے

ڈھیر ہوں۔......... چونکہ کوئی دعویدار نہ ہوتا اس لیے انہیں ہسپتالوں میں زیرِ تربیت طلبہ کی چیر پھاڑ کا تختہ مشق بنا پڑتا۔ زندہ کشمیریوں کی حمیت اور غیرت پر توہین اور ہتک کے تازیانے برسائے جاتے۔ انہیں ''ہتو'' کے ہتک آمیز عرف سے پکارا جاتا''۔

۱۹۴۷ء میں پونچھ میں مہاراجہ کے مظالم کے خلاف جو بغاوت ہوئی اس کے بارے میں شیخ عبداللہ آتشِ چنار (صفحہ ۲۷۶) میں لکھتے ہیں:

''پونچھ میں جب حالات نے پلٹا کھایا تو مہاراجہ کو مشورہ دیا گیا کہ وہ خود پونچھ کا دورہ کرے۔ چنانچہ مہاراجہ اپنی فوج کے چیف آف سٹاف جنرل اسکاٹ کے ساتھ وہاں چلا گیا۔ پونچھ، پلندری وغیرہ کے اکثر لوگ فوجی ملازمت میں تھے، کچھ ریاستی اور کچھ ہندوستانی فوج میں۔ وہاں کے سابقہ اور موجودہ فوجیوں نے اپنی وردیوں میں ملبوس ہو کر اور ان پر اپنے میڈل اور تمغے چمکاتے ہوئے فوجی طریقے پر مہاراجہ کا پرجوش استقبال کیا۔ لیکن بدقسمتی سے مہاراجہ کی سطح بین نگاہیں تہہ تک نہ جاسکیں اور اس نے رسمی استقبال کا بالکل غلط مفہوم اخذ کیا۔ اس نے ان کی محبت کا جواب غرور اور نخوت سے دیا۔ پاکستان سے الحاق کا جو مطالبہ انہوں نے کیا تھا مہاراجہ نے اس کو گستاخی پر محمول کیا اور انہیں مزہ چکھانے کے لیے اپنی فوج بھیج کر ان پر شدید مظالم توڑے۔ گرفتاریوں کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ گھروں کو آگ لگوادی گئی اور عورتوں کی بے حرمتی کی گئی۔ کشمیری فوج میں وہاں کے لوگ ملازم تھے ان میں ان واقعات سے بڑی تشویش پھیل گئی۔ ان واقعات کی صدائے بازگشت ہمارے کانوں تک بھی پہنچی۔ ہم نے بھی وہاں حالات کا مشاہدہ کرنے کے لیے اپنے کچھ نمائندے بھیجے۔ یہ نمائندے واپس آئے تو انہوں نے دردناک واقعات کی بڑی دلگداز رپورٹ پیش کی۔ چنانچہ ہم نے بھی ان مظالم کے خلاف زبردست احتجاج کیا اور حکومت کو دراز دستیاں بند کرنے کی صلاح دی۔ میں نے دہلی میں ۲۱ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو جب قبائلی مظفر آباد میں پہنچ چکے تھے پونچھ کے سوال پر ایک اخباری کانفرنس میں کہا:

پونچھ میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ مہاراجہ کے مظالم کا براہِ راست نتیجہ ہے۔ وہاں کے لوگوں کو ان مظالم کے خلاف احتجاج کا پیدائشی حق حاصل ہے۔ اور ان کو اس حق سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔ انہوں نے اپنے حقوق کی بازیافت کے لیے تحریک شروع کر رکھی ہے اور مہاراجہ نے ان

پر فوجی یلغار کر کہ وہاں کے حالات کو تباہی کے دھانے پر لایا ہے۔

میں نے مسلمانانِ کشمیر کی نفسیاتی تصویر پیش کرتے ہوئے کہا:

پنجاب کی مسلم اکثریت والی ریاست کپورتھلہ میں اب ایک مسلمان نظر نہیں آتا۔ یہی حال الور، بھرتپور وغیرہ ریاستوں کے مسلمانوں کے ساتھ ہوا ہے۔ اس لیے کشمیر میں اگر کچھ لوگ اندیشوں میں گرفتار ہیں کہ ان کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوگا تو اس کو ہمدردی سے سمجھنے کی ضرورت ہے''۔

یہاں پر ایک بات کی وضاحت ضروری ہے کہ ۱۹۴۷ء میں ریاست پر سرحد کے قبائلیوں کا حملہ ایک سوچی سمجھی سازش تھی۔ اس کا کشمیری عوام کی مہاراجہ کے خلاف تحریک یا بغاوت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ قبائلیوں نے کشمیریوں کو لوٹا اور ان کی عزتوں کو تار تار کیا۔ یہ زخم ایسے ہیں کہ ہماری آنے والی نسلیں بھی انہیں بھول نہیں پائیں گی۔

۱۹۳۱ء میں سری نگر میں کیا ہوا اور پھر ۱۹۴۷ء میں جموں میں کس قدر قتل و غارت ہوئی اس کی تفصیل میں جائے بغیر چند ایک حوالے پیش کرتا ہوں۔

''جموں میں عملاً مسلمان اپنے گھروں میں قید ہو کر رہ گئے تھے۔ ایک دن انہیں حکم دیا گیا کہ انہیں سوچیت گڑھ کے راستے پاکستان پہنچا دیا جائے گا۔ انہیں اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ وہ اس جھانسے میں آ گئے اور بسوں میں سوار ہو گئے۔ انہیں سانبہ کی طرف لے جایا گیا اور وہاں بسوں سے اتار کر گاجر مولی کی طرح کاٹ کے رکھ دیا گیا۔............ یہ بات شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ اس قتل عام میں مہاراجہ، اس کی متعصب رانی اور مہر چن مہاجن کا ہاتھ کارفرما تھا۔...... صورتِ حال ایسی سنگین ہو گئی کہ جواہر لال نہرو کے ذاتی جان پہچان کے ایک آفیسر جی سی بالی جو جواہر لال نہرو کے حکم سے جموں میں جاسوسی کے ڈپٹی انسپکٹر جنرل کے طور پر کام کر رہے تھے، نے جواہر لال نہرو کو ایک خاص مکتوب میں ان واقعات کی طرف متوجہ کیا اور لکھا:

''ڈوگرا اور راجپوت سپاہی جموں میں مصیبتوں اور قتل و غارت کے اتنے ہی ذمہ دار ہیں جس طرح پاکستان سے آئے ہوئے قبائلی حملہ آور۔ یہ لٹیروں کی طرح گاؤں کو جلاتے ہیں، عورتوں کو اغوا کرتے ہیں اور ان کی عزتیں لوٹتے ہیں۔ ان غیر مہذبانہ افعال میں انہیں مہاراجہ

اور یہاں کے حکمران طبقوں کی خاموشی سے اور بھی شہ ملتی ہے''۔

.........جموں جا کر ہم نے وہاں کے جو حالات سنے ان سے ہمارے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ۴ نومبر کو سردار پٹیل نے ہندوستان کے ڈیفنس منسٹر سردار بلدیو سنگھ اور مہاراجہ پٹیالہ کے ساتھ جموں کا دورہ کیا اور وہاں مہاراجہ ہری سنگھ سے گفتگو کی۔ ۵ نومبر کو شہر میں ڈھنڈورا پٹوایا گیا کہ مسلمان اپنے آپ کو پولیس لائنز میں پیش کریں تا کہ انہیں پاکستان بھیجا جا سکے۔ دیکھتے ہی دیکھتے مسلمان اپنے بیوی بچوں کے ساتھ حاضر ہو گئے۔ انہیں کوئی چالیس ٹرکوں میں سوار کیا گیا اور ہر ٹرک میں ساٹھ افراد کے قریب سوار کیے گئے۔ انہیں سانبہ کے قریب ایک پہاڑی کے نزدیک اتارا گیا جہاں مشین گنیں نصب کی گئی تھیں۔ چنانچہ جوان عورتوں کو الگ کر کے باقی تمام جوانوں، بچوں اور بوڑھوں کو گولی سے اڑا دیا گیا۔ اطلاعات کے مطابق شیر خوار بچوں کو ان کی ماؤں کی گود میں نیزوں کی انی سے ہلاک کیا گیا۔...... اسی طرح آر ایس ایس کی ٹولیوں میں سرکاری اسلحہ خانے سے ہتھیار تقسیم کیے گئے اور شہر و دیہات میں مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہایا گیا۔ ان کی مال و جائداد کو لوٹ لیا گیا اور عورتوں کو اغوا کر لیا گیا''۔ (آتشِ چنار ۲۹۷ تا ۳۰۱)

جنرل محمد اکبر خان ''میری آخری منزل'' (صفحہ ۸۴) میں لکھتے ہیں:

''مہاراجہ نے کانگریس، مہا سبھا، آریا سماج، اکالی دل، سیوا سنگ، وغیرہ جماعتوں کو خفیہ طور سے دعوت دی تھی کہ وہ پٹیالہ، نابھ، کپورتھلہ کی طرف سے خونخوار اور درندے کشمیر کی سرحد پر بھیج دیں تا کہ وہ مسلمانوں میں قتل و خون اور غارتگری شروع کر دیں اور ان کے ساتھ سمجھوتا کر لیا کہ جس طرح سے انڈین آرمی جو برطانوی افسروں کے تحت کھڑی تماشہ بین رہی، ریاست کی فوج اور پولیس نہ صرف خاموش رہے گی بلکہ یہ ضروری مدد بھی کرے گی۔ اور ہر اس بیچارگی اور مایوسی کے عالم میں یہ مسلم آبادی پاکستان ہجرت کر جائے گی تو ان کی جائدادیں ان کے ہاتھ آ جائیں گی، اور ہوا بھی ایسے ہی''۔

''اسٹیٹس مین'' کے ایڈیٹر ایان اسٹیفن نے اپنی کتاب "Horned moon" میں قتل ہونے والوں کی تعداد ۲۰۰،۰۰۰ سے زائد لکھی ہے۔ جبکہ دی لندن ٹائمز نے اپنے ۱۰

اگست ۱۹۴۸ء کے شمارے میں جموں میں قتل ہونے والوں کی تعداد ۰۰۰،۲۳۷ لکھی ہے''۔
نثار تھوڑی دیر کے لیے رکا۔ اس نے پانی کا ایک گلاس پیا اور پھر بولنا شروع ہوا۔
''میں بات لمبی نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن تم نے مجھے مجبور کیا ہے تو اب مجھے اسے مکمل کرنا پڑے گا''۔

''یہی میں چاہتا ہوں تم اپنی بات جاری رکھو، میں پوری توجہ سے تمہیں سن رہا ہوں''۔ آزاد نے کہا۔

''ٹھیک ہے تو پھر سنو کہ مہاراجہ گلاب سنگھ نے پونچھ کو کیسے تاراج کیا''۔ نثار نے کہا۔

'' میجر جی سی سمتھ ایک انگریز مورخ ہے۔ اس نے اپنی کتاب Lahore and its rulers میں ایک باب Soodhun revolt کے نام سے لکھا ہے۔ میں اس کے چند ایک اقتباسات تمہیں سناتا ہوں۔

''۱۸۳۲ء کے لگ بھگ شمال مغربی پنجاب کے کوہستانی علاقے کے آزاد پہاڑی قبائل کو حکومتِ لاہور کے تابع کر دیا گیا۔ یہ قبیلے ڈھونڈ، سُدھن، ستّی اور ملدیال تھے''۔

اس کے بعد وہ ان قبائل کی حدود اربعہ، اور آبادی بیان کرتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ ڈھونڈ قبیلے کی آبادی پچاس سے ساٹھ ہزار تھی جبکہ سدھن قبیلہ قریباً چالیس ہزار نفوس پر مشتمل تھا۔ ستّی قبیلے کی تعداد بیس ہزار اور ملدیال قبیلہ کی تعداد اٹھارہ ہزار تھی۔ وہ لکھتا ہے کہ جموں کے ڈوگرا برادران (راجہ گلاب سنگھ اور راجہ دھیان سنگھ) کی نظریں ان آزاد قبائل پر لگی ہوئی تھیں اور وہ انہیں اپنے تسلّط میں لانے کے لیے کوشاں تھے۔ وہ بظاہر انہیں لاہور کا مطیع کرنا چاہتے تھے مگر ان کی مرضی یہ تھی کہ انہیں اپنی غلامی میں جکڑ لیں۔ لیکن انہیں جلد ہی احساس ہو گیا کہ ان قبائل کو اپنے طابع کرنا اتنا آسان نہیں جتنا وہ سمجھتے تھے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے اپنے آقا راجہ رنجیت سنگھ کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ اپنی تمام فوج کے ساتھ راولپنڈی کی طرف پیش قدمی کرے تاکہ ان قبائل کو جو اطاعت قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں، فوجی طاقت سے مرعوب کیا جائے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کوئی ساٹھ ہزار فوج لے کر راولپنڈی کی طرف روانہ ہوا اور میدانی علاقے کری کے مقام پر پڑاؤ کیا۔ یہ مقام ان آزاد قبائل کے پہاڑی علاقے کا دروازہ سمجھا جاتا

تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی ڈیڑھ سو توپوں نے پہاڑی علاقے پر دن رات گولہ باری شروع کر دی۔
"آزاد قبائل نے جب اتنی بڑی فوج کو دیکھا اور جب شب و روز ان کا پہاڑی علاقہ گولوں کے دھماکوں سے لرزنے لگا تو وہ خوفزدہ ہو کر ڈوگرہ سرداروں کی اطاعت پر مجبور ہو گئے۔ جب سدھن قبیلے نے ڈوگروں کی اطاعت قبول کی تو اس کے سرداروں میں ایک شمس خان بھی تھا۔ اس لیے اس کے سربراہ شمس خان کو بطور ضمانت راجہ دھیان سنگھ کی ذاتی ملازمت میں رکھ لیا گیا۔ تاکہ شمس خان کا قبیلہ اور اس کا اپنا خاندان فرمانبردار رہے۔ اسے راجہ دھیان سنگھ نے "گھوڑا چار سپاہی" کی حیثیت سے رکھا۔ شمس خان نے اپنے آقا کی توجہ اور اعتماد حاصل کر لیا اور اپنی خداداد صلاحیتوں کی بدولت راجہ کا معتمد بن گیا۔ وہ اس حد تک اس کا منظورِ نظر ہو گیا کہ راجہ گلاب سنگھ شمس خان سے حسد اور نفرت کرنے لگا۔ وہ کئی بار دھیان سنگھ سے الجھا اور اسے سخت سُست کہا کہ اس نے شمس خان جیسے شخص پر اعتماد کر کے بیوقوفی کی ہے۔ لیکن چھوٹا بھائی اسے اپنی بیوقوفی تسلیم کرنے پر بالکل آمادہ نہ ہوا۔ وہ پہلے کی طرح شکست خوردہ سردار پر کرم نوازیاں اور اس کی طرف داری کرتا رہا۔ شمس خان ظاہری طور پر اپنے آقا کا شکر گزار نظر آتا تھا اور اس عزت افزائی کے عوض اس کا احترام کرتا تھا۔ وہ ۱۸۳۶ء کے آخر تک دھیان سنگھ کے ساتھ لاہور میں رہا............"

"............ راجہ گلاب سنگھ یوسف زئی قبائل کی سرکوبی میں مصروف تھا کہ اسے پہاڑی ریاست میں سدھن، ستّی، ڈھونڈ اور ملدیال قبائل کی بغاوت کی اطلاع ملی"۔ "............ پہاڑی قبائل کو دراصل پشاور میں سکھوں کی شکست کی اطلاعات ملی تھیں اور ان تک یہ افواہ بھی پہنچی تھی کہ سکھ اس حد تک تباہ ہو چکے ہیں کہ انہیں سکھوں کو پوری ڈوگرہ فوج کی مدد کی ضرورت ہے۔ ان حالات کے پیشِ نظر قبائل نے سوچا کہ جس اطاعت کو انہوں نے مجبوری کے عالم میں بادلِ نخواستہ قبول کیا تھا اس سے آزادی حاصل کریں۔ سو اس موقع کو غنیمت جان کر ان قبائل نے بغاوت کر دی۔ سکھوں کی فوج نے اس بغاوت کو دبانے کی کوشش کی لیکن ان قبائل کے مقابلے میں نہ ٹھہر سکے۔ سدھن قبیلے کا سردار شمس خان جو راجہ دھیان سنگھ کے پاس لاہور میں تھا چند دن کی رخصت لے کر اپنے علاقے میں گیا۔ گلاب سنگھ کے دل میں شمس خان کے خلاف دشمنی بھری ہوئی تھی............ اس نے دھیان سنگھ کو لکھا کہ وہ اسے شمس خان سے نمٹنے دے اور وہ اس کی اس

کارروائی میں مداخلت نہ کرے جو وہ اسے سزا دینے اور ملک میں امن بحال کرنے کے لیے کرے گا۔

چند ہی روز بعد گلاب سنگھ کے کارداروں کو یہ ہدایات ملیں کہ وہ شمس خان کو اس کے خاندان کے ساتھ اس کے گھر میں قید کرلیں۔ شمس خان کا جاسوسی کا اپنا نظام تھا۔ اسے اطلاع مل گئی کہ راجہ اس کی اور اس کے خاندان کی گرفتاری کا حکم دے چکا ہے۔ اسے اندازہ تھا کہ ڈوگروں کی قید میں اس کا اور اس کے عزیزوں کا کیا حشر ہوگا۔ لہٰذا وہ وہ اپنے خاندان سمیت بہت ہی تیزی سے ایسے پہاڑی علاقے میں چلا گیا جو گلاب سنگھ کی دسترس سے بہت دور تھا۔ یہ ایک اشارہ تھا بلکہ چنگاری تھی جس نے بغاوت کو شعلہ بنا دیا۔ سارے قبائل مسلح ہوکر ڈوگرہ راج کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ ابتدا میں باغیوں کو بہت کم مزاحمت کا سامنا ہوا۔ یوسف زئی علاقے سے گلاب سنگھ کی واپسی تک کشمیری قبائل ایک مہینے کے اندر پونچھ سے جموں تک اور کشمیر کی سرحد سے پہاڑوں کے دامن تک ڈوگروں کی تمام قلعہ بندیاں تباہ کر چکے تھے۔...... سارے ملک پر باغیوں کا قبضہ نظر آتا تھا حالانکہ جموں کی فوج کی نفری پانچ ہزار تھی اور اس کی کمان گلاب سنگھ کا بڑا بیٹا اتم سنگھ کر رہا تھا جو اپنی نسل کا سب سے بہادر مانا جاتا تھا۔......

آخر گلاب سنگھ نے بذاتِ خود یوسف زئی علاقے سے کوچ کیا اور...... کہوٹہ کے مقام تک پہنچا۔ اس نے سوچا اگر صرف فوج کو استعمال کیا تو نتیجہ مشکوک بھی ہوسکتا ہے۔ وہ کچھ عرصہ کے لیے کہوٹہ میں رک گیا اور کشمیری قبائل میں نااتفاقی پیدا کرنے اور ان میں سے کچھ کو اپنی حمائت کرنے کے لیے سازشوں اور رشوت کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس وقت تک سدھن قبیلے کے سربراہ شمس خان نے اعلانیہ حریت پسند قبائل کی قیادت سنبھال لی تھی اور وہ اب ڈوگرہ راج کے خلاف بغاوت کا قائد تھا۔ راجہ گلاب سنگھ نے پہاڑی قبیلوں کے ان سرداروں کو جو کسی نہ کسی وجہ سے شمس خان کے خلاف تھے سازشوں اور رشوت سے اپنا حامی بنانے کی کوشش شروع کر دی۔ ان طریقوں سے اس نے بہت سے باغیوں کو تحریک سے ہٹا کر اپنے ساتھ ملا لیا اور ان میں سے بعض جو ملنے پر آمادہ نہ ہوئے انہیں غیر جانبدار رہنے پر آمادہ کر لیا۔...... اس لشکر (کل تعداد ۲۰،۰۰۰) نے کہوٹہ سے منگ اور پلندری کی طرف پیش قدمی کی۔ دہشت پھیلانے اور باغیوں کو

سنگین سزا دینے کی غرض سے وہ جدھر سے گزرا ہر چیز تباہ و برباد کرتا گیا۔......اس نے اعلان کر دیا تھا کہ جو آدمی کسی عورت یا بچے کا سر کاٹ لائے گا اسے پانچ روپے انعام دیا جائے گا۔اس اعلان پر قتلِ عام شروع ہو گیا۔

فوجی پہاڑی علاقوں میں پھیل گئے انہیں کہیں نہ کہیں کسی غار یا کھوہ میں کوئی تباہ حال کنبہ چھپا ہوا نظر آتا۔فوجی نہ کسی مرد کو دیکھتے ،نہ عورت اور بچے کو ہی۔جو نظر آتا پانچ روپے کی لالچ میں اس کا سر کاٹ لاتے۔اس قتلِ عام اور نسل کشی کے کچھ روز بعد گلاب سنگھ نے حکم دیا کہ عورتوں اور بچیوں کو نہ مارا جائے۔انہیں زندہ پکڑ کر ان افسروں کے حوالے کیا جائے جنہیں اس کام کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔اس حکم کے بعد یہ جگر خراش مناظر منظرِ عام پر آنے لگے کہ فوج کے دستے مظلوم عورتوں ،نوجوان لڑکیوں اور کمسن بچیوں کو مویشیوں کی طرح ہانک کر پیدل لے جا رہے ہیں۔یہ مظلوم بھوکی پیاسی اور پھٹے ہوئے کپڑوں میں نیم عریاں حالت میں ہوتی تھیں۔وہ جب گھروں سے اپنے کنبوں کے ساتھ بھاگی تھیں تو ان کے بدن پر یہی کپڑے تھے اور جو کچھ ان کے پاس تھا وہ لالچی اور بے رحم ڈوگروں نے چھین لیا تھا۔ان قیدی عورتوں لڑکیوں اور بچوں کو کئی دن کھانے کے لیے کچھ بھی نہیں دیا جاتا تھا۔وہ ان فوجیوں کے رحم و کرم پر تھیں وہ ان کے ساتھ جو بھی ذلیل سلوک کرتے انہیں برداشت کرنا پڑتا۔اب ان کی قسمت میں یہی وحشی پن لکھ دیا گیا تھا۔جب راجہ گلاب سنگھ کی فوج پلندری میں جمع ہو گئی تو ان بدنصیب قیدیوں کو مویشیوں کی طرح اکٹھا کیا گیا۔ان کی تعداد پانچ ہزار سے کچھ زیادہ تھی''۔(انہیں ہم کشمیر کی آزادی پر قربان ہونے والی پہلی مائیں ،بہنیں ،بیٹیاں کہیں گے)۔''ان کے ارد گرد خاردار جھاڑیوں کی باڑ لگا دی گئی۔بالکل اسی طرح جس طرح بھیڑ بکریوں کو باڑے میں رکھا جاتا ہے۔فوجی مکئی کے بُھٹے کھاتے تھے،مکئی کے چند ایک گھٹے ان پانچ ہزار بدنصیب مستورات کے درمیان پھینک دیے جاتے۔دن میں ایک بار ان کو ہانک کر قریبی ندی میں لے جایا جاتا تھا۔جہاں وہ پانی پیتی تھیں۔دن میں صرف ایک بار اور پھر وہاں سے انہیں بھیڑوں بکریوں کی طرح ہانک کر واپس لایا جاتا تھا۔اس درندگی ،بربریّت اور ذلیل سلوک سے ،جسے بیان کرنا ضروری نہیں اور بیان کرنے سے گِھن بھی آتی ہے تقریباً ڈیڑھ ہزار لڑکیاں پلندری میں ہی مر گئیں..........''

نثار خاموش ہو گیا۔ اس نے پانی کا ایک گلاس پیا، سگریٹ سلگایا اور کرسی سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر دیں۔ اس نے سگریٹ ختم کیا آنکھیں کھولیں اور آزاد سے مخاطب ہوا۔

''اور بھی کچھ سننا چاہتے ہو''؟

آزاد کی آنکھیں نم ہو چکی تھیں اور وہ پچھتا رہا تھا کہ اس نے یہ معاملہ چھیڑا ہی کیوں تھا۔

''بس کافی ہے''۔ وہ مشکل سے بول پایا۔

''نہیں، ابھی نہیں، ہمارے زخموں کو کریدا ہے تو سنو''۔ نثار نے جواب دیا۔

میجر اسمتھ لکھتا ہے:

''راجہ گلاب سنگھ نے میاں اُتّم سنگھ کی سرکردگی میں ایک دستہ بھیجا جس کی رہنمائی شمس خان کے دشمنوں نے کی...... شمس خان اور اس کے ساتھیوں کو موقع پر ہی سوتے میں شہید کر دیا گیا۔ شمس خان اور اس کے بیٹے کا سر لوہے کے پنجرے میں رکھا گیا، باپ اور بیٹے کے سروں کی نمائش کی گئی۔ پھر یہ پنجرہ پونچھ سے اوپر درّہ اڈّھاڈھک کی چوٹی پر رکھ دیا گیا جہاں یہ کئی سال پڑا رہا۔ شمس خان کی شہادت کے ساتھ ہی باغیوں کی سرگرمیاں ختم ہو گئیں۔ جب گلاب سنگھ کی فوج آگے بڑھی تو اسے کسی مزاحمت کا سامنا نہ ہوا۔ اتنی زیادہ اور بہیمانہ سزا سے مطمئن ہو کر گلاب سنگھ اپنی فوج پہاڑیوں میں سے گزارتے ہوئے مختلف راستوں سے جموں لے گیا۔ وہ قیدی عورتوں، لڑکیوں اور بچیوں کے لئے حکم دے گیا کہ انہیں اس کے پیچھے جموں بھیج دیا جائے۔ مستورات کا یہ مظلوم قافلہ پلندری سے بھیڑوں بکریوں کی طرح جموں کی طرف ہانکا جانے لگا۔ ان میں سے تقریباً سات سو بھوک اور تھکن سے راستے میں ہی مر گئیں۔ بے شمار کو ڈوگرہ فوجی چرا لے گئے، جب جموں پہنچیں تو پانچ ہزار میں سے آٹھ سو رہ گئی تھیں۔ ان میں سے چالیس پچاس اچھی شکل و صورت والی لڑکیوں کو راجہ گلاب سنگھ کے حرم کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ جو ابھی تک وہیں ہیں۔ جو باقی رہ گئیں ان میں سے کچھ تو ڈوگروں کے شرمناک سلوک سے مر گئیں اور جو زندہ رہیں انہیں اچھی بولی دینے والوں کے ہاتھوں نیلام کر دیا گیا...... یہ تھا وہ طریقہ جس سے سدھنوں کی

بغاوت کو دبایا گیا اور ان سے انتقام لیا گیا۔ یہ تھا اس بغاوت کا انجام......''۔

''دیوان کرپا رام مہاراجہ گلاب سنگھ کا پرائیویٹ سیکریٹری اور اُس کے وزیرِ اعظم دیوان جوالہ شاہی کا بیٹا تھا'۔ نثار نے پھر بولنا شروع کیا۔'مہاراجہ کی معروف آپ بیتی ''گلاب نامہ'' اسی کی تصنیف ہے۔ ۱۸۳۷ء کے واقعہ کو اس نے ایک باب The affairs of the traitor shams میں تفصیلاً بیان کیا ہے جس میں شمس خان کو جھگڑالو، شاطر اور دھوکہ باز لکھا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

''اس (مہاراجہ گلاب سنگھ) نے میاں اُتم سنگھ، دیوان دِلباغ رائے اور دوسروں کو حکم دیا کہ وہ کوٹلی کی طرف سے پیش قدمی کرتے ہوئے باغیوں پر حملہ کریں اور انہیں جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیں۔ اس نے انہیں یہ بھی حکم دیا کہ جو بھی باغی ان کی گرفت میں آئے اسے اُس کے سامنے پیش کیا جائے۔ لہٰذا تمام تر فوج شمس خان اور اس کے ساتھیوں کو تلاش کرنے میں لگ گئی۔ جو شخص بھی زندہ ان کے ہاتھ آتا اسے فی الفور راجہ گلاب سنگھ کے پاس منگ میں بھیج دیا جاتا۔ ہر روز بے شمار باغی پکڑے اور بھیجے جاتے اور پھر اپنے کیے کی سزا پاتے۔ ان کے ہاتھ اور پاؤں کلہاڑیوں سے کاٹے جاتے............ ایک دن ملّی اور سبز علی سدھن جو شمس خان کے جرم بغاوت میں برابر کے شریک تھے اور فساد اور انارکی کی جڑ تھے، ان کے ہاتھ لگ گئے۔ ان کی کھالیں ان کے جسموں سے اُدھیڑ دی گئیں۔ جب ملی سدھن کی کھال اس کے سینے تک پہنچی اور ابھی اس میں زندگی کے کچھ آثار باقی تھے، اس نے اپنے بیوی بچوں سے آخری بار ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن مہاراجہ نے اس کی اجازت نہ دی۔ تب اس نے مہاراجہ سے درخواست کی کہ اُنہیں قتل نہ کیا جائے۔ اس کی یہ درخواست مہاراجہ نے منظور کر لی۔ جب اس کی کھال گردن تک پہنچی تو س نے پانی کا ایک گھونٹ پینے کے لیے مانگا۔ پانی پینے کے بعد اس کی آنکھیں اس جہانِ فانی سے بند ہو گئیں۔ ایسی ہی سزا دوسرے بدمعاش لوگوں کو بھی دی گئی۔ اِن دو باغی لیڈروں کی شوں کو ٹوکے سے کاٹا گیا جبکہ ان کے سر ان کی کھال کے ساتھ باقی رہ گئے۔ ان کی کھالوں میں گندم کا بھوسہ بھر کر عام گزرگاہ میں سُولی پر لٹکا دیا گیا تاکہ باغیوں کو عبرت ہو سکے۔ ان کے بچوں

اور بیویوں کو البتہ معافی دے دی گئی۔

کہا جاتا ہے کہ میاں اُتّم سنگھ (گلاب سنگھ کا بڑا بیٹا) ان بدمعاشوں کی قابلِ رحم حالت کو دیکھنے کی تاب نہ لا سکا اور اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ مہاراجہ نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کے سر کو پکڑ کر اس دلخراش منظر کی طرف پھر سے موڑ دیا تاکہ اس کی سمجھ میں آ جائے کہ عدل و انصاف کرنے والے منصف اور قوتِ نافذہ کے حامل بادشاہ اگر قانون شکنی کے مرتکب افراد اور باغیوں کو سنگین جرائم پر قرار واقعی سزائیں نہیں دیں گے تو اِس بنتی بگڑتی دنیا کا امن وسکون غارت ہو جائے گا''۔

نثار نے پانی کا ایک گلاس پیا اور سُلگتے ہوئے دماغ کے ساتھ اٹھ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ وہ دیر تک کھڑا اپنے آنسو پیتا رہا۔ اس کے سر میں درد ہو رہا تھا۔ بار بار ایک بجلی سی اس کے دماغ میں چمکتی تھی اور پورے جسم سے گزرتی ہوئی اس کے پاؤں پڑتی تھی۔ اسے یاد نہیں وہ کتنی دیر وہاں کھڑا رہا۔ جب وہاں سے ہٹا تو بمشکل خود کو سنبھال پایا اور بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کے سارے ساتھی بھی سو چکے تھے۔ صبح کے نو بج چکے تھے جب آزاد کی آنکھ کھلی۔ تھوڑی دیر وہ لیٹا چھت کو گھورتا رہا۔ پھر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کی نظر جب گھڑی پر پڑی تو وہ سر پیٹ کر رہ گیا۔ ٹھیک اِسی وقت چوہدری اسلم اپنی بہن کے گھر ناشتہ کر رہا تھا اور اس کی بہن آزاد کی گمشدگی پر بھائی اور بھاوج کے ساتھ اب کی بار شہناز کے سامنے بھی شرمندہ سی ہو رہی تھی۔

رات دیر تک جاگتے رہنے کی وجہ سے اس کی طبیعت بوجھل ہو رہی تھی اور اب اٹھ کر بھاگنے سے کچھ بھی ہاتھ نہ آنے والا تھا اس لیے وہ پھر سے سو گیا۔ ۱۱ بجے کے قریب وہ سب نیند سے بیدار ہو چکے تھے۔ سب غسل کرنے کے بعد ناشتے میں ایک ایک سگریٹ پی کر بیٹھے ہوئے تھے۔ لیکن رات کی گفتگو کے اثرات ان کے چہروں سے عیاں تھے۔

''تمہیں تو ائرپورٹ جانا تھا''۔ نثار نے آزاد سے پوچھا۔

آزاد نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا مگر کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی بے بسی قابلِ دید تھی۔

''تمہاری باتیں سن کر بہت دکھ ہوا ہے''۔ نثار نے بولنا شروع کیا۔ ''لیکن اب اس کا

کوئی مداوا تو نہیں ہوسکتا۔ مستقبل کے بارے میں تم لوگوں نے کیا سوچا ہے''؟

''دیکھو آزاد ماضی کے بارے میں چند ایک حوالے تمہارے مجبور کرنے پر پیش کیے ہیں۔ ورنہ یہ اتنی تلخ اور تکلیف دہ یادیں ہیں کہ اب ان کا دہرانا کوئی آسان کام نہیں اور نہ ہی کوئی فائدہ ہے۔ پیچھے ہی دیکھتے رہے تو ٹھوکریں کھاتے رہیں گے۔ آزادی کا سفر طویل بھی ہے، مشکل بھی۔ ماضی کی تلخیاں بھلا کر مل کر آگے بڑھنا ہوگا۔ ورنہ عبرت کا نشان بن جائیں گے۔ ظلم کی بنیادوں پر کھڑا کیا جانے والا سماج مشرق کا ہو یا مغرب کا انسان کے لیے بارود سے کم نہیں۔ جب اس میں آگ بھڑک اٹھتی ہے تو سب کچھ جل کر راکھ کے ڈھیر میں بدل جاتا ہے۔ پھر اس ڈھیر پہ پروان چڑھنے والی نسلیں صدیوں یہی راکھ اپنے سر پہ ملتی رہتی ہیں۔ ہم اس آگ کو ہوا نہیں دینا چاہتے آزاد......! ہم نے بہت دکھ سہے ہیں، نسلوں سے سہتے چلے آرہے ہیں۔ اب دکھوں کی اس وادی سے باہر نکلو۔ ہمیں ماضی کی طرف نہ دھکیلو۔ ماضی کی یادیں ہمارے اندر وہ آگ پھر سے بھڑکا دیتی ہیں۔ ہم ماضی کو نہیں بدل سکتے، مگر کل کو بدل سکتے ہیں۔ مہاراجہ گلاب سنگھ نے اس ملک کو اکٹھا کیا تھا، اس وقت جب یہ منقسم تھا۔ پھر اس کے آخری جانشین مہاراجہ ہری سنگھ نے اسٹیٹ سبجیکٹ رول کے ذریعے اسے تحفظ فراہم کیا۔ لیکن یہ ملک پھر سے تقسیم ہوگیا۔ خدارا اس تقسیم کا دوش ہمیں نہ دو۔ ہم کہ جن کا سب کچھ آزادی کی راہ میں قربان ہوگیا، ہمیں یہ الزام نہ دو۔ سوچو تو سہی، کیا وجہ تھی کہ ریاست کے طول و عرض میں عوام نے حکومت کے خلاف عدمِ اعتماد کیا۔

خدا کی قسم ۱۹۴۷ء کے دوران موجودہ آزاد کشمیر میں غیر مسلّح اور بے گناہ مارے جانے والوں کی یاد میں ہمارا دل روتا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے جموں میں مارے جانے والوں کے لیے روتا ہے۔ یقین کرو یا نہ کرو ہندوؤں، سکھوں کے قتل پر اور مسلمانوں کے قتل پر ہماری آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ واللہ کوئی فرق نہیں ہے۔ خون ہندو کا تھا یا مسلمان کا، سکھ کا تھا یا عیسائی کا......۱۸۳۷ء میں گرا یا ۱۹۳۱ء میں، ۱۹۴۷ء میں گرا یا اس تمام عرصے میں ......آج سالوں بعد......صدیوں بعد یہ تازہ تازہ خون ہر صبح ہر شام ہمارے دل پہ گرتا ہے۔ یہ کرب آمیز زندگی اب گزاری نہیں جاتی، غم کے الاؤ سینوں میں اُبل رہے ہیں اور دماغ کی ہنڈیا

پک گئی ہے۔ آؤ مل کر اس غم کا مداوا کریں۔ اپنے وطن کی آزادی کے لیے، اس کی سر بلندی کے لیے مل کر آگے بڑھیں۔ مہاراجہ کے جانشین، ان کی کمیونٹی، جن کے وہ ہیرو ہیں کیا وہ تیار ہیں کہ اس وطن کو پھر سے ایک کیا جائے۔ ہم ان کی اس خدمت پر اپنے سارے رنج بھلانے کے لیے تیار ہیں۔ انہیں گلے لگانے کو تیار ہیں۔ ہماری آزادی کا سفر جتنا طویل ہے اس سے کہیں زیادہ کٹھن ہے۔ ہم نے ہر دور میں اپنے لہو سے اس کی آبیاری کی ہے۔ آخری سانس تک یہ رسمِ وفا ادا کرتے رہیں گے، نسلوں تک ادا کریں گے، آزادی تک کریں گے، قیامت کے زلزلے تک کریں گے''۔

آزاد نے فرطِ جذبات میں اٹھ کر نثار کو گلے لگا لیا۔ دونوں کی زبان سے کوئی لفظ نہیں نکل رہا تھا۔ البتہ ان کی آنکھوں میں ستارے جھلملا رہے تھے۔

''مجھے تم سے یہی توقع تھی نثار'۔ آزاد نے بولنا شروع کیا۔ 'جو خوشی مجھے آج ہوئی ہے، پورے کیریئر میں کبھی نہیں ہوئی۔ مجھے سو فیصد یقین ہے کہ اب ہمارے درمیان حائل رنجشوں کے دریا خشک ہو جائیں گے۔ ارے سوچو تو میرے دوستو! کس قدر بدنصیب ہیں ہم۔ صدیوں سے ایک ساتھ رہنے بسنے والے، ایک دوسرے کے غم اور خوشی میں رونے، ہنسنے والے، ایک ساتھ کھیل کر پلنے والے، جب جدا ہوئے تو ان کے ہاتھ اپنے ہی خون سے رنگے ہوئے تھے۔ آگ اور خون کے دریاؤں سے گزر کر ہم نے دیکھ لیا، مٹی کے ان رشتوں کو ہم بھلا نہیں پائے۔ جن سے ہم کبھی ملے نہیں، جن کو ہم نے کبھی دیکھا نہیں، ان کی یاد میں ہماری آنکھیں کیوں بھیگ جاتی ہیں؟ ہم انہیں دیکھنے، ملنے کو کیوں ترستے ہیں؟ یہ مٹی کی محبت ہے، جو ہلکی آنچ پہ پکتی رہتی ہے، کبھی سرد نہیں پڑتی...... اس سے جڑے سارے رشتوں کی جڑیں ہماری نسلوں کے خمیر میں اتری ہوئی ہیں۔ ہمارے لاشعور کا حصہ ہیں۔ ان رشتوں کی یادیں جنہوں نے ہمیں منتقل کی ہیں، انہوں نے اپنے لوگوں سے جدائی کا دکھ اور درد بھی ہمیں منتقل کیا ہے۔ ہم اُس نسل کے احسان مند ہیں جنہوں نے اس قدر فاصلوں کے باوجود ہمیں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہونے دیا۔ یہ ان کا وہ تاریخی کردار ہے جسے اگر ہماری قومی زندگی سے نکال دیا جائے تو کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ ایک ایسی قوم جس سے اس کی تاریخ چھن چکی ہو، زندہ نہیں رہ سکتی تھی اگر اس کی لوریوں میں وطن کے ترانے

نہ ہوتے، درد بھرے فسانے نہ ہوتے۔

دوستو اب ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم زمینی حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے مستقبل کے لیے لام بندی کریں۔ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان تقسیم ہوا۔ گو کہ ہماری حیثیت جدا تھی لیکن اس کے اثرات سے بچنا مشکل تھا۔ خصوصاً ایسے حالات میں جب عوام کا حکومت سے اعتماد اٹھ چکا تھا۔ ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت کی خلیج پیدا کرنے میں نوآبادیاتی تسلّط نے بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ جب یہاں پر آزادی کی تحریک اپنے عروج پر پہنچی اور سامراج نے بھانپ لیا کہ اب اسے ہندوستان سے ہر صورت نکلنا پڑے گا تو اس نے اپنے تسلّط کو بالواسطہ طور پر باقی رکھنے کے لیے مسلمانوں اور ہندوؤں کو ایک دوسرے کے سامنے لا کھڑا کر دیا۔ برصغیر کی قیادت صورتحال کو سمجھنے کے باوجود اس جال سے خود کو نہ بچا سکی اور وہ ہندوستان کی تقسیم پر راضی ہو گئی۔ تقسیم کا فیصلہ ہو چکا تو سامراج کی شاطرانہ ذہنیت نے باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت فرقہ وارانہ فسادات شروع کروا دیے۔ پھر وہ آگ لگی کہ جس میں کئی سو سالہ محبت، رواداری اور بھائی چارگی جل مری اور اس کی لاش پر دو نئے ملکوں کی بنیاد پڑی۔ اس تناظر میں ہماری پہلی اور بنیادی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ریاست کے تمام حصوں میں جس طرح بھی ممکن ہو رابطے بحال کیے جائیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اعتماد کی کمی کو دور کیا جائے۔ ۱۹۴۷ء میں اگر مسلمانوں کو مہاراجہ پر اعتماد نہیں تھا تو آج ریاست کی غیر مسلم اقلیت خود کو تحریکِ آزادی سے کنارے کیے ہوئے ہے اس لیے کہ اب وہ مسلمانوں کی حکومت میں خود کو غیر محفوظ سمجھتے ہیں۔ ہمیں انہیں ساتھ لینا ہوگا، انہیں بتانا ہوگا وہ ہمارے وجود کا حصہ ہیں۔ ہمیں مل جل کر نئے کشمیر کی بنیاد رکھنا ہوگی۔ ہماری جدوجہد وطن کی آزادی اور اس میں استحصال سے پاک انصاف و مساوات پر مبنی ایک آزاد معاشرے کے قیام کے لئے ہے۔ ہم یہ صرف اپنے لیے ہی نہیں چاہتے بلکہ ہماری خواہش ہے کہ بھارت اور پاکستان کا محنت کش طبقہ بھی ظلم سے نجات پائے وہاں پر بھی

آزادی ہو، انصاف ہو، مساوات ہو۔ یہ سب اس وقت تک ممکن نہیں جب تک بھارت اور پاکستان کشمیر کو آزاد کرنے کا فیصلہ نہیں کرتے۔ یہ دراصل ان دونوں ملکوں کا اپنے عوام کو آزاد کرنے کا فیصلہ ہوگا۔ ہم سب کو مل کر آگے بڑھنا چاہیے، امن اور بھائی چارے کے ساتھ۔ ہماری جدوجہد اسی کے لیے ہے۔ یہ نہ تو بھارت کے خلاف ہے نہ پاکستان کے خلاف، بلکہ یہ اس خطے کے کروڑوں انسانوں کی آزادی، خوشحالی اور بقا کی جدوجہد ہے۔ ہمیں پوری امید ہے، ایک وقت آئے گا جب بھارت اور پاکستان کا دانشور طبقہ، سیاسی اور عسکری قیادت ہمارے نقطہ نظر کو بہتر طور پر سمجھ سکے گی۔ اس دن ہماری آزادی کا سفر تمام ہوگا، بھارت، پاکستان اور کشمیر کے افق پر ایک نیا سورج طلوع ہوگا...... حقیقی آزادی کا سورج، عدل وانصاف، مساوات کا سورج۔



جناب قمر رحیم کا شمار میرے بڑے بھائیوں میں ہوتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ انکے حوالہ سے بھی کچھ تحریر کروں مگر انھوں نے اس بات کا پابند کر دیا کہ میری تعریف میں کچھ نہیں لکھنا'' آزادی کا سفر'' قمر رحیم کی دوسری تصنیف ہے مگر مجھے یہ پڑھنے سے ایسا ہر گز نہیں لگا کہ یہ انکی دوسری کاوش ہے بلکہ تحریر اتنی پختہ ہے کہ مجھے کرشن چندر کی Short Stories ''برف کے پھول'' اور'' پانی کا درخت'' کی جھلک اس میں نظر آتی ہے۔

'' آزادی کا سفر'' یقیناً اپنی نوعیت کی ایک منفرد تصنیف ہے۔ جو کشمیر کی ایک طلباء تنظیم جموں کشمیر نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن کی انقلابی اور تاریخی جدوجہد کے تناظر میں تحریر کی گئی ہے۔ اس کتاب میں کشمیر میں غلامی، ظلم، جبر اور استحصال کے خلاف این ایس ایف کی لازوال جدوجہد کو بڑے بھرپور طریقے سے مصنف نے ناول کے انداز میں پیش کیا ہے۔ قمر رحیم نے اپنی تحریر میں این ایس ایف کی تاریخی جدوجہد کے ساتھ ساتھ کشمیر کی تاریخ وثقافت کو بھی اجاگر کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ'' آزادی کا سفر'' قومی شعور کو بیدار کرنے اور جدوجہد آزادی کشمیر کو صحیح سمت دینے میں کردار ادا کرے گی میرے لیے یہ انتہائی خوشی کی بات ہے کہ مصنف نے اس عظیم تصنیف کی پبلشنگ کا کام کشمیر ریسورس سنٹر (KRC) کے ذمہ لگایا جسے قارئین تک پہنچا کر کشمیر ریسورس سنٹر KRC نے قومی ذمہ داری کا ثبوت دیا۔

ڈاکٹر ایس اے اقبال

چیف ایگزیکٹو کشمیر ریسورس سنٹر KRC



کشمیر ریسورس سنٹر (KRC)